# فیضِ سعید

## جلد دوم




مجموعۂ مضامین


**حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب مدظلہ**

خلیفہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پرنابٹی مدظلہ

جمع وترتیب

**مولانا سیّد خواجہ نصیر الدّین قاسمی**

استاذ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد



ناشر

برکات بکڈپو
Barakaath
Book Depot
17-1-391/2/M/1, Khaja Bagh, Sayeedabad, Hyderabad. (A.P.)

# تفصیلاتِ طباعت


| | |
|---|---|
| نام کتاب | فیض سعید (جلد دوم) |
| مجموعہ مضامین | مولانا محمد عبدالقوی صاحب مدظلہ |
| جمع وترتیب | سید خواجہ نصیرالدین قاسمی |
| صفحات | ۲۸۸ |
| قیمت | 120/- |
| ناشر | برکات بکڈپو، خواجہ باغ کالونی، سعید آباد، حیدرآباد |


# ملنے کے پتے


مکتبہ فیض ابرار نزد مسجد اکبری اکبرباغ، حیدرآباد۔ ۳۶ **04065709415**

ادارہ اشرف العلوم خواجہ باغ، نزد پدماوتی گرلز کالج سعید آباد **040-24070681**

حیدرآباد۔۵۹

مدرسہ خیرالمدارس، چودھری نگر، لاتور مہارشٹرا **09421956690**

# فہرست عناوین

# کلماتِ بابرکات

از

عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمٰن صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
صدر مدرس دارالعلوم حیدرآباد وامیر ملتِ اسلامیہ آندھراپردیش

مولانا محمد عبد القوی صاحب مدظلہ ناظم ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد ان اہل علم وخوش نصیب افراد میں سے ہیں جن سے حق تعالیٰ دینی خدمات کے مختلف میدانوں میں خوب کام لے رہے ہیں، مولانا ایک بڑے مدرسہ کے ناظم اور بہت سی دینی وعصری مدارس کے سرپرست ونگران ہیں، وہ متعدد دینی تنظیموں اور اداروں کے ایک فردِ فعال ہیں، وعظ وارشاد اور اصلاحِ باطن وتربیت نفوس کی جد وجہد میں مشغول ہیں، تصنیف وتالیف اور قلمی دنیا میں بہت گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

انہی میں سے ایک وہ ماہنامہ ہے جو پہلے "اشرف العلوم" کے نام سے بعد ازاں "اشرف الجرائد" کے نام سے شائع ہورہا ہے، تقریر کی طرح مولانا کی تحریر بھی شستہ وپر تاثیر ہوتی ہے، موصوف محترم کے مضامین ونگارشات عوام وخواص سب کے لئے نہایت نافع ہیں، بندے نے بھی مولانا کی متعدد تصانیف اور مضامین سے استفادہ کیا ہے، عام طور پر ماہنامے موقتی تقاضوں اور احوال کی مناسبت سے تحریر کئے جاتے ہیں، نتیجۃً عوام مہینوں کے گذرنے کے ساتھ ان جرائد سے بھی بے اعتنائی برتنے لگتے ہیں، حالانکہ دینی ماہنامے کے مواد ومضامین اپنی افادیت کے اعتبار سے ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، روزناموں کی خبروں کی طرح دن گذرنے کے ساتھ غیر اہم نہیں

ہوتے ، اسی لئے مولانا کے فیض یافتہ شاگردِ رشید مولوی خواجہ نصیر الدین صاحب نے مولانا کے ان مضامین کی افادیت کے پیشِ نظر انہیں یکجا کر کے مستقل کتاب کی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا اور مناسب ترتیب کے ساتھ ان کو جمع کیا ہے، جس کا نام "فیض سعید" رکھا گیا ہے، جو صاحبِ مضامین کے شیخ محترم کی طرف منسوب ہے، جو انشاءاللہ مزید موجبِ برکات ہوگا۔

محترم مرتب کی یہ کاوش کسی شاگرد کی جانب سے اپنے استاد محترم سے حسنِ عقیدت اور متعلقہ حقوق کی ادائیگی کی شکلوں میں ایک عمدہ و مستحسن شکل ہے، حق تعالیٰ مرتب و مضمون نگار کی ان خدمات کو شرفِ قبول بخشے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو استفادہ کی توفیق دے۔ آمین

والسلام

(حضرت مولانا شاہ) محمد جمال الرحمٰن (صاحب) مفتاحی

# تقریظ

## حضرت مولانا مفتی محمد عبدالمغنی صاحب دامت برکاتہم
## ناظم مدرسہ سبیل الفلاح حیدرآباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

**حامدا و مصلیاً اما بعد!**

پیش نظر علوم ومعارف پر مبنی مجموعہ مضامین جو کہ فیض سعید کے عنوان سے آپ کے ہاتھوں میں ہے، ملاحظہ وتقریظ کیلئے میرے پاس بھیجا گیا، مضامین کے دیکھنے کا موقع ملا الحمدللہ مختلف مضامین پر مشتمل بہترین گلدستہ ہے، مضامین نہایت مفید اور کارآمد ہیں اور ان میں تقریباً ضرورت کے اہم عنوانات آگئے ہیں، جس طرح شاہین کی پرواز بلند سے بلند تر ہوتی ہے اسی طرح عزیز مولانا حافظ محمد عبد القوی سلمہ اللہ کے مضامین روحانی اعتبار سے بلند سے بلند تر ہیں ۔عزیزم مولوی خواجہ نصیرالدین قاسمی سلمہ کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ انہوں نے ان مختلف مضامین کو کتابی صورت میں استفادہ عام کیلئے مرتب کردیا ہے۔

بارگاہِ ایزدی میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کتاب ہذا کو مقبولیتِ عامہ وتامہ نصیب فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مخلوق کو منتفع ہونے کی توفیق بخشے اور آخرت کیلئے صدقۂ جاریہ بنائے، نیز مولف ومرتب دونوں کو اپنی شایانِ شان اجرِ جزیل عطا فرمائے ۔آمین

والسلام

(حضرت مفتی) محمد عبدالمغنی (صاحب مظاہری)

۲/صفر المظفر ۱۴۳۱ھ م ۲۰/جنوری ۲۰۱۰ء

# تاثرات

## حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم
استاذ ادب دارالعلوم دیوبند

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد !

حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب حسامی دامت برکاتہم ، ناظم ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد، ونائب ناظم مجلسِ علمیہ آندھراپردیش، جنوبی ہند کے اُن باتوفیق علماء میں سے ہیں جن کو اللہ رب العزت نے دینِ متین کی کثیر جہتی خدمت کیلئے منتخب فرمایا ہے، اُن کا قائم کردہ ادارہ اشرف العلوم بہت کم وقت میں دکن کی ایک معیاری تعلیم گاہ کی حیثیت اختیار کرچکا ہے جس کا اندازہ اس کی جانب طلبہ کے رجوعِ عام اور یہاں کے مستفید طلبہ کے مادرِ علمی ام المدارس دارالعلوم دیوبند میں بکثرت داخلہ سے ہوتا ہے۔
اس کے علاوہ حیدرآباد سے باہر، انتہائی ضرورت کے علاقوں میں مکاتب ومدارس کے قیام کا سلسلہ بھی مولانا نے شروع فرمایا ہے، جن میں سے ایک اہم ادارہ امداد العلوم (نارائن کھیڑ) کے اجلاس میں احقر کو بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

ان انتظامی اور ملی خدمات کے علاوہ مولانا موصوف کا قلمی جہاد بھی جاری ہے، ان کے ادارہ سے ایک معیاری ماہنامہ ”اشرف الجرائد“ شائع ہوتا ہے جو ان کی بصیرت افروز تحریروں سے مزین ہوتا ہے، جو وقت اور حالات کے تحت ہر قسم کے موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں، انہی تحریروں اور مضامین ومقالات کو ادارہ کے استاذ جناب مولانا سید خواجہ

نصیر الدین صاحب زید مجدہم نے دو جلدوں میں مرتب کیا ہے، اس وقت احقر کو اس مجموعہ سے ـــــ جس کا نام "فیض سعید" رکھا گیا ہے ـــــ استفادہ کا موقع ملا۔ احقر نے فہرست مضامین دیکھنے کے بعد بعض حصوں کو سرسری دیکھا اور بعض مقالات کو بالاستیعاب پڑھا جس کے بعد احقر بلا تکلف اپنا یہ تاثر ظاہر کرتا ہے کہ مولانا موصوف اپنی تعلیمی، تربیتی اور ملی ذمہ داریوں کی طرح اس میدان میں بھی پوری طرح کامیاب اور موفق من اللہ ہیں، اُن کی تحریر میں الحمدللہ زبان و بیان کی سلاست کے ساتھ ساتھ مسلکِ حق کی کامیاب ترجمانی اور حضراتِ اکابر سے حاصل ہونے والا توازن واعتدال نمایاں ہے۔

ان مقالات ومضامین کے موضوعات کا انتخاب بھی مولانا کی دینی بصیرت کا آئینہ دار ہے، بلکہ بعض موضوعات تو اُن کی جرأت و بیباکی اور سلیقہ کیساتھ حق گوئی کا شاہکار ہیں، پھر اس قدر تعلیمی، تربیتی اور انتظامی مصروفیات کے ساتھ اس معیار کی تحریری خدمات انجام دینا بلاشبہ ایک کرامت کی چیز ہے۔ یہ مضامین یقیناً اس لائق تھے کہ اِن کو مستقل کتابی شکل میں شائع کر کے ان کے فائدہ کو عام کیا جاتا، اس لئے میں اس کتاب کی اشاعت پر حضرت مولانا موصوف کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور حق جل مجدہ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ باری تعالیٰ اس کتاب کو قبول عام عطا فرمائے اور اس کو تمام مسلمانوں کے لئے خصوصاً اس علاقہ کے لئے ـــــ جہاں صحیح فکری رہنمائی کی ضرورت زیادہ ہے ـــــ رشد وہدایت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

والسلام

(حضرت مولانا) محمد سلمان عفی اللہ عنہ (صاحب)

خادم التدریس دارالعلوم دیوبند

(نزیلِ حیدرآباد دکن)

۳۰ ؍ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ م ۱۷ ؍ مارچ ۲۰۱۰ء، چہارشنبہ

# تقدیم

## صورت بہ بیں حالت مپرس!

**بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم**

**امابعد**

اس عاجز پر اللہ تعالیٰ کے انعاماتِ کثیرہ میں سے ایک عظیم انعام یہ بھی ہے کہ ایسے گھرانے میں پیدا فرمایا جو اکابر اہل حق سے وابستہ اور دین کی خدمت میں مشغول تھا، ایک دینی مدرسہ کے ماحول میں پیدائش ہوئی اور پیدائش سے تادمِ تحریر زندگی کے پانچ دہے مکمل مدرسہ کے ماحول میں گذر گئے، **فللّٰہِ الحمد و لافخر**، اللہ پاک سے دعا ہے ـــــ قارئین بھی آمین فرمائیں ـــــ کہ بقیہ زندگی جتنی بھی اس کے علم محیط اور کتاب مبین میں باقی ہے اپنے دین کی مخلصانہ خدمات سے وابستہ رکھے، اور کسی ناقدری وناشکرگذاری کی پاداش میں اس خدمت سے کبھی معزول نہ فرمائے۔

پڑھنے لکھنے کے قابل ہوا تو ۱۳۸۵ھ میں بعمر ۷؍سال قرآن کریم کی تعلیم سے وابستہ کیا گیا، حفظ کی ابتدا ہی میں جبکہ پ آلم شروع ہوسکا تھا آنکھ میں کسی چیز کے چُبھ جانے کی وجہ سے شدید زخم ہوا، کافی وقت علاج واحتیاط میں نکل گیا، اس سے افاقہ کے بعد پھر سلسلہ تعلیم بحال ہی ہوا تھا کہ بعض دوسرے مانع تعلیم عوارض پیش آ گئے (جن کی تفصیل کارے دارد!) اس طرح مختلف عوارض کا مقابلہ کرتے ہوئے حفظ کا سلسلہ آہستہ آہستہ جاری رہا اور دس سال کے بعد محرم ۱۳۹۶ھ میں بعمر ۱۷؍سال بفضلہٖ تعالیٰ حفظ قرآن مجید مکمل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اسی سال مدرسہ فیض العلوم میں درجاتِ عربی کا آغاز ہوا، سعادت مزید یہ کہ تدریس کیلئے شیخ المشائخ واستاذ الاساتذہ مخدومی

حضرت قاری امیر حسن صاحب مدظلہ العالی تشریف لائے، درسیات کی ابتدائی کتب یہاں بھی اور ہردوئی میں بھی حضرت ممدوح مدظلہ سے پڑھنے کا موقع ملا، حضرت کی شانِ تدریس ایک مستقل کرامت ہے، وہ پڑھاتے نہیں تھے گھول کے پلاتے تھے، طالب علم کے شوق تعلّم کی مقدار چاہے کچھ بھی ہو ان کے ذوقِ تعلیم کا معیار اس کو پڑھنے پر مجبور کرتا تھا، ان کے ہاں چھٹی کا کوئی دن نہ تھا، جمعہ کے دن بھی تہجد میں اٹھاتے اور کتابیں لے کر کمرہ پر پہونچ جانے کی ہدایت دیتے، مجھے پڑھنے سے بچنے کے مواقع بہت تھے کہ میں ہردوئی میں حضرت محی السنۃؒ کے کاشانۂ مبارک میں رہتا تھا، گھر کی خدمات اگرچہ نظامِ تعلیم میں کچھ مُخل نہ تھیں، مگر ہر طالب علم کی طرح علم کی مستقبلی اہمیت سے بے خبر رہنے اور اسباق میں شرکت سے بچنے کی صورتیں مُیسر ہونے کے سبب دیگر جماعتوں میں تو بے توجہی کا شکار رہا، لیکن حضرت قاری صاحب مدظلہ کے اسباق سے بچ نہ سکا کیونکہ اِن سے متعلقہ اسباق کی بہرصورت پابندی کرنی ہوتی تھی، ویسے سبھی اساتذہ ماشاء اللہ مُخلص وقابل اور میرے خیر خواہ تھے، ان کے احسانات اور مہربانیوں کا کسی طرح انکار کئے بغیر مذکورہ بالا صورتحال کی روشنی میں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مجھے فارسی وعربی کی جو شُد بُد حاصل ہے وہ حضرت قاری صاحب مدظلہ العالی کی رہینِ منت ہے۔ الغرض "ہدایۃ النحو" ہی تک پڑھ سکا تھا کہ صحت ناساز ہوگئی اور بگڑتی ہی چلی گئی، مقامی ڈاکٹر نے تجویز کی کہ آب وہوا سے مقابلہ مشکل ہے گھر واپس کردیا جائے، چنانچہ حیدرآباد واپسی ہوئی، یہ واپسی بھی مخدومی حضرت قاری صاحب مدظلہ ہی کے ہمراہ ہوئی، اس سفر کا ایک واقعہ ذہن میں آگیا جو طلبہ کے لئے بڑا عبرت آموز ہے، میں جب واپسی کی تیاری کر رہا تھا میرے ایک حیدرآبادی ساتھی نے اپنا ایک صندوق لیجا کر گھر پہونچادینے کے لئے میرے سپرد کردیا، میں نے اپنے صندوق میں اپنا سامان اور ان کے صندوق میں اپنا بستر رکھ کر دوایٹم کرلئے جب مدرسہ سے اسٹیشن کے لئے رکشہ پر سوار ہورہے تھے حضرت قاری صاحب مدظلہ کی نظر دوصندوقوں پر پڑی، اور سخت عتاب

ہوا کہ کہیں طالبعلم کے پاس اتنا سامان ہوتا ہے؟ طالب علم ہو یا تاجر؟ خوب یاد ہے کہ خفگی وعتاب کا یہ سلسلہ جو اشرف المدارس ہردوئی کے پھاٹک سے شروع ہوا تھا وہ حیدرآباد اسٹیشن پہونچنے تک جاری رہا، مجھے یہ ملال ہوتا رہا کہ میرا سامان کچھ زیادہ نہ تھا بس ایک ساتھی کی ہمدردی میں حضرت الاستاذ کی ناراضگی بھگتنی پڑ رہی ہے، کچھ جواب دینے کی مجال تھی نہ صفائی پیش کرنے کی ہمت! لیکن اس میں ایک فائدہ یہ ہوا کہ حضرت قاری صاحب مدظلہ راستہ میں وقفہ وقفہ سے اس حوالہ سے ناراض ہوتے اور جب ناراض ہوتے تو دیر تک اپنی اور دوسرے اکابر کی طالب علمی کے احوال سناتے جاتے تھے جن سے بہت معلومات اور بڑی عبرت حاصل ہوئی۔

قصہ مختصر! حیدرآباد پہونچ کر ایک مدرسہ میں داخلہ لیا تو پہلے ہی دن ایک استاذ جماعت میں آئے اور کبریٰ کی عبارت وترجمہ پڑھوا کر دیکھا، پھر انہوں نے اپنا کام اس طرح ہلکا کرلیا کہ وہ کلاس میں خطوط لکھنے میں مشغول رہتے اور مجھے ساتھیوں کی عبارت حل کروانے اور مفہوم سمجھا دینے کا حکم ہوتا، اشرف المدارس ہردوئی کے منظّم ماحول کے برخلاف یہاں جماعتوں اور طلبہ کی بدنظمی سے طبیعت مایوس ہوگئی تو مرشدی حضرت محی السنۃؒ سے ترکِ تعلیم کرکے تدریس میں مشغول ہوجانے کی اجازت حاصل کرلی، مدرسہ فیض العلوم میں مکان تھا وہیں پڑھانا بھی تھا لیکن وہاں کے اصول کے مطابق شعبہ حفظ میں تدریس کیلئے "تصحیح" (یعنی نورانی قاعدہ وناظرہ کی درستگی) ضروری ہے، حسنِ اتفاق کہئے یا خوبیٔ قسمت کہ اس سال بھی مخدومی حضرت قاری صاحب مدظلہ کا قیام حیدرآباد ہی تھا، استاذ محترم مولوی سید قادر معظم شہیدؒ سے مشق کرتا اور حضرت قاری صاحب مدظلہ کو امتحان دیتا تھا، الحمدللہ اس کی تکمیل پر مدرسہ میں تقرر ہوگیا، پڑھانے کے اوقات کے علاوہ بہت وقت فارغ رہتا تھا۔

مطالعہ کا بالخصوص اکابر کی سوانح وملفوظات کے مطالعہ کا بہت شوق تھا، دن میں مدرسہ میں پڑھاتا، امامت کرتا اور بقیہ وقت مجلّات یا مصنفات کے مطالعہ میں گذارتا تھا،

میرے ایک مرحوم دوست نابینا تھے، انہیں بھی اسی کا ذوق تھا وہ سنتے رہتے میں سناتا رہتا، وہ انتہائی ذہین تھے مضامین ان کے ذہن میں تو سو فی صد محفوظ رہتے مگر میرا حافظہ ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، میں ان کے مقابلہ میں نصف محفوظ رکھ سکتا تھا۔ ان کتابوں کے مطالعہ کے دوران داعیہ پیدا ہوتا تھا کہ اکابر کی یہ تعلیمات اور انکے موثر ملفوظات وقابلِ رشک حالات عوام الناس تک بھی پہونچنے چاہیئے تاکہ انہیں پتہ تو چلے کہ ہمارے اکابر کی شان کیا تھی؟ یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ مدرسہ ہذا ہی سے کوئی رسالہ جاری ہوجاتا، اس زمانہ میں جنوبی ہندوستان سے ہمارے اکابر کے مسلک پر مشتمل رسائل بس اکّا دُکّا ہی شائع ہوا کرتے تھے، اور وہ بھی ظاہری اعتبار سے غیر معیاری قسم کے! میں نے ایک دن ہمت کرکے حضرت محی السنۃؒ کو خط لکھا اس میں اسکی ضرورت کا تذکرہ کرکے عرض کیا کہ اگرچہ کہ احقر اس ذمہ داری کا اہل نہیں لیکن حضرت والا کی توجہ اور دعا ہو تو میں ہی آغاز کردیتا ہوں، حضرتؒ نے اس تجویز سے اتفاق اور اس کی تائید فرمائی لیکن ساتھ ہی یہ سوال بھی فرمایا کہ مدرسہ کی خدمات کے ساتھ اس کام کیلئے کیسے وقت دے سکو گے، جبکہ یہ مستقل توجہ کا کام ہے؟ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا اس لئے بات یہیں پر ختم ہوگئی۔

کچھ دنوں کے بعد متعدد بزرگوں[1] کے مشوروں اور عملی تجربوں سے اپنا سلسلہ تعلیم مکمل کرنے کا داعیہ اس قدر شدید ہوا کہ دبنے کا نام نہ لیتا تھا، میں نے اس جذبہ کا اظہار مرشدی حضرت محی السنۃؒ کے سامنے بذریعہ خط کیا، حضرت والا نے استعفیٰ دیکر پڑھائی میں لگ جانے کی اجازت عطا فرمادی، چنانچہ دارالعلوم حیدرآباد کا انتخاب کرکے داخلہ کے لئے پہونچ گیا، استاذی حضرت مفتی نوال الرحمٰن صاحب مدظلہ اس زمانے میں وہاں کے صدر مدرس تھے، ان کی خدمت میں درخواست گذاردی، انہوں نے تحریر وتعبیر کے مدنظر مجھ سے پوچھا کہ یہ درخواست کس نے لکھی؟ عرض کیا: میں نے ہی! اس پر ازراہِ مزاح دریافت فرمایا: سند چاہتے ہو یا واقعی پڑھنا؟ عرض کیا: پڑھنے کا شوق ہی

[1] بالخصوص حضرت مولانا حمید الدین عاقل حسامی رحمۃ اللہ علیہ

یہاں تک لایا ہے! اس پر حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے مولانا مفتی شکیل احمد صاحب سیتاپوری کو امتحان لینے اور جماعت تجویز کرنے کی ہدایت دی، انہوں نے ”قدوری“ کی عبارت پڑھوا کر ترجمہ کروایا اور جماعت پنجم تجویز فرمائی، یہ وسط سال تھا جماعتِ پنجم میں بہ حیثیت سامع شریک رہا، اگلے سال باقاعدہ ششم میں پڑھتا رہا، متأہل ہونے کی وجہ سے گھر کی ذمہ داریاں تھیں، اس کے لئے امامت کر لیتا تھا اور روزانہ تقریباً ۲۰؍کلو میٹر سائکلنگ کرنی ہوتی تھی، پھر بھی شوق مشقت پر غالب تھا، اہتمام سے پڑھتا رہا مگر اس اثنا میں ایک آنکھ کی بینائی کم ہوگئی، جس کی وجہ سے ٹرافک میں سائکل چلانا مشکل ہوگیا، مجبوراً دوبارہ ترکِ تعلیم کر کے ”ادارہ اشرف العلوم“ کے نام سے ایک مکتب کی بنا رکھی اور محلے کے بچوں کو تجوید وقرأت کی تعلیم دینے میں مشغول ہوگیا، ادھر تکمیل تعلیم کی آرزو بجھی تو نہ تھی مجبوری نے اسے دبا دیا تھا، آنکھ کا علاج چلتا رہا، آپریشن بھی ہوا، آپریشن کے بعد روشنی بہت حد تک بحال بھی ہوگئی تھی، اسی اثنا میں دارالعلوم حیدرآباد میں ”ختم بخاری شریف“ کی مناسبت سے حضرت مولانا سلمان صاحب مدظلہ ناظمِ اعلیٰ مدرسہ مظاہرعلوم سہارنپور تشریف لائے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے بیان میں طلب علم کی راہ میں قربانیاں دینے والوں کے واقعات اس قدر تأثر میں ڈوب کر سنائے کہ مجبوریوں اور معذوریوں میں دبی تکمیل تعلیم کی رگِ آرزو پھڑک اٹھی، مگر اس وقت تک اشرف العلوم مکتب سے ترقی کر کے اچھا خاصا اقامتی مدرسہ بن چکا تھا، تقریباً تین سو طلبہ پڑھ رہے تھے، سر پر اس کی بڑی ذمہ داری تھی، مگر ہمت باندھتا اور خاطر کو جمع کرتا رہا، فضل ایزدی نے مدد کی اور توفیق شاملِ حال رہی، شوال میں اپنے مدرسے کے داخلوں سے فارغ ہوتے ہی دارالعلوم حیدرآباد پہنچ کر اپنے لئے ”دورۂ حدیث شریف“ میں داخلہ حاصل کرلیا، اور الحمد للہ پورے سال مدرسہ جاتا رہا، بال بچوں کے مسائل، خانگی ذمہ داریاں، مدرسہ کی مشکلات ومسائل، امامت اور مسجد کے مسائل پیچھے لگے رہے بلکہ ہمت توڑتے

رہے مگر اس کو بس بزرگوں کی دعائیں اور تائیدِ غیبی ہی سمجھئے کہ بات سالانہ امتحان تک بنی رہی ، امتحان شروع ہوا اور اس سے ایک دن قبل اسکوٹر کا ایکسیڈنٹ ہو کر کالر بون ٹوٹ گئی ، وہ بھی داھنی جانب کی ، اس کی وجہ سے داہنا ہاتھ کام کرنے سے معذور ہو گیا ، مگر اللہ اللہ! شوق اور عزم بھی کس غضب کی قوت کا نام ہے اسی حال میں کسی کے ہمراہ دارالعلوم پہونچتا رہا اور بائیں ہاتھ سے پرچے لکھتا رہا۔ اپنی تعلیمی کیفیت کے مدنظر ضمیر تو بس اتنے پر راضی تھا کہ ناکامی کی رسوائی نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ کا بے پناہ کرم دیکھئے جب نتیجہ نکلا تو دورہ حدیث کی پوری جماعت میں ایک ذہین طالب علم کے بعد دوسری پوزیشن اسی عاجز کے حق میں مقدر ہوئی ، واقعی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کوششوں کا بڑا قدرداں ہے خواہ وہ کوشش کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**

یہ شعبان ۱۴۱۳ھ م ۱۹۹۳ کی بات ہے ، جبکہ اس عاجز کی عمر ۳۴ ر سال تھی اسی کے اگلے سال محرم الحرام ۱۴۱۴ھ سے میں نے اپنی دیرینہ تمنا پوری کرتے ہوئے ادارہ اشرف العلوم سے بنامِ خدا ایک ماہنامہ کا اجراء کر دیا ، یہ ماہنامہ ابتداءً "اشرف العلوم" کے نام سے آٹھ سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا ، پھر بعض عوارض کی بنا پانچ سال تک موقوف رہا ، اس کے بعد اس کی دوبارہ اشاعت کا سلسلہ جنوری ۲۰۰۶ء سے بنام "اشرف الجرائد" شروع ہوا ، جو تا ہنوز بفضلہٖ تعالیٰ جاری ہے ، اور علاقہ کے اردو جرائد میں اچھی نظر سے دیکھا جا رہا ہے ، ۔اس ماہنامہ کی برکت سے مجھے کچھ لکھنے کا موقع ملتا رہا ، کبھی حالاتِ پیش آمدہ پر ، کبھی مواقع و مواسم کی مناسبت سے ، کبھی کسی مسئلہ شرعی پر ۔ روشنی ڈالنے کیلئے اس عرصہ میں اس عاجز نے جو کچھ لکھا ہے زیر نظر کتاب انہی متفرق و متنوع مضامین کا مجموعہ ہے ، اس پوری داستان کے سنانے کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ میری اپنی ضابطہ کی پڑھائی کا بھی یہ حال ہے تو اس سے میرے اندر جو کچھ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہوگی وہ آپ سمجھ لیں کہ کس قدر ہوگی ، یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے اور میرے

اکابر کی توجہات کہ اسی کمزور صلاحیت کے ذریعہ جس قدر بھی ہوسکر ہا ہے دین کی خدمت کرر ہا ہوں، اور یہ بھی حق ہے کہ جو کچھ بھی ہوسکر ہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے اور اس عاجز پر اس کی شکر گذاری فرض ہے۔ **اللھم لا احصی ثناء اعلیک انت کما اثنیت علی نفسک و الحمد للہ الذی بنعمتہٖ تتم الصالحات .**

بہرحال! قارئین سے گذارش ہے کہ زیرِ نظر مجموعۂ مضامین کو صاحبِ مضامین کے اسی پس منظر میں دیکھا جائے اور اس سے زیادہ توقع نہ رکھی جائے تو ناظرین کیلئے انشاءاللہ تحریر وتعبیر کا بے ڈھنگا پن زیادہ گرانی کا سبب نہ بنے گا۔

کتاب کا نام مرشدی ومربی حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پرنامبٹی مدظلہ العالی کے اسمِ گرامی سے تبرک حاصل کرتے ہوئے ''فیض سعید'' رکھا ہوں، حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اس عاجز پر مرشدِ اول محی السنۃ حضرت شاہ ابرارالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد بے انتہا احسانات اور خصوصی توجہات ہیں ،اسی کی برکت سے یہ بندۂ عاجز وعاصی مسلمانوں کی نظر میں کسی عزت کا مستحق ہوسکا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی عمر صحت اور سلامتی میں بے انتہا برکت نصیب فرمائے۔آمین

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کے بندوں کی دینی وفکری راہنمائی کیلئے حسبِ حیثیت کی گئی اس سعی کو شرفِ قبول عطا فرمائے ، اور تمام تر کوتاہیوں کے باوجود محض اپنی قدرت سے ان مضامین کے نفع کو تام وعام فرمائے۔آخر میں عزیزم مولوی خواجہ نصیر الدین سلمہ نے اسکی ترتیب میں جو صبر آزما تعاون کیا ہے اسکا میں ممنون ہوں اور ظاہری وباطنی ترقیات کی دعاؤں کے ذریعہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

والسلام

محمد عبدالقوی

۸؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

# عبادت سے عبدیت تک

عبادت، بندگی کو اور عبدیت حاصلِ بندگی اور حقیقتِ بندگی کو کہتے ہیں ۔ عبودیت دل کا عمل اور عبادت اعضاء وجوارح کا عمل ہے۔[۱]

ایک عبادت گذار حقیقی معنوں میں عبادت گذار اُسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ اس کی عبادت محض نقل وحرکت نہ ہو بلکہ اس کے دل کے اندر موجود جذبہ عبودیت کا مظہر بن کر رونما ہوئی ہو، اس لئے عبودیت ہی نجاتِ کاملہ کا مدار، قبول اعمال کا وسیلہ اور تقربِ خداوندی کا زینہ ہے، جس بندہ میں جس قدر عبودیت ہوگی اُسی قدر وہ اللہ تعالیٰ کا مقرب ہوگا اور جس قدر اس مبارک صفت کی کمی ہوگی ـــــ باوجود اعمالِ ظاہرہ کے بھی ـــــ اسی قدر قربِ الٰہی سے محروم ومحجوب رہے گا۔ گوفرض اس کے ذمہ سے ساقط ہوجائے گا مگر قبولیت وثواب کا حقدار نہ ہوسکے گا جو ان عبادتوں کا اصل مقصد ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ نے ''عبودیت'' کی تعریف ''**اظهار التذلل**'' سے فرمائی ہے۔[۲] یعنی بندہ کا اپنے باطن سے حق تعالیٰ شانہٗ کی بڑائی وکبریائی، استغناء وبے نیازی اور ترفع وتعلّی کے مقابلہ میں اپنی عاجزی وبےبسی افتقار وحاجتمندی اور ذلت وپستی کا دل میں اقرار اور اعضاء وجوارح میں ان صفات کا شرعی اعمال کے ذریعہ اظہار کرنا ''عبودیت'' ہے۔ پس عبادت اور عبودیت ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں اولاً تو عبادت کا اہتمام ہی کم سے کم ہوتا جارہا ہے اور جسقدر بھی عبادتیں ہورہی ہیں وہ عبودیت کی شان سے عاری ہوتی جارہی ہیں۔

---

[۱] کشاف: ۳/۲۰۰ [۲] فیض القدیر: ۳/۶۶۳

واقعہ یہ ہے کہ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے امام الانبیاء والمرسلین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معیار و نمونہ بنایا ہے اور بہ حیثیت نبی ان کو تمام صفات میں اپنی تمام مخلوق سے اعلیٰ و افضل قرار دیا ہے۔ یہ ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ جب یہ بات ہے تو ظاہر ہے کہ صفت "عبودیت" —— جو باطنی و روحانی احکامات میں سب سے ارفع و اعلیٰ مقام ہے —— میں بھی آپ کو بے مثال اور کامل ترین نمونہ بنایا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کمال کے ہر موقع آپ کی "عبودیت" کی صفت کو اہتمام سے ظاہر فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب نازل کرنے کے ذکر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتَابَ [1] میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی بلندی و شرف خصوصی عطا کرنے کے ذکر سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً [2] میں، عرش پر مخصوص اعزاز و تکلم کے ذکر فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی [3] میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے اپنی خاص معیت و عنایت کے ذکر اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ [4] میں، مکہ مکرمہ میں نہایت مخالفانہ و معاندانہ ماحول میں بھی آپ کی عبادت و دعوت کے کام میں استقامت کے ذکر اَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ [5] میں اور ان جیسے متعدد مقامات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لفظ "عبد" کا استعمال کیا گیا ہے جو آپؐ کی صفتِ عبدیت کی قبولیت و رفعت کا پتہ دیتا ہے۔

پھر ایک آپ ہی کے سلسلہ میں کیا تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کیلئے مواقع تعریف میں اللہ تعالیٰ نے صفتِ "عبدیت" کو اہتمام سے نمایاں فرمایا ہے۔

مثال کے طور پر حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر عَبْدَنَا سے [6] حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر عَبْداً شَکُوراً سے [7] حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر عَبْداً مِنْ عِبَادِنَا سے [8] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر اِنْ ھُوَ اِلاَّ عَبْدٌ سے [9] حضرت

---

[1] الکہف: ۱، [2] نبی اسرائیل: ۱، [3] النجم: ۱۰، [4] الزمر: ۳۶، [5] الجن: ۱۹، [6] ص: ۴۱، [7] الاسراء: ۳، [8] الکہف: ۶۵، [9] الزخرف: ۵۹

زکریا علیہ السلام کا ذکر **عَبْدَہٗ** سے[۱] حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر **نِعْمَ الْعَبْدُ**'' سے[۲] حضرت ابراھیم، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب علیہم السلام کا ذکر **عِبَادَنَا** سے[۳] کر کے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اندر موجود ''صفتِ عبدیت'' کے کمال کی تعریف فرمائی اور اس کی اہمیت جتائی ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ اپنے مخصوص و محبوب بندوں یعنی اولیاء اللہ کا ذکر کرتے ہوئے اُنھیں **عِبَادُ الرَّحْمٰنِ** فرمایا[۴] جس سے معلوم ہوا کہ نبوت و رسالت کیطرح ولایت کا وصفِ امتیازی بھی ''عبدیت'' ہی ہے۔ نیز اس سلسلہ میں عیسائیوں کی ذہنی بیماری ـــــ انبیاء علیہم السلام کی تعریف و تعارف میں ناروا غلو ـــــ کو رد کرتے ہوئے فرمایا ''مسیح اللہ تعالیٰ کے ایک عبد ہونے کو ذرا عار کی بات نہیں سمجھتے تھے (بلکہ فخر فرماتے تھے) اور اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے بھی اپنی عبدیت کو باعث عار نہیں سمجھتے[۵] خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یہود و نصاریٰ کی اس ذہنی بیماری سے خبردار کرنے کے بعد عبدیت و رسالت کی دو صفتوں سے اپنے متعارف ہونے کو پسند فرمایا: **انما انا عبده ورسوله** بلکہ امت کو بھی اپنے بارے میں ان دو کمالات کا اعتقاد رکھنے کا حکم دیا[۶] نیز ہر صاحبِ ایمان کو اپنے ایمان کے اظہار کے لئے جو کلمہ شہادت دیا گیا، جس کے اقرار و شہادت کے بغیر کسی کا مومن ہونا ہی معتبر نہیں، ان میں بھی آپ کی ان دو صفتوں ''عبدیت و رسالت'' کا اقرار کرایا گیا۔ اور ترتیب میں عبدیت کو رسالت پر بھی مقدم فرمایا گیا'' **اشهد انّ محمداً عبده ورسوله**''[۷]

حافظ ابن رجبؒ نے امام احمدؒ کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے آپ نے سامنے نظر ڈالی تو ایک عظیم الجثہ مقرب فرشتہ بھی موجود تھا۔ اس فرشتہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے سوال فرماتے ہیں کہ آپ رسالت کے ساتھ عبدیت کا مقام چاہتے ہیں یا ملوکیت کا؟ آپ نے جبرئیل سے

[۱] مریم:۱۹، [۲] ص:۳۰، [۳] ایضاً:۴۵، [۴] الفرقان:۶۳، [۵] النساء:۱۷۲، [۶] مشکوٰۃ شریف [۷] بخاری: کتاب الرقاق،

اشارہ لے کر "عبدیت" کا انتخاب فرمایا۔

امام زہریؒ اس واقعہ کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کا خیال تھا کہ اسکے بعد سے لے کر دُنیا سے پردہ فرمانے تک کبھی آپ نے کوئی کام شانِ عبدیت کے خلاف نہیں کیا۔ یہاں تک کہ کبھی ٹیک لگا کر کھانا تک نہیں کھایا۔

امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے "میں بندوں کی طرح بیٹھتا ہوں اور بندوں کی طرح کھاتا ہوں" یعنی اپنی تمام حرکات وسکنات میں ''صفتِ عبدیت'' کے اظہار کو پسند کرتا ہوں[۱]

یحییٰ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں بندگی وعبودیت کی صفت جو آپ نے شاہی وملوکیت کے مقابلہ میں ترجیح دے کر اللہ تعالیٰ سے لی تھی زندگی بھر اپنے افعال واعمال اور ہیئات وکیفیات سے عملاً اسکا اظہار بھی فرماتے رہے۔[۲]

سراج طوسیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان "عبودیت" سے بلند تر کوئی مقام ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُسے کبھی نہ چھوڑتے نہ ہی اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اس سے محروم رکھتے۔[۳]

سید احمد کبیر رفاعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ہر راہ سے قربِ خداوندی کو حاصل کرنیکی کوشش کی، مگر رسائی نہ ہوسکی لیکن جب میں نے عبدیت یعنی تذلل وانکسار تفویض وافتقار کی راہ اختیار کی تو بہت سہولت سے قرب وقبولیت کے مرتبہ تک پہنچ گیا اوراللہ تعالیٰ نے پھر میری روحانیت کو وہ سب کچھ عطا کیا جس کا اظہار مشکل ہے۔[۴]

حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ انسان کو جس چیز کے حاصل کرنے کے لئے دُنیا میں بھیجا گیا ہے وہ یہی عبدیت ہے۔ کمالِ عبدیت یہ ہے کہ بندہ اپنے کو ہر طرح اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے اور بہرحال اس سے راضی رہے "عبدیت" (آدمی کی روحانیت کے احوال میں) سب سے اعلیٰ درجہ کی حالت ہے۔

---

۱ بخاری شریف، ۲ الخشوع فی الصلوٰۃ، ۳ اللمع :۶۱۷، ۴ بنیان المشید :۱۶۹،

حافظ ابن رجبؒ فرماتے ہیں: اہل اللہ کے نزدیک وہ شخص جس نے عبدیت کا دعویٰ کیا مگر اس کی رائے اور خواہش اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع نہیں ہوگئی تو وہ شخص اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔ عبودیت یہی ہے کہ اسکی پہچان محض "اللہ تعالیٰ" کی غلامی ہو جائے۔[۱]

شیخ محمد تھانویؒ فرماتے ہیں: عبودیت یہ ہیکہ بندہ صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لئے طاعات وعبادات بجالائے، اسکے علاوہ کوئی غرض وغایت نہ ہو اور اس طرح اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے کہ ہر تصرف سے راضی وخوش رہے۔[۲]

سید شریف جرجانیؒ نے "عبودیت" کی تعریف کرتے ہوئے اسکے چار ارکان ذکر کئے ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے تمام عہدوں کی تکمیل (۲) اللہ تعالیٰ کے تمام وعدوں پر رضامندی واطمینان (۳) اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات کی رعایت اور اُن کی پابندی اور (۴) خلافِ طبع اُمور پر صبر۔[۳]

خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ فرماتے ہیں۔

سمجھتے ہیں اہل ممالک تو یہ کہ بس بادشاہت بڑی چیز ہے
مگر جو ہیں اہل نظر اہلِ دل، وہ کہتے ہیں چاہت بڑی چیز ہے

پس معلوم ہوا کہ "عبدیت" انبیاء کرام علیہم السلام، بشمول امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا وصفِ خصوصی ہے جس پر اللہ تبارک وتعالیٰ اور خود ان پیغمبروں کو ناز ہے اور اس لائق ہے کہ پوری اُمت پہلے اس وصف کو اپنے اندر پیدا کرنے کی پھر اس میں کمال حاصل کرنے کی فکر وکوشش کرے، البتہ یہاں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ قرآن وحدیث میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کیا، اولیاء صالحین عامۃ المؤمنین بلکہ مذنبین تک کو "عبد" کہا گیا تو پھر عبدیت کو انبیاء واولیاء اور مقبولینِ بارگاہ کی امتیازی صفت اور تقربِ الٰہی کا اعلیٰ مقام کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ سو اس

۱؎ الخشوع فی الصلوٰۃ، ۲؎ کشاف: ۳/۲۰۰، ۳؎ التعریفات: ۱۶۸،

کا جواب یہ ہے کہ یہ غلط فہمی عبدیت کے مراتب سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صفتِ عبدیت کیلئے بے شمار مقامات ہیں۔ محققین نے اپنے علم وفہم کی حد تک ان کی نشاندہی بھی کی ہے۔ عام مؤمنین میں جو عبدیت پائی جاتی ہے، اور جو عبدیت کا مقام اولیاء وانبیاء کو حاصل ہے اسمیں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ جیسے کہنے کو تو عوام، خواص، اُمتی اور نبی سب ہی کو "مومن ومسلم" کہا جاتا ہے کہ مگر مدارج ومراتب کے اعتبار سے انکے درمیان کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ پس جو مرتبہ عبدیت کا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا گیا ہے وہ آپ کی دیگر صفاتِ مبارکہ کی طرح سب سے اعلیٰ وارفع ہے۔ صحابہ کرام اور تمام اولیاء عظام کو اس صفت کا جس قدر بھی حصہ ملا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے مرتبہ عالی کا عکس وظل ہے اور جو بندہ اس صفت سے محروم رہا اس کی محرومی کا کوئی بھی ٹھکانہ نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے صفت "عبدیت" کو پسند فرمایا، اسی کو ایمان ومعرفت کا سب سے بڑا مقام بنایا ہے۔ انبیاء کرام علیھم الصلوٰۃ والسلام جس طرح تمام صفات میں کامل ومکمل ہوتے ہیں اس صفت میں بھی سب سے مقدم ہیں۔ پھر ان میں بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ عبدیت بلند ترین ہے۔ اُمت کو اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تقرب حاصل ہوسکتا ہے تو عبدیت وانابت کے راستہ ہی سے ہوسکتا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی رسمی عبادتوں میں عبدیت کی جان ڈالنے اور اس کی شان پیدا کرنیکی کوشش کرنی چاہیے، یہی تمام اولیاء اللہ کا مشن تھا اور ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ہم سب کو اس مرتبۂ بلند کا شوق وذوق اور اس کے حصول کا سلیقہ نصیب فرمائیں۔ (آمین)

# دعا کلیدِ بابِ رحمت ہے!

دعا عبادت کا مغز ہے، دعا ہی عبادت ہے۔ دعا بابِ رحمت کی کنجی ہے۔ دعا دین کا ستون ہے، دعا ارض وسما کا نور ہے۔ اور دعا نہ مانگنے والوں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے بے شمار ارشادات ہیں، جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے مبارک عمل کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کا حقیقی مقصد اور انسان کا اصلی کمال بندگی ہے اور بندگی کی حقیقت ''اخبات'' یعنی بندوں کا اپنے عجز وقصور، افتقار واحتیاج اور سراپا نیازمندی اور اللہ تعالیٰ شانہ کی قدرتِ کاملہ اور بڑائی وکبریائی کے اقرار کے ساتھ اس کی جانب مائل ومتوجہ رہنا، بلکہ اپنے آپ کو اس کے مکمل سپرد کردینا۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ بندہ کو سب سے زیادہ دعا والتجا کے موقعہ پر نصیب ہوتی ہے، اس لئے قرآن وحدیث میں دعا کی بڑی اہمیت وفضیلت بتلائی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے ''وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ''[1]

اور اے لوگو! تمہارا رب فرماتا ہے: مجھ سے مانگو میں تمہاری مانگ سنوں گا (اور عطا کروں گا) بے شک جو لوگ میری عبدیت وبندگی سے شرم کرتے ہیں (اور دعا مانگنے کو شان کے خلاف سمجھتے ہیں) عنقریب وہ جہنم میں ذلت ورسوائی کے ساتھ داخل ہوں گے۔

دوسری جگہ فرمایا: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ

[1] المومن: ۶۰

**الدَّاعِ اِذَادَعَانِ فَلیستَجِیبُوا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ** [۱]

اور اے نبی! اگر لوگ آپ سے میرے بارے میں معلوم کریں کہ (میں کہاں ہوں تو آپ فرمادیں) میں (ان سے بہت) قریب ہوں، ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں اور اس کی مانگ دیتا ہوں پس انہیں چاہیے کہ وہ مجھ سے مانگیں، مجھ پر ایمان رکھیں اور اس طرح امید ہے کہ وہ ہدایت یاب ہوں گے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: **اَمْ مَنْ یُجِیبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوءَ** [۲]

(اللہ تعالیٰ کے علاوہ) کون ہے جس کو اگر پکارا جائے تو وہ مکروب و مضطرب کو جواب دے اور اس کی پریشانی دفع کرے۔

پہلی آیت میں دعا کا حکم دے کر اس سے احتراز کرنے والوں کو متکبر قرار دیا گیا اور اس کی سزا ذلت و جہنم متعین کی گئی ہے، دوسری آیت میں اپنا تعارف "دعائیں سننے والے" سے کروا کے دعا کا حکم دیا گیا اور اس پر ہدایت کو موعود فرمایا گیا تیسری آیت میں اپنے معبودِ برحق اور الٰہ واحد ہونے کے دلائل میں "بندوں کی دعاؤں کو سن کر انہیں پورا کرنا" بطورِ دلیل محکم کے بیان کیا گیا۔

حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم انہی ارشاداتِ ربانیہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں " **الدعاء ھو العبادۃ** "دعا ہی حقیقت میں عبادت ہے، یعنی عبادت کی اصل روح اور اس کی حقیقت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپؐ نے فرمایا "**الحج عرفۃ**" حج عرفہ ہے، یعنی وقوفِ عرفات حج کا افضل واعظم رکن ہے۔ اس کے بغیر حج کا تصور ہی نہیں۔ اسی طرح عبادت کا مقصد عجز وقصور، بندگی و نیازمندی کا اظہار ہے، چونکہ وہ دعا میں زیادہ پایا جاتا ہے اس لئے دعا (یا اس کے ذریعہ جو کیفیت بندہ کو نصیب ہوتی ہے) کے بغیر عبادات کا حقیقی

---

۱ البقرۃ: ۱۸۶ ۲ النمل: ۶۲

تصور ہی باطل ہے۔ یہی مطلب " **الدعاء مخ العبادة** "کا بھی ہے یعنی دعاء عبادت کا مغز ہے۔[۱]

اسی طرح آپؐ فرماتے ہیں:"**لیس شئی اکرم علی الله من الدعاء** " یعنی کوئی عمل بندہ کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا کے عمل سے زیادہ قابلِ قدر نہیں۔[۲]

وجہ وہی ہے کہ داعی اپنی ذلت ومسکنت، افتقار واحتیاج اور بندگی کے حقیقی جذبات کے ساتھ رجوع الی اللہ ہوتا ہے اور اللہ کو بندہ میں بس یہی کیفیت سب سے زیادہ عزیز ہے۔

شیخ رفاعیؒ فرماتے ہیں: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ عرض کیا: الٰہی! میں آپ کا تقرب کیسے حاصل کرسکتا ہوں؟ فرمایا گیا: اس چیز کے ذریعہ جو میرے پاس نہیں! عرض کیا وہ کونسی چیز ہے؟ جو آپ کے خزانہ لامتناہی ولامحدود میں موجود نہ ہوگا؟ فرمایا: ذلت ومسکنت، عجز وافتقار۔[۳]

ان روایات سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ لفظِ دعا سے اصل مراد صرف الفاظ وکلمات نہیں ہے بلکہ قلب کی یہ کیفیت ہے۔

رہ گئے دعا کے الفاظ اور ظاہری صورت تو وہ اس کیفیت کا ظاہر وقالب اور لباس ہیں، پس لباس میں وجود نہ ہو تو اس لباس کی کیا قدر و قیمت۔ اسی وجہ سے بغیر آداب وکیفیاتِ عبدیت کے محض سوال پر احادیث میں ناپسندیدگی، بلکہ عدمِ قبولیت کی وعید تک سنائی گئی ہے۔ بہرحال دعا اپنے شرعی مفہوم اور حقیقی کیفیت کے اعتبار سے اہم ترین عبادت اور عظیم ترین نعمت ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا:"**من فتح له منكم باب الدعاء فتحت له ابواب الرحمة**" یعنی جس شخص کو دعاء کی حقیقت اور اس کے اہتمام کی توفیق مل گئی، گویا اسکے لئے رحمت وعنایت الٰہی کے تمام دروازے کھل گئے۔[۴]

---

۱ ترمذی شریف: ۲۷۳/۵ ۲ ابن ماجہ شریف: ۱۲۰۸/۲ ۳ بنیان المشید ۴ ترمذی شریف: ۳۲۲/۵

جب یہ بات ہے تو وہ شخص جس کو دعاؤں کے اہتمام کی عادت پڑ گئی اور اس کا ذوق صحیح نصیب ہو گیا، وہ ہر قسم کی ضلالت و ہلاکت سے محفوظ ہو گیا۔ ارشاد ہے: **انّه لن یهلک احد مع الدعاء** کوئی شخص دعا پر مداومت کی توفیق کے بعد ہلاک نہیں ہو سکتا۔[۱]

نیز آپؐ نے دعا کو مؤمن کا ہتھیار اور دین کا ستون قرار دیا ہے۔[۲] یعنی جس طرح عمارت کی بقاء کا انحصار ستونوں کی پختگی و مضبوطی پر ہے، اسی طرح دین کی بقاء بلکہ اس کی قبولیت بھی شانِ عبدیت کے کمال پر ہے، جس کا مظہر اتم دعا کا عمل ہے اور جس طرح آدمی فطرتاً دشمن سے اپنی حفاظت کے لئے اسلحہ کا انتظام اور اس پر اطمینان رکھتا ہے، اسی طرح مؤمن کو افکار و احزان کے دفعیہ اور ازالہ کے لئے دعا کو اپنی عادت بنالینا اور اس عادت پر اطمینان و اعتماد رکھنا چاہیے۔

علامہ عبدالرؤوف مناویؒ نے حدیث کی شرح میں یہ قابلِ توجہ نکتہ بھی نکالا ہے کہ (۱) اسلحہ کے ذریعہ بھی جنگ میں کامیابی اسی وقت مل سکتی ہے جبکہ وہ اسلحہ کار کرد، عمدہ اور بقدرِ ضرورت ہو، (۲) استعمال کرنے والا طاقتور، مضبوط اور استعمال کے صحیح طریق سے واقف ہو، (۳) اس کے اور نشانہ کے درمیان کوئی مانع اور حائل موجود نہ ہو، اسی طرح دعا کا مقبول و مؤثر ہونا بھی تین صفات کے پائے جانے پر موقوف ہے (۱) دعا کا مضمون صحیح ہو، (۲) دعا کرنے والا اپنی زبان و الفاظ کے ساتھ دل و دھیان کو بھی متوجہ رکھے ہوئے ہو، (۳) مانع قبولیت حرکات مثلاً قطع رحمی، حرام خوری وغیرہ سے بچتا ہو۔[۳]

غرض یہ کہ دعا اپنی شرائط و آداب کے ساتھ کی جائے تو وہ بہت بڑی عبادت ہے، اس میں ہر طاقت سے بڑی طاقت اور ہر برکت سے بڑی برکت پوشیدہ ہے، وہ حصن حصین یعنی مضبوط قلعہ ہے اور دنیا و آخرت کی موجود و مخدوش ہر قسم کی ہلاکت

---

۱؎ ابن حبان: ۸۹/۲ ۲؎ فیض القدیر: ۲۶۴/۳ ۳؎ ایضاً

محرومی سے حفاظت کا ذریعہ ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ''**ان الدعاء ينفع مما نزل ومما لم ينزل فعليكم بالدعا**''

بے شک دعا موجودہ حالات اور درپیش خطرات سب کے لئے مؤثر اور نافع ہے، پس اے اللہ کے بندو! ایسی بڑی نعمت سے محروم نہ رہو، اسکو اپنے اوپر لازم کر لو، دعا کی عادت ڈال لو۔[1]

اللہ تعالیٰ بڑے رحم وکرم والے ہیں، اپنے بندوں سے نہایت محبت فرماتے ہیں، قدرتِ کاملہ کے مالک ہیں، جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، کوئی ان کو ٹوک سکتا ہے نہ پوچھ سکتا ہے، بے انتہاء ولامحدود خزانوں کے مالک ہیں، ان کی عطا وسخا ان کے خزانوں میں کمی نہیں کرتی۔

سب کریموں سے بڑے کریم ہیں سائل کو نہ دینا اور مانگنے والوں کو محروم لوٹانا اپنی شانِ کرم کے خلاف سمجھتے ہیں، اسلئے مانگنے والوں کو خوب عطا کرتے ہیں، کسی کو محروم نہیں فرماتے، ارشادِ نبوی ہے: ''**ان ربكم حيي كريم يستحي من عبده اذا رفع يديه ان يردهما صفرا**'' بے شک تمہارا پروردگار بہت ہی غیور اور مہربان ہے، اپنے بندوں کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو خالی لوٹاتے ہوئے اسے شرم آتی ہے۔[2]

اسکے برخلاف اگر کوئی بندہ اس کے سامنے اپنی احتیاج ظاہر نہیں کرتا اور عاجزی ومسکنت کے ساتھ رجوع نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو اس پر غصہ آتا ہے، ارشاد ہے: **من لم يسئل اللّٰه يغضب عليه** جو اللہ تعالیٰ سے دعا والتجا نہیں کرتا حاجات وضروریات نہیں مانگتا تو اللہ تعالیٰ اس پر غصہ ہوتے ہیں۔[3]

ساری مخلوق حتی کہ ماں باپ تک بھی بار بار کے مانگنے سے اکتاتے اور غصہ ہوتے ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ نہ مانگنے والے پر غصہ ہوتے ہیں۔ وجہ

---

۱؎ مسند احمد: ۳۳۴/۵ ۲؎ ابوداؤد: ۷۸/۲ ۳؎ ترمذی: ۲۷۴۵

اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا والتجا کرنا عبادت و بندگی ہے اور نہ کرنا انکار واستکبار ہے، اور اس کی عطا و بخشش کا انکار یا اس کی طلب سے استکبار دونوں عادتیں یقیناً ان کے غضب کی موجب ہیں۔

پھر یاد رکھئے! اللہ تعالیٰ کا غصہ ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ امام ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی میں ہر قسم کی خیر اور اس کی خفگی و ناراضگی میں ہر طرح کی بلا ومصیبت پوشیدہ ہوتی ہے۔ پس کوئی دن مؤمن کا اللہ تعالیٰ سے دعا والتجا کے بغیر نہیں گذرنا چاہیے۔ جو دن بغیر اللہ تعالیٰ سے دعا والتجا کے گذرے گا، اس دن بندہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا۔[1]

دعا کی حقیقت اور اہمیت وفضیلت کا بیان ختم کرتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ علامہ عبدالرؤوف مناویؒ کا دعاؤں کے بارے میں بیان کردہ یہ نکتہ بھی نقل کردوں۔ وہ فرماتے ہیں: پچھلی امتیں براہِ راست اللہ تعالیٰ سے سامنے اپنی حاجات پیش نہیں کرسکتی تھیں، اپنے نبی کے سامنے عرض کرتی تھیں، پھر نبی ان حاجات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرتے تھے، یہ صرف اس امت کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس کے ہر فرد کو براہِ راست اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنے کی اجازت بلکہ ہدایت دی گئی ہے۔[2]

بہرحال یہاں تک تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وارشادات کی روشنی میں دعا کی حقیقت وفضیلت اور اہمیت کا ذکر تھا۔ جہاں تک اس سلسلہ میں خود آپؐ کے عمل وعادت کا تعلق ہے، سیرتِ طیبہ میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دعا کا عمل آپؐ کی زندگی کے تمام اعمال پر غالب وفائق تھا، کیونکہ آپؐ عبدیتِ کاملہ کے بلند مرتبہ پر فائز تھے اور مظاہر عبدیت میں سب سے اعلیٰ وارفع مقام آپ گذشتہ سطور میں معلوم کرچکے ہیں کہ دعا کو حاصل ہے۔ صبح بیدار ہونے سے لے

[1] فیض القدیر: ۳/ ۱۵ [2] ایضاً: ۳/ ۲۶۳

کر پھر صبح تک دن تمام اور رات کے دوران بھی کوئی حرکت وعمل ، کوئی تغیر حالت ایسی نہیں ہے جس میں آپؐ اپنے رب کا کوئی ذکر یا اس کے حضور کوئی التجا نہ فرماتے ہوں ۔

ہر عمل کا آغاز دعائے استمداد و استعانت سے اور اختتام ، کلماتِ تشکر و امتنان پر ہوتا تھا ۔ ہر حدیث کی کتاب میں بیسیوں صفحات آپؐ کی دعاؤں کے ذکر پر مشتمل موجود ہیں ۔ تمام محدثین نے اپنی کتبِ حدیث میں دعا کے ذیلی واقعات کے علاوہ مستقلاً "کتاب الدعوات" یا "ابواب الذکر والدعا" کا عنوان ضرور قائم فرمایا ہے ۔ پھر اس کے تحت (مجموعی طور پر) سینکڑوں روایات نقل فرمائی ہیں ۔ میں نے صرف مشکوٰۃ شریف میں سرسری طور پر آپؐ کی مختلف مواقع پر کی گئی ۱۴۸ دعائیں شمار کی ہیں ۔ بعض محدثین نے تو اس عنوان پر مستقل رسائل تصنیف فرمائے ہیں ۔ "الاذکار" کے مقدمہ میں تیرہویں صدی کے وسط تک دعا کے سلسلہ میں ۳۷ مشہور تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس میں سب سے اولیت کا شرف امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد خاص حضرت امام ابو یوسفؒ کو حاصل ہے ۔[1]

آپ کی دعاؤں کی یہ تعداد اور محدثین عظام کا اسکے جمع ، حفظ اور ان پر عمل کے ساتھ یہ شغف و انہماک بجائے خود آپؐ کے اسوۂ حسنہ میں دعا کے اہتمام اور تعلق کو سمجھنے کے لئے بہت کافی ہے ۔ پھر اگر ہم ان دعاؤں کے مضامین میں غور کریں تو پتہ چلے گا کہ یہ دعائیں اگر ایک طرف آپؐ کی عبدیتِ کاملہ کا عکس جمیل ہیں تو دوسری طرف حق تعالیٰ شانہ کی شانِ احدیت ، صمدیت ، بڑائی و کبرائی کا درس جلیل ہیں ، تیسری جانب انسان کی دینی ، دنیوی ، انفرادی و اجتماعی ہر قسم کی تمام ضروریات کو شامل و محیط ہیں ۔

آج ڈیڑھ ہزار برس بعد کے زمانہ میں (جبکہ دنیا اور اس کے احوال سو فیصد

[1] الاذکار للنووی:۲۲

تبدیل ہو چکے ہیں ) بھی آدمی کی کوئی حاجت ایسی نہیں ہے جو آپ ؐ کی مانگی ہوئی دعاؤں میں شامل نہ ہو ۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی بڑے سے بڑے عالم کو بھی آپ ؐ کی دعاؤں کے مضامین میں غور کئے بغیر نہ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل ہو سکتی ہے اور نہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام بلند سے کما حقہ واقفیت مل سکتی ہے ۔

اس عاجز کے خیال میں اگر کوئی شخص آپ ؐ کی ان دعاؤں میں غور و تدبر کرے، تو انشاء اللہ تعالیٰ اس پر توحید و رسالت کی حقیقت ، اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ کے درمیان رشتہ و تعلق کی نوعیت ، آپ ؐ کی عبدیتِ کاملہ کی حیثیت ، توکل علی اللہ اور یقین و ایمان کی نوعیت ، دین اسلام کی حقانیت پر ذہنی و قلبی طمانیت ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے تعلق و محبت میں بے انتہاء اضافہ کی دولت ، اپنی واقعی اور حقیقی ضرورتوں سے واقفیت اور ان ضرورتوں کو اللہ تعالیٰ سے حاصل کرنے کا عمدہ طریقہ اور بہتر سلیقہ ، غرض یہ ہیکہ ایمان و معرفت سے لے کر تحصیلِ مقاصد تک کوئی باب ایسا نہ ہوگا جو اس پر نہ کھلے گا ، اور شکوک و وساوس کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہوگا جو اس کے بعد کافور نہ ہو جائے گا ۔ بے ساختہ پکار اٹھے گا ۔

یا رب صل و سلم دائما ابدا
علی حبیبک خیر الخلق کلھم

# ماہِ شعبان اور شبِ برأت

اسلام میں کوئی موسم اور کوئی موقعہ منحوس نہیں مانا جاتا، البتہ بعض مواقع کو مبارک ومسعود مان کران میں طاعت وعبادت کی کثرت کا ثبوت ضرور ملتا ہے، چنانچہ بعض ساعتوں کو بعض دوسری ساعتوں پر، بعض دنوں کو بعض دوسرے دنوں پر، بعض راتوں کو اور بعض دوسری راتوں پر اور بعض مہینوں کو بعض دیگر مہینوں پر فضیلت وفوقیت کا حاصل ہونا قرآن وحدیث میں مذکور اور ثابت ہے، اور یہ فضیلت ایسی ہی ہے جس طرح بعض مقاماتِ خاصہ کا بعض دیگر مقامات سے افضل ومتبرک ہونا کتاب وسنت سے ثابت ہے۔

چنانچہ شعبان المعظم کا مہینہ بھی خاص فضیلت وبرکت کا حامل ہے، اور یہ فضیلت اس کو اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے حاصل ہے۔ مثلاً (۱) رمضان المبارک جیسے مقدس اور رجب جیسے محترم مہینوں کے درمیان اس کا واقع ہونا، (۲) نبی کریم ﷺ کا اپنے لئے اس ماہ میں خصوصیت سے برکت کی دعا مانگنا، (۳) کثرت سے اس میں آپ کا روزے رکھنا، (۴) اس میں "**لیلۃ البرأۃ**" کا واقع ہونا، (۵) بندوں کی روزی اور موت کے فیصلوں کا اس میں متعلقہ فرشتوں کے حوالہ کیا جانا اور (۶) اعمال کا رب تعالیٰ کے حضور میں پیش کیا جانا وغیرہ، یہ سب ایسے امور ہیں جن سے اس ماہ کی عظمت وفضیلت کا اندازہ ہوتا ہے، اور خود اسکے نام کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے بعضے مشائخ نے فرمایا: "**انما سمی شعبان لانہ ینشعب فیہ خیر کثیر**" شعبان کو شعبان اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں

اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لئے خیر کثیر پھیلا دی جاتی ہے۔

بہرحال! یہ اور اس طرح کی بہت سی فضیلتیں ہیں جن کی بناء پر آپ ﷺ اس ماہ کی بڑی قدر فرماتے تھے، اور اس میں روزوں کی کثرت فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ سے ترمذی میں نقل کیا گیا ہے کہ ”نبی ﷺ کو میں نے شعبان کے علاوہ کسی مہینے میں مسلسل روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا“۔

محدثین نے مختلف روایات کے مدنظر یہ فرمایا ہے کہ آپ ﷺ شعبان میں بکثرت روزہ رکھا کرتے تھے، پورا مہینہ نہیں رکھتے تھے، جن روایات میں ”بل یصوم کلہ“ کے الفاظ ہیں وہ بھی عرب کے محاورہ اور دیگر روایات کی روشنی میں ”اکثر“ پر محمول ہوں گے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعبان میں روزوں کا اتنا اہتمام کیوں فرماتے تھے؟ اسکی وجہ بھی حضرت عائشہؓ کے استفسار پر آپؐ نے خود ارشاد فرمائی کہ ”اس ماہ میں چونکہ اللہ تعالیٰ سال بھر میں مرنے والوں (کی فہرست) صادر فرما کر متعلقہ فرشتوں کے حوالہ فرماتے ہیں اسلئے میں چاہتا ہوں کہ میری موت (کا حکم) اس حال میں جاری ہو کہ میں روزہ سے ہوں“[1] اور سنن نسائی میں اسامہؓ بن زیدؓ کے اسی قسم کے سوال پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی مروی ہے ”رجب ورمضان کے درمیان یہ ایک ایسا (مبارک) مہینہ ہے جس (کی فضیلت) سے لوگ غافل ہیں، یہ ایسا مہینہ ہے جس میں بندوں کے اعمال بارگاہِ خداوندی میں پیش کئے جاتے ہیں، سو میں چاہتا ہوں کہ میرے اعمال اس حال میں پیش ہوں کہ میں روزہ سے ہوں“۔ معلوم ہوا کہ ان وجوہ سے آپ نے اس مبارک مہینوں میں بکثرت روزوں کا اہتمام فرمایا ہے، اسلئے امت کو بھی چاہیے کہ جس قدر ہمت ہو اس کا اہتمام کرے۔

البتہ آپؐ نے نصف شعبان کے بعد روزے رکھنے سے امت کو منع فرمایا ہے،

[1] المنذری فی الترغیب والترھیب

جیسا کہ ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں منقول ہے۔ لیکن شارحینِ حدیث کے نزدیک اس ممانعت کی وجہ مخالفت نہیں ہے، یہ ممانعت دیگر احادیث کی وجہ سے ان لوگوں کے حق میں سمجھی جائے گی جو کمزور اور ضعیف الہمت ہیں، یا اس ممانعت کی مصلحت شفقت علی الامۃ ہے کہ کہیں رمضان کے فرض روزے ان نفل روزوں کی وجہ سے متاثر نہ ہو جائیں، باقی جو شخص اپنی صحت کے لحاظ سے ہمت محسوس کرتا ہو، یا پہلے ہی سے رکھتا آیا ہو، یا ایام بیض وغیرہ کے روزوں کا عادی ہو تو ایسے شخص کو نصف شعبان کے بعد بھی روزہ رکھنے کی اجازت ہوگی، کیونکہ آپ ﷺ کی ممانعت عام نہیں ہے۔

یہ تو ماہِ شعبان کی فضیلت اور اس میں روزوں کی کثرت سے متعلق گفتگو تھی، رہ گئی اس ماہ کی پندرھویں شب یعنی شبِ برأت کی بات تو اس کے متعلق متعدد احادیث مروی ہیں، جو ترمذی، ابن ماجہ، نسائی وغیرہ میں متعدد صحابہ کرام ؓ سے منقول ہیں، اور ان میں سے اکثر یعنی پندرہ سے زائد روایات علامہ سیوطیؒ نے اپنی تفسیر درمنثور میں سورۂ دخان کی آیت ''اِنَّـآ اَنۡـزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ'' کے تحت جمع کر دی ہیں، جن میں مرفوع روایات بھی ہیں اور موقوف بھی! ان سب سے شبِ برأت کی عظمت وفضیلت واضح ہوتی ہے اور کچھ مسنون اعمال کا بھی پتہ چلتا ہے، مگر اسنادی اعتبار سے ان میں کوئی روایت کلام سے خالی نہیں ہے، یعنی سنداً ضعیف ہیں، اسکے باوجود اصولی اعتبار سے وہ روایات بچند وجوہ قابلِ قبول ہیں۔

۱۔ ان روایات سے کوئی حکم یا حلال وحرام کا مسئلہ وابستہ نہیں ہے، بلکہ وہ سب فضائل کی مثبت ہیں، اور فضائل کے باب میں اس قدر اسنادی ضعف کا تحمل کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ یہ روایتیں متعدد طرق سے مروی ہیں اور ایسی صورت میں (یعنی تعدد

طرق کی صورت میں محدثین کے نزدیک ضعیف ) روایت کوتقویت حاصل ہو جاتی ہے۔اسطرح ان سے ثابت شدہ مسئلہ بحیثیت مجموعی بے بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۳۔ان روایات کو ہر زمانہ میں تائید بالعمل حاصل رہی ہے اور جو روایتیں مؤید بالتعامل ہوں اصول یہ ہے کہ انہیں قبول کیا جاتا ہے اور بے اصل نہیں سمجھا جاتا۔

اسی وجہ سے امت کے اسلاف واخلاف صالحین نے شبِ برأت کی فضیلت کو تسلیم کیا ہے اور اس میں اعمالِ مسنونہ کا اہتمام بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ فقیہ اعظم مفتی محمد شفیع صاحبؒ اپنے رسالہ "شب برأت" میں فرماتے ہیں کہ: صحابہؓ وتابعینؒ سے اس رات میں جاگنا اور اعمالِ مسنونہ میں لگنا قابلِ اعتماد روایات سے ثابت ہے۔[1]

درسِ ترمذی کے مرتب ومحشی فرماتے ہیں سلف صالحین اس رات کی تعظیم کرتے اور پہلے سے تیاریاں کرتے تھے۔[2]

اس کے برخلاف ہمارے زمانہ کے منکرینِ حدیث جو ہر مرتبہ کسی رنگ کسی نام سے مختلف روپوں میں ظاہر ہو رہے ہیں وہ سادہ لوح مسلمانوں کی کم علمی ودینی بے مائیگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس قسم کا لٹریچر عام کر رہے ہیں جو کبھی اس شب کے فضائل کو بے اصل قرار دیتے ہیں، کبھی شب برأت کا بالکل بے اصل ہونا، کبھی عذاب قبر کا بے اثر ہونا، کبھی ایصالِ ثواب کا بیکار ہونا، وغیرہ عنوانات پر خواہ مخواہ لفظی بحث وتکرار کے ذریعہ انکار کی سعیٔ لاحاصل میں لگے ہوئے ہیں، ادھر آج کل اہلِ حدیث سلفی کہلانے والے طبقہ کے جدید محققین نے بھی اسی قسم کی روش اختیار کر لی ہے، اور علمی مباحث کو علماء تک محدود رکھنے کے بجائے عوامی مباحث بنا کر علم وعلماء کا وقار مجروح اور اعمالِ صالحہ کا راستہ مسدود کر دیا ہے، جبکہ خود اس جماعت کے بزرگوں اور پچھلے لوگوں کا یہ حال نہ تھا، اور ایک طبقہ خود ہم اہلسنت میں بھی ایسا

[1] شب برأت ص:۸، [2] حاشیہ درس ترمذی:۲۴۸

ہے جو مرعوب ذہنیت رکھتا ہے، اسی وجہ سے جن کو دیکھا کہ ذرا ڈٹ کر بولتا ہے اور کچھ بڑی کتابوں اور بڑے عالموں کا نام لیتا ہے سمجھ جاتے ہیں کہ یہی علاّمہ وقت ہے، اور دین کی فہم اس پر منتہی ہوگئی ہے، حالانکہ آدمی کی جہالت وضلالت کی ابتداء ہی وہاں سے ہوتی ہے جہاں وہ سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین کے علم وتحقیق اور دیانت وتقویٰ سے صرفِ نظر کر کے ہر معاملہ میں اپنی عقلِ نارسا اور فہمِ ناقص کی اُپج پر نام نہاد تحقیق کی تعمیر کھڑی کرنے لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں دین کی صحیح فہم عطا فرمائے، اور اخلاقی امور میں سلفِ صالحین کی روش پر قائم رکھے، خودرائی اور خودنمائی کے مذموم مرض سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

# ماہِ شعبان اور شب برأت

شعبان المعظم کا مہینہ بہت بابرکت مہینہ ہے، اسکی فضیلت کے لئے یہی کیا کم ہے کہ وہ رجب اور رمضان جیسے عظیم مہینوں کے درمیان واقع ہوتا ہے، اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اس میں برکت کی دعا بھی فرمائی ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ رجب کے مہینہ کا چاند دیکھ کر حضور علیہ الصلوۃ والسلام یہ دعا فرماتے تھے "**اللّٰھم بارک لی فی رجب و شعبا ن وبلغنا رمضان**" اے اللہ ہمارے لئے رجب وشعبان کو مبارک بنا اور ہمیں رمضان تک پہونچا، علماء نے اس روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رجب ہی سے رمضان المبارک کا انتظار واشتیاق شروع ہو جاتا تھا، اور جب شعبان کا مہینہ شروع ہوتا تو اس انتظار واشتیاق میں مزید اضافہ ہو جاتا، اور آپ اس ماہ میں روزوں کی کثرت فرماتے تھے، چنانچہ امام ترمذیؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| **ما رایت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی شھرا کثر صیاما من شعبان کان یصوم الا قلیلا بل یصوم کلہ**[1] | میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی ماہ میں اسقدر روزے رکھتے نہیں دیکھا جتنا کہ شعبان میں، آپ اس میں اکثر روزہ رکھتے تھے بلکہ پورا مہینہ ہی رکھتے تھے۔ |

اس آخری جملہ کا مطلب بھی یہ ہے کہ اس ماہ میں بکثرت روزے رکھتے تھے

[1] ترمذی: ۱/۹۲،

اور شعبان المعظم میں روزوں کی کثرت کیوں فرمائی جاتی تھی؟ اسکا پتہ بھی بعض روایتوں سے چلتا ہے کہ اس کا سبب اس مہینہ کی بعض خصوصیات ہیں، جیسا کہ امام نسائیؒ نے حضرت اسامہ ابن زیدؓ سے روایت کیا ہے۔

قلت یا رسول الله لم ارى تصوم شهرا من الشهور ما تصوم من شعبان .قال ذاك شهر يغفل الناس عنه بين رجب ورمضان وهو شهر ترفع الاعمال الى رب العالمين فاحب ان يرفع عملى و انا صائم.[1]

میں نے عرض کیا یارسولؐ اللہ! میں کسی مہینہ میں آپ کو اسقدر روزہ رکھتے ہوئے نہیں دیکھتا جتنا کہ شعبان میں دیکھتا ہوں، اسکی وجہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا رجب اور رمضان کے درمیان یہ ایک ایسا مبارک مہینہ ہے جس میں بندوں کے اعمال آسمانوں پر اٹھائے جاتے ہیں اگرچہ کہ لوگ اس ماہ کی عظمت ورفعت سے غافل ہیں۔ میرا جی چاہتا ہیکہ میرے عمل حالت روزہ میں اللہ کے حضور پیش ہوں۔

حدیث مذکور سے دو باتیں صراحۃً معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ ماہ شعبان بہت فضیلت ومرتبت کا مہینہ ہے، دوسرے یہ کہ فضل و برکت والے اوقات سے استفادہ کی صحیح ومسنون صورت یہ ہے کہ ان میں اعمالِ صالحہ کا اہتمام کیا جائے۔ ہم لوگ ایسے موقعوں پر جلسے جلوس منا کے اور چند من گھڑت رسومات کی تکمیل کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں جبکہ نبی ﷺ ایسی قیمتی گھڑیوں کو عبادت سے معمور رکھنے کو پسند فرماتے تھے۔

---

[1] نسائی شریف: ۲۲۱۱،

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا؟

بہر حال! مختصر یہ کہ اس ماہ مبارک کی بڑی فضیلت ہے، اگر ان روایات کو چھوڑ بھی دیا جائے جن کی صحت میں محدثین کو کلام ہے تو بھی مذکورہ بالا مستحسن روایات فضلیت کے ثبوت کے لئے بہت کافی ہیں، اس سلسہ میں یہ بات مدنظر رہنا چاہیئے کہ جس طرح کسی معاملہ میں غلو مبالغہ اچھی چیز نہیں اسی طرح بلا وجہ تفریط وتغلیط بھی مناسب نہیں۔

روایات بالا سے شعبان المعظم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بکثرت روزے رکھنا ثابت ہوا، اور بعض روایات میں پورے ماہ شعبان کے روزوں کا ذکر آیا ہے۔ لیکن اپنی امت کو آپؐ نے ایسا کرنے سے منع فرماتے ہوئے انہیں اس کا پابند کیا ہے کہ

اذابقی نصف من شعبان فلاتصوموا[۱]	جب شعبان کا نصف ماہ گذر جائے تو پھر روزے مت رکھو

شراح حدیث نے اس ممانعت کی وجہ یہی سمجھی ہیکہ اس میں امت کی سہولت کی رعایت فرمائی گئی ہے کہ کہیں یہ نفل روزے رمضان المبارک کے فرض روزوں میں ضعف وسستی کا باعث نہ ہو جائیں، قطعی طور پر ممنوع وناجائز قرار دینا مقصد نہیں ہے۔ واللہ اعلم

اس کے علاوہ اس ماہ میں لیلتہ البراءۃ بھی رکھی گئی ہے، یہ نام پندرھویں شعبان کی شب کے بارے میں منقول روایات سے لیکر معروف ہوگیا ہے۔ امام ترمذیؒ نے ''**باب ماجاء فی لیلة النصف من شعبان**'' قائم کر کے اسکے تحت صدیقہ عائشہؓ سے ایک مفصل روایت نقل کی ہے، اسکے اخر میں ہے:

---

[۱] ترمذی: ۱/۹۲،

**فقال ان اللّٰہ تبارک وتعالی ینزل لیلۃ النصف من شعبان الی سماء الدنیا فیغفر لاکثر من عدد شعر غنم کلب** [۱]

فرمایا (آپؐ نے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات میں آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے اور قبیلہ بنوکلب کی بکریوں کے بالوں سے بھی زیادہ لوگوں کی مغفرت وبخشش کا فیصلہ فرماتا ہے

امام مسلم نے اس روایت کو اور بھی تفصیل کیساتھ ذکر کیا ہے (۱/۴۱۱)

اسی طرح مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ امام احمدؒ اور ابن ماجہؒ حضرت ابوموسی اشعریؓ سے مروی ہے۔

**قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ تعالی لیطلع فی لیلۃ النصف من شعبان فیغفر لجمیع خلقہ الا لمشرک وشاحن (وفی روایۃ احمد) الا لشاحن وقاتل نفس** [۲]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات میں بندوں کی جانب توجہ خاص فرماتا ہے، پس مشرک اور کینہ ور کے علاوہ سب کی مغفرت فرمادیتا ہے۔ اور امام احمد والی روایت میں کینہ ور اور قاتل کو مستثنیٰ کیا ہے۔

صاحبِ مشکوٰۃ ہی نے ابن ماجہؒ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کی یہ روایت نقل کی ہے۔

---

۱؎ ترمذی: ۱/۹۲، ۲؎ مشکوٰۃ: ۱۱۵،

قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اذا کانت لیلة النصف من شعبان فقوموا لیلها وصوموا یومها فان اللّٰه تعالی ینزل فیها لغروب الشمس الی سماء الدنیا فیقول الا من مستغفر فاغفر له الا من مسترزق فارزق له الا مبتلا فاعافیه الا کذا الا کذا حتی یطلع الفجر[1]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا شعبان کی پندرھویں رات کو عبادت کرو اور دن کو روزہ رکھو۔ کیونکہ اللہ تعالی (اس رات) آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ اور اعلان کرتا ہے کہ ہے کوئی مغفرت طلب کرنے والا کہ میں اسکو بخش دوں، ہے کوئی رزق کا طالب کہ میں اسکو روزی عطا کروں، ہے کوئی مصیبت زدہ کہ میں اسکو عافیت نصیب کروں، ہے کوئی..... .....ہے کوئی.......... یہاں تک کہ طلوع صبح ہو جائے۔

شب براءۃ کے بارے میں یہ اور اس قسم کی متعدد حدیثیں کتب حدیث میں منقول ہیں، لیکن سند کے اعتبار سے ان سب میں ضعف پایا جاتا ہے، مگر اس ضعف کے باوجود اہل علم کے نزدیک اس رات کی فضیلت ثابت ہے، اور اس میں بیداری وعبادت گذاری کا اہتمام سلفِ صالحین کے ہاں معمول بہا ہے، اسکے دلائل و براہین کتب حدیث میں اپنی جگہ موجود ہیں، اہل علم ضرورت محسوس کریں تو ماخذ کی طرف رجوع فرماویں۔

اور جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو اس شب کو اور اس کے فضائل کو بدعت سیئہ، گمراہی، جہالت اور شب تبرا سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے روافض کی گھڑی ہوئی کہانیاں قرار دیتے ہیں تو جواب میں عصر حاضر کے عظیم محدث حضرت مولانا

[1] مشکوٰۃ: ۱۱۵،

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی یہ عبارت نقل کردینا بہت کافی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

روایات کے ضعف کے باوجود شب براءت میں اہتمام عبادت ثابت ہے، بدعت نہیں ہے، اول تو اس لئے کہ روایات کا تعدد اوران کا مجموعہ اس پر دال ہے کہ لیلۃ البراءۃ کی فضیلت بے اصل نہیں، دوسرے امت کا تعامل لیلۃ البراءۃ میں بیداری اور عبادت کا خاص اہتمام کرنے کا رہا ہے، اور یہ بات (دلائل سے ثابت کی جا چکی ہے) کہ جو بھی ضعیف روایت مئوید بالتعامل ہو وہ مقبول ہوتی ہے، لہذا لیلۃ البراءۃ کی فضیلت ثابت ہے اور ہمارے زمانہ کے بعض ظاہر پرست لوگوں نے احادیث کے محض اسنادی ضعف کو دیکھ کر لیلۃ البراءۃ کی فضیلت کو بے اثر قرار دینے کی جو کوشش کی ہے وہ درست نہیں ہے۔[1]

رہ گئے وہ امور جن کو عوام بلا دلیلِ شرعی شہرت حاصل ہوگئی ہے، اور وہ بڑے اہتمام والتزام سے انہیں بجالاتے ہیں، تو ان کی شرع میں کوئی اصل نہیں ہے، وہ بہرحال بدعات ہیں، بعض ان میں سے سخت ترین منکر ہیں ان کی اصلاح ودرستی لازم ہے، مثلاً بعض علاقوں میں آتش بازی یعنی پٹاخے چھوڑنے کا رواج ہے۔ یہ خالص ہندوانہ رسم اور مجوسیوں سے مشابہت کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے قطعاً ناجائز وحرام ہے۔ اسی طرح ہمارے علاقے میں شب براءۃ کو مردوں کی عید یا بڑے لوگوں کی عید کہا جاتا ہے، اور مخصوص کھانے پکوا کر مردوں کی فاتحہ دلوائی جاتی ہے، یہ بھی محض خیال اور بعد کی پیداوار ہے، اس سے احتراز لازم ہے، قبرستان جانا، وہاں چراغاں کرنا یا اس رات میں قبرستان جانے کو ضروری سمجھنا یہ بھی صحیح نہیں ہے، البتہ چونکہ حضور علیہ السلام کا ایک مرتبہ بقیع میں تشریف لیجانا احادیث میں مروی ہے، اسلئے بلا کسی اہتمام کے انفراداً چلے جانے میں کوئی حرج نہیں، پھر چونکہ

[1] درس ترمذی: ۲/ ۵۸،

حضور ﷺ کا ہر سال جانا ثابت نہیں اسلئے اسکی ہر سال پابندی کرنا بھی صحیح نہیں ہے، کبھی چلا جائے کبھی ناغہ کردے۔ اور بھی رسمیں عوام الناس میں رائج ہیں وہ سب بے اصل اور من گھڑت ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ ثواب سمجھ کر کرنے والا گناہگار ہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ خصوصا نوجوان تھوڑی دیر مسجدوں میں وعظ ونصیحت سنکر سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور گپ شپ، ہوٹل بازی، چوراہوں سڑکوں پر دل لگی ٹھٹا کرتے رہتے ہیں، یہ بھی بڑی ناقدری وبے دینی کی بات ہے، ایسے قیمتی مواقع کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے، حتی المقدور اطاعت وعبادت توبہ واستغفار کیا جائے، نہ کہ سیر سپاٹہ! ایسے لوگ بڑے محروم ہیں جن کو ہر کسی موقع پر بس بے کار بلکہ لغو ولایعنی کی سوجھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو صحیح فکر اور صحیح عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

# تزکیۂ نفس وترقیٔ باطن کا موسم بہار
## یعنی رمضان المبارک

کتب حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خطبہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہے۔ جو آپ نے شعبان کے آخری دنوں یا آخر تاریخ کو مجمع صحابہؓ میں دیا تھا۔ آپ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

"لوگو! ایک زبردست اور بابرکت مہینہ تم پر سایہ فگن ہے، ایسا مہینہ جس میں ایک رات ہے جو ایک ہزار مہینوں سے بہتر اور بڑھ کر ہے۔ اللہ پاک نے اس مبارک مہینہ کے دنوں میں اپنے بندوں پر روزہ فرض کیا ہے اور راتوں میں قیام یعنی تراویح کو نفل اور زائد عمل قرار دیا ہے۔ اور اس ماہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اگر کوئی کار خیر کرے تو اسکو اتنا ثواب ملتا ہے جتنا دوسرے دنوں میں فرض کام کرنے پر ملتا ہے، اور فرض کا ثواب دوسرے دنوں کے ستر فرضوں کے برابر ملتا ہے، اور یہ صبر کا مہینہ ہے، اور صبر کا ثواب جنت ہے، اور یہ مہینہ غمخواری کا ہے، اور یہ ایسا مہینہ ہے جس میں مومن کا رزق منجانب اللہ بڑھا دیا جاتا ہے، مزید یہ کہ اگر کسی شخص نے کسی روزہ دار کو افطار کرادیا تو اس کو اس روزہ دار کے ثواب میں کمی کئے بغیر اس کے روزہ کا ثواب بھی دیا جاتا ہے، اور یہ عمل افطار کرانے والے کی مغفرت ذنوب کا سبب بنجاتا ہے، اس پر صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! ﷺ ہم میں سے ہر شخص اس کی استطاعت نہیں رکھتا کہ روزہ دار کو کھانا کھلادے، آپ ﷺ نے فرمایا: جس اجر کی میں خبر دے رہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ دودھ کے ایک گھونٹ لسی، یا

ایک کھجور بلکہ پانی کے ایک گھونٹ پر بھی عطا فرمادینگے۔اسکے لئے کوئی بڑے اہتمام اور خاص مصارف کی بھی حاجت نہیں ،البتہ جس نے کسی روزہ دار کو خوب سیر کے کھلایا تو اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض سے پانی پلادینگے،جس کے بعد جنت میں داخلہ تک پھراس کو پیاس نہیں ستائیگی ، یہ ایسا مہینہ ہے جس کا ابتدائی حصہ رحمت درمیانی مغفرت اور آخری حصہ جہنم سے گلوخلاصی کا ہے،جس شخص نے اس ماہ میں اپنے خادموں کا بوجھ ہلکا کردیا اللہ پاک اس کی مغفرت اور جہنم سے نجات کا فیصلہ فرمادیتے ہیں۔[1]

رمضان شریف کی آمد پر نبی رحمت صلی اللہ وسلم کے مذکورہ خطبہ سے چند اہم خصوصیات اس موسم بہار کی واضح ہوتی ہیں۔(۱)اس مہینہ کا عظیم اور بابرکت ہونا۔(۲)اس میں ایسی رات کا پایا جانا جو شب قدر کہلاتی ہےاور جو ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے۔(۳)روزوں کا اس میں فرض کیا جانا ۔(۴)اسکی راتوں میں ایک زائد خصوصی نماز یعنی تراویح کا دیا جانا۔(۵)نفل کاموں کے اجر کو فرض کے اجر تک اور فرضوں کے اجر کو ستر فرضوں کے اجر تک بڑھایا جانا۔(۶)ایسے اعمال دیے جانا جن میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے اس صبر کے ذریعہ جنت کا موعود ہونا۔(۷)اس میں ایک دوسرے خصوصاً غرباء وفقراء کی ہمدردی وغمخواری کے جذبہ کا عام کیا جانا۔(۸)مسلمانوں کی روزی کا بڑھایا جانا۔(۹)دوسرے روزے داروں کوافطار کرانے پر ان کے ثوابوں میں کمی کئے بغیر افطار کرانے والے کو بھی اتنا ثواب دیا جانا۔(۱۰)اسکے ابتدائی ،درمیانی اور آخری حصوں کو علی الترتیب باعثِ رحمت ، باعث مغفرت اور جہنم سے نجات کا وسیلہ قرار دیا جانا۔(۱۱)اپنے خادموں اور چاکروں کے کاموں اور ذمہ داریوں میں تخفیف یعنی کمی کرنے پر مغفرت کا وعدہ فرمانا وغیرہ۔ یہ صرف وہ فضائل وخصائص ہیں جو ایک حدیث کی روشنی میں ہمارے سامنے

[1] البیہقی کذا فی مشکوۃ:۱۷۳/۴۷۳،

آرہے ہیں، ان کے علاوہ بیسیوں اور حدیثیں فضائل رمضان اوراس کی خصائص کے بیان پر مشتمل موجود ومشہور ہیں۔ان سب کوسامنے رکھنےاوران میں غورکرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ پاک نے اس ماہ کوترقی باطن وتزکیہ نفس کا موسم بہار بنادیا ہے،خودقرآن مجید میں روزہ کاحکم دینے کے بعداس کی علت ''**لعلکم تتقون**'' بیان فرمائی گئی ہے۔

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اورصحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بہت پہلے سے رمضان کی تیاری فرماتے تھے،اور جب یہ موسم بہارشروع ہوجاتا تو پوری یکسوئی وتوجہ کے ساتھ اسکے برکات وثمرات کوحاصل کرنے میں منہمک ومشغول ہو جاتے تھے،خصوصاً عشرہ اخیرہ میں تو بالکلیہ مسجد کے ہورہتے اور بقول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کمرکس لیتے ،راتوں کوعبادت سے معمور رکھتے اورگھر والوں کوبھی جگاتے اوراس میں لگاتے تھے۔

بعد کے ادوار میں بھی عاشقان سنت وحاملان شریعت اسی طرح اس مبارک مہینہ کاحق اداکرنیکی کوشش کرتے رہے،اہل اللہ اوراکابر کے حالات ان واقعات سے بھرپور ہیں جوان کے اشغال واعمال رمضان سے تعلق رکھتے ہیں،اندازہ کے لئے حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ کارسالہ''اکابرکارمضان'' دیکھ لینا کافی ہے۔

ہمیں اللہ پاک معاف فرماویں کہ ان کےاحوال کو پڑھنے کے بعد جب اپنے حالات پرنظر پڑتی ہےتو''**فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ**'' کا نقشہ نظرآتا ہے،یعنی اللہ پاک نے انبیاءوصلحاءسابقین کےذکرکے بعد جوفرمایا،پھر''ان کے بعدایسے ناخلف وجود میں آئے جونمازوں کوضائع کردیتے اورشہوات وخواہشات کی پیروی کرتے تھے'' یہی حال بعینہ ہمارانظرآرہاہے۔

رمضان المبارک کےشروع ہوتے ہی ہم میں سے اکثر لوگ چند دن بڑا

جوش وخروش دکھا کر پہلے ہفتہ ہی میں حسب حال بحال ہو جاتے ہیں اور اپنی غافلانہ روش اختیار کر جاتے ہیں، اگر کچھ سرگرمیاں نظر آ بھی جاتی ہیں تو بس فیشن اور نقالی کی۔ مثلاً رسمی شبینے، رسمی جلسے، یوم الفرقان، یوم القرآن وغیرہ اور افطار پارٹیاں، جن میں نمازوں کا ضیاع، خواہشات کا اتباع، اور دین کا مذاق غالب رہتا ہے، کیونکہ ان میں حصہ لینے والے بیشتر وہ لوگ ہوتے ہیں جو ذوق عبادت سے یکسر محروم اور مزاج نبوت سے قطعاً نا آشنا ہوتے ہیں، نئی نسل تو شامت اعمال سے بس انہی حرکات کو برکات رمضان کے حصول کا وسیلہ تصور کی ہوئی ہے، افسوس! ”أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوْءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَناً“۔ کیا وہ شخص حق پر ہوسکتا ہے جسکے لئے اسکے اعمال بدخوشنما بنا دیے گئے ہوں اور وہ انہیں بظاہر اچھا سمجھتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ”زُيِّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ“ شیطان نے ان کے اعمال ان کے لئے مزین کردیے اس طرح انہیں راہ حق سے روک دیا۔

الغرض ان تلخ حقائق کا برا مانے بغیر اپنے طرز عمل کا غور و دیانت سے جائزہ لیجئے اور سوچئے کہ کیا نبی کریم ﷺ صحابہ کرامؓ اور اولیاء امت کی قدر دانئ رمضان اور ہمارے زمانہ کی ان حرکات و اعمال میں کسی قسم کی کوئی مناسبت ہے؟ اگر نہیں اور بلاشبہ نہیں تو پھر خدا کے واسطے خوش فہمیوں کے اس خول سے باہر نکل آیئے اور صحیح معنوں میں مسنون طرز پر رمضان المبارک کو وصول کرنے اور اسکی برکات کے مستحق بننے کے مزاج کو عام کیجئے۔ منکرات رمضان سے اپنے کو جدا اور علی الاعلان علاحدہ کر لیجئے، تاکہ اس موسم بہار کا خصوصی تحفہ ”ترقی باطن اور تزکیہ نفس“ ہمیں حاصل ہو سکے اور ہم عنداللہ ”روزہ دار“ شمار ہوں ”بھوکے پیاسے“ شمار نہ ہوں۔

اللہ ہمیں توفیق عطا فرماویں۔ آمین

# معجزہ معراج مبارک

<u>اسراء و معراج کی تعریف</u>

"اسراء" لغت میں رات کے وقت سیر کرانے کو، اور معراج سیڑھی کو کہتے ہیں[1]

<u>وجہ تسمیہ</u>

چونکہ اس عظیم المرتبت واقعہ کے ضمن میں سورہ بنی اسرائیل میں "اسرىٰ بعبده" اور احادیثِ شریفہ میں "ثم عرج بی" کے الفاظ منقول ہیں، اسی مناسبت سے اس مبارک واقعہ کے نام "اسراء اور معراج" ہوئے، جو پورے واقعہ پر مترادفاً بھی استعمال کئے جاتے ہیں اور اس فرق کے ساتھ بھی مستعمل ہیں کہ اسراء مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر کا نام ہے اور معراج اس سے آگے کے سفر کو کہتے ہیں۔[2]

<u>معراج کی تاریخ</u>

اس واقعہ کا وقوع کس وقت ہوا؟ اس کے جواب میں اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ سال کے بارے میں علماء تاریخ کے دس اقوال ہیں جو سن پانچ نبوت سے لیکر ہجرت سے چھ ماہ قبل تک پر مشتمل ہیں، البتہ محقق علماء نے متعدد روایات کو سامنے رکھ کر ان کی ترتیب و تطبیق سے سن گیارہ نبوت کو راجح ترین قرار دیا ہے۔[3]

پھر مہینے میں بھی اختلاف ہے۔ ربیع الاول، ربیع الآخر، رجب، رمضان اور شوال۔ ان مہینوں کے نام اس سلسلہ میں ملتے ہیں۔ تاریخ بھی اختلافی ہے، اس لئے مہینہ اور تاریخ کی قطعیت بہت مشکل ہے۔ البتہ بعض جلیل القدر محدثین نے رجب کی ستائیسویں کو راجح قرار دیا ہے۔[4] اور یہی مشہور بین العوام بھی ہے۔

---

[1] المعجم الوسیط: ۴۲۸، ۵۹۲ [2] سیرت المصطفیٰ: ۱/ ۲۸۹، [3] ایضاً: ۱/ ۲۸۸، [4] قصص القرآن: ۴/ ۳۳۴

**متعلقہ آیات واحادیث**

درج ذیل آیات کو اہل تفسیر نے واقعہ معراج سے متعلق قرار دیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر (۱) اور نمبر (۶۰)، سورۂ نجم کی آیات نمبر (۱۳) تا (۱۸) البتہ سورۂ بنی اسرائیل میں مسجد حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کے سفر ہی کا ذکر ہے، اور اس سے آگے کا ذکر سورۃ النجم کی آیات میں ہوا ہے۔ پھر ان میں بھی حسبِ معمول صرف اشارات ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ واقعات وقصص کے ذکر میں قدر ضرورت پر کفایت کی جاتی ہے۔ اور بقیہ حصہ کو یا حذف کر دیا جاتا ہے یا پھر کسی مناسبت سے کسی دوسرے مقام پر اسکا ذکر کیا جاتا ہے (جیسے حضرت موسیٰؑ اوران کی قوم کا ذکر ہے کہ اللہ پاک نے قرآن مجید کی ۳۷ سورتوں کی ۵۱۴ آیات میں متفرق طور پر ان کا ذکر فرمایا ہے۔[۱]

اور باقی تفصیلات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ امت تک پہونچتی ہیں اسلئے کہ نبیؐ کا منصبی فریضہ یہ ہے کہ وہ آیاتِ قرآنیہ کے مبہم مقامات کی توضیح اور مجمل عبارات کی تفصیل اور متشابہ آیات کی تعیین مراد کرے۔ ارشاد باری ہے "اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ"[۲] چنانچہ اس واقعہ کی تفصیل کے سلسلہ میں بھی اصحابِ صحاح ودیگر محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں ——انصار ومہاجرین پھر مرد وخواتین سب ہی سے—— متعدد احادیث روایت کی ہیں جن کی تعداد بعض حضرات نے پینتالیس تک شمار کی ہے، جن میں سند کے اعتبار سے صحاح بھی اور ضعاف بھی۔

**ثبوت پر اجماع**

یہ حدیثیں حد تواتر کو پہنچ چکی ہے، اور مسلمانوں کا اس واقعہ کے ثبوت پر اجماع ہو چکا ہے۔ حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور معتبر تفسیر "تفسیر القرآن العظیم"

[۱] قصص القرآن: ۴/۳۳۴ [۲] سورۃ النحل: ۴۴،

میں تقریباً سب ہی روایات کا احصاء کرنے کے بعد آخر میں فرمایا ہے" **فاجمع علیہ المسلمون وانکر الزنادقة والملحدون یریدون لیطفئوا نور اللّٰہ بافواھھم واللّٰہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون** "یعنی تمام مسلمان اس واقعہ کی صحت وثبوت پر متفق ہیں لیکن بے دین وزندیق لوگ اس کے وقوع کا انکار کرتے ہیں، شاید وہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھادیں۔مگر اللہ تعالی کا اعلان ہے کہ اپنے نور کو پورا کرنیوالا ہے خواہ منکرین کو نا گوار ہی لگے۔[1]

واقعہ کی مختصر سرگذشت

واقعہ معراج حدیث وسیرت کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ نیز علماء کرام نے مختلف زبانوں میں اس عنوان پر بہت کچھ لکھدیا ہے۔ جو چھپ بھی چکے ہیں۔ ویسے جلسوں میں علماء وائمہ سے بھی آپ حضرات سماعت فرماتے رہتے ہیں، اسلئے یہاں ہم بہت ہی اختصار سے اس کا ذکر کرتے ہیں، تا کہ استحضار ہوجائے، اس کی تفصیل متعلقہ کتب میں ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

ایک رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حرم شریف میں حضرت ام ہانیؓ کے گھر آرام فرما رہے تھے، اسی اثناء میں دو فرشتے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو وہاں سے اٹھا کر حطیم میں لے آئے، اور آپ کے مبارک سینہ کو شق کر کے جنت سے لائے ہوئے زریں تشت میں آبِ زمزم سے اس کو دھویا، اس کے بعد اس میں حکمت ودیعت کر کے اسے اپنی جگہ پر رکھ دیا اور سینہ مبارک کو درست کر دیا، اس کے بعد جنت سے ایک سواری براق نامی لائی گئی، آپ اس پر تشریف فرما ہوئے، اور جبرئیل امین کی قیادت میں آپ کا یہ مبارک سفر شروع ہوگیا۔ راستہ میں چند مقامات پر جبرئیل کی ایماء پر توقف فرمایا اور دوگانے ادا فرمائے، ہوتے ہواتے بیت المقدس رسائی ہوئی، آپ مسجد اقصیٰ میں تشریف لے گئے، جہاں انبیاء علیھم

[1] تفسیر ابن کثیر: ۳/۲۵

السلام آپ کے انتظار میں جمع تھے، آپ کے پہونچنے کے بعد اذان واقامت کہی گئی، جماعت کھڑی ہوئی اور آپ نے تمام انبیاء علیھم السلام کی امامت فرمائی، نماز کے ختم پر آپ کا تعارف کرایا گیا، پھر بڑے بڑے نبیوں نے حمد باری پر مشتمل مختصر تقریریں کیں، آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحمیدی خطبہ دیا، جس میں اپنی امت کی بھی تعریف فرمائی، اس کے بعد خدمت والا میں شراب، شہد اور دودھ پیش کیا، آپ نے ان میں سے دودھ کو پسند فرما کر لے لیا اور نوش فرمالیا، اس کے بعد ایک خاص قسم کی سیڑھی لائی گئی جس کے ذریعہ آپ آسمانِ دنیا پر تشریف لے گئے، وہاں سے ساتوں آسمانوں پر تشریف لے گئے، ہر آسمان پر کسی ایک نبی سے ملاقات ہوئی۔ اس دوران بیت المعمور کا معائنہ فرمایا، سدرۃ المنتھی پر پہنچے، جبرئیل کو اپنی ہیئت اصلی میں دیکھا، پھر سدرہ پر جبرئیل امین رک گئے، آپ تنہاء ہی قربِ الٰہی کے اگلے مراحل پر روانہ ہوگئے، ایک میدان ہو سے گذر ہوا، جہاں آپ نے اقلام تقدیر کے چلنے کی آوازیں سنیں، بالآخر حق تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر شرف مکالمہ حاصل فرمایا۔

حق تعالیٰ نے اس موقعہ پر تین خاص نعمتیں آپ کو عطا فرمائیں جن میں سے ایک نماز بھی ہے، جو اولاً پچاس تھیں، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایماء پر آپ ﷺ کے باربار درخواست فرمانے سے پینتالیس کم کر کے پانچ کردی گئیں، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان پانچ نمازوں کی ادائیگی پر اجر پچاس ہی کا ملے گا، یہ اس کی شانِ رحمانیت ہے کہ اپنے بندوں کے عجز وکمزوری کے مدنظر عمل کی تعداد میں کمی کردی لیکن اجر کی مقدار میں کوئی کمی نہ کی، سبحان اللہ وبحمدہٖ۔ واپسی میں آپ بیت المقدس ہوتے ہوئے مسجدِ حرام پہنچ گئے، اس پورے سفر مبارک میں رات کا ایک مختصر حصہ صرف ہوا۔ صبح کو آپ نے قوم کے سامنے واقعہ پیش فرمایا۔ اشقیاء نے تمسخر واستہزاء

کیا۔ سعادتمندوں نے بسر وچشم تسلیم وتصدیق کر کے اپنی سعادت میں اضافہ کیا۔[۱]

سفرِ جسمانی تھا یا صرف منامی وروحانی؟

معراج کے سلسلہ میں یہ بحث شروع ہی سے چل رہی ہے کہ آیا اس موقعہ پر آپؐ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ حالتِ بیداری میں بہ نفسِ نفیس پیش آیا یا خواب میں دکھلایا گیا؟ دو ایک صحابہؓ، چند تابعینؒ وعلماء یہی سمجھتے اور کہتے رہے کہ یہ خواب کا معاملہ ہے۔ لیکن یہ ان حضرات کی غلط فہمی اور خطاءِ اجتہادی ہے، ورنہ جمہور صحابہؓ واہل علم ورائے اس پر متفق ہیں کہ یہ سفر آپ کا حالتِ بیداری میں جسم عنصری کیساتھ پیش آیا تھا، اس میں نقلاً کچھ شبہ ہے نہ عقلاً۔ چنانچہ حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے اس اختلاف کے ذکر کے بعد فرمایا۔ **فالاکثرون من العلماء انه اسری ببدنه وروحه یقظة لامناماً**[۲]

اس سفر کے خواب نہ ہونے بلکہ بحالتِ بیداری ہونے کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے جاتے ہیں جو نفس الامر کے سمجھنے اور ماننے کیلئے بہت واضح اور کافی ہیں۔

۱۔ سورہ بنی اسرائیل میں اس واقعہ کا ذکر اللہ پاک نے اس طرح کیا ہے "**سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا**"[۳] مبارک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو راتوں رات سفر کرایا۔ اس میں غور کرنے سے پتہ چلے گا کہ اللہ پاک نے اس واقعہ کے ذریعہ اپنی شانِ قدرت وکمال کا اظہار فرمایا ہے جو اس پر دلالت کر رہا ہے کہ واقعہ حیرت انگیز ہے۔ معمول کی نوعیت کا نہیں ہے جبکہ خواب ایک معمول کی عمومی کیفیت ہوتی ہے، جس میں تمام بندگانِ خدا مشترک ہوتے ہیں، خصوصیت کچھ نہیں۔

۲۔ اور اسی آیت کے لفظ "**عبد**" سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے کیونکہ عبد کا

۱ سیرۃ المصطفیٰ: ج:۱ بالاختصار ۲ تفسیر ابن کثیر: ۲۳/۳، ۳ سورہ بنی اسرائیل: ۱

اطلاق صرف روح پر ہوتا ہے نہ مجرد جسم پر بلکہ "**العبد**" روح مع الجسد کو کہا جاتا ہے جبکہ خواب کی سیر میں بندہ کا جسم شامل نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ واقعہ معراج کوئی خواب نہیں تھا۔ روح مبارک اور جسد عنصری دونوں کے ساتھ باقاعدہ تشریف لے جانا ہوا تھا، اس لئے "**بِعَبْدِہ**" فرمایا گیا۔

۳۔ سورۃ النجم میں حق تعالیٰ نے آپ کے مشاہداتِ سفر کے ذکر کے بعد فرمایا: **مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطَغیٰ** آپ کی چشم مبارک نے نہ دھوکہ کھایا اور نہ وہ بہکی، اس میں لفظ "بصر" استعمال فرمایا ہے اور اسکے لئے ذات ضروری ہے، کیونکہ بصر ذات کی خصوصیت ہے روح کی نہیں۔

۴۔ احادیثِ صحیحہ سے پتہ چلتا ہے کہ صبح کو جب آپ نے لوگوں کے سامنے اس واقعہ کا ذکر فرمایا تو قریش مکہ نے نہ صرف یہ کہ اس کو مستبعد سمجھا بلکہ اس واقعہ کی تکذیب کی [۱] اور آپ کا مذاق اڑایا اور کہنے لگے کہ قافلے جہاں ایک ایک ماہ میں بمشکل پہنچ پاتے ہیں وہاں آپ رات بھر میں کیسے ہو آئے؟ غور کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے اگر خواب میں دیکھنے کا ذکر فرمایا ہوتا تو تکذیب وتحیر کی کوئی وجہ نہ تھی۔ پس معلوم ہوا کہ آپ نے حالتِ بیداری میں ہی جانے کا ذکر فرمایا تھا۔

۵۔ اسی طرح احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ بعض جدید الاسلام لوگ اس واقعہ کو آپ کی زبانِ مبارک سے سن کر اسلام سے پھر گئے اور مرتد ہو گئے [۲] ظاہر ہے کہ اس کا سبب واقعہ کی حیرت انگیزی اور خام فہموں کے نزدیک ناقابلِ قبول اور ناممکن الوقوع ہونا ہی تھا۔

۶۔ اسی طرح احادیث میں ہے کہ آپ مسجدِ حرام کے پاس براق پر سوار ہو کر مسجدِ اقصیٰ تک تشریف لے گئے اور سواری پر سوار ہونے کی خصوصیت جسم کی ہے کیونکہ جسم ہی اس کا محتاج ہو سکتا ہے، روح اس کی محتاج نہیں، نہ اس کی وہ مزاجی

---

[۱] مشکوٰۃ شریف: ۳/۲۸۷ [۲] البدایہ والنھایۃ: ۲/۱۰۸،

خصوصیت ہے، اسلئے محض روحانیت کی سیر کا دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے۔

۷۔ روایات میں اس واقعے کے آخر میں آپ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ **ثم اصبحت بمکة**[۱] یعنی پھر میں نے صبح مکہ میں آکر کی۔ اگر یہ خواب تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جملہ کی ضرورت کیا تھی؟ جبکہ خواب کے وقت جسم اپنی جگہ پر موجود رہتا ہے، غائب نہیں ہوتا اور الفاظ سے معلوم ہورہا ہے کہ جسمِ مبارک رات بھر غائب تھا، صبح کو واپس مکہ مکرمہ پہنچا۔ الغرض یہ اور روایات کی دوسری تصریحات وتفصیلات اس بات پر دال ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے یہ شرف باقاعدہ جسم عنصری کے ساتھ عطا فرمایا تھا، نہ کہ کشفی ومنامی طور پر۔ ہاں! اس واقعہ کے علاوہ آپ کو منامی وروحانی طور پر متعدد بار ایسے واقعات پیش آئے۔ اس سے کسی محقق عالم کو انکار نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

<u>وہ سواریاں جو دورانِ سیر وعروج استعمال ہوئیں</u>

یوں تو یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کردہ معجزہ اور قدرتِ الٰہی کا ایک کرشمہ ہے۔ اسمیں جہاں اور محیر العقول عجائب وغرائب اللہ پاک نے دکھلائے، وہیں اس کی قدرت باہرہ سے یہ بھی ممکن تھا کہ آپ کو یہ پورا سفر بغیر کسی ذریعہ اور وسیلہ کے دفعۃً واحدۃً کرادیا جاتا، جیسا کہ ملائکہ آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن ایسا نہ ہوا، بلکہ اس کی حکمتِ بالغہ سے متعدد ذرائع استعمال کئے گئے، حق تعالیٰ حکیم ہیں، اور ان کے ہر کام میں بے شمار حکم ومصالح پوشیدہ ہیں، عقلِ انسانی خواہ کہیں پہنچ جائے لیکن حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی حقیقتوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ بہرحال ان کی حکمت کا تقاضہ یہی ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس موقعہ پر اسباب کے ذریعہ بلایا جائے، ویسے اس کی یہ ایک ظاہری اور عام فہم حکمت تو واضح ہی ہے کہ اس اہتمام کے ذریعہ بھی آپ کے مجد وشرف میں اضافہ کیا گیا، کیونکہ کریم ہستیاں اپنے معزز

[۱] قصص القرآن میرٹھی: ۴۷۸

مہمانوں کے اکرام کیلئے مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔

بہرحال! معراج کے سلسلہ میں یہ تو معلوم ہے کہ آپ نے مسجدِ اقصیٰ سے مسجدِ حرام تک براق پر سفر فرمایا، آگے کیلئے کتابوں میں دو چیزوں کا اور ذکر ملتا ہے۔ ایک معراج دوسرے رفرف ذیل میں ہم ان کا تعارف کراتے ہیں

۱۔ براق: یہ ایک جانور ہے گدھے سے بڑا خچر سے چھوٹا، سفید و چمکدار اور نہایت تیز رفتار۔ حدنظر پر ایک قدم رکھتا ہے۔ اس کے بازوؤں پر دو پر ہیں۔ یہ انبیاء کرام علیھم السلام کی سواری ہے۔ آپ سے قبل دوسرے انبیاء بھی اس پر سوار ہوتے رہے ہیں۔[۱]

علماء فرماتے ہیں کہ براق "بریق" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی سفیدی کے ہیں، چونکہ یہ جانور نہایت سفید چمکدار ہے، اسلئے اس کا نام براق رکھا گیا ہے۔ بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ لفظ "بریق" سے نہیں بلکہ "برق" سے مشتق ہے، چونکہ اس کی رفتار اس قدر تیز ہے جیسے بجلی کی رفتار ہوتی ہے، اسی مناسبت سے اس کا نام براق ہے۔ یہ جانور مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک آنے جانے میں آپ کی سواری میں استعمال کیا گیا۔[۲]

۲۔ معراج: بمعنی "سُلّم" یعنی سیڑھی، جب مسجدِ اقصیٰ میں نماز سے فارغ ہو چکے تو آپ کے لئے مسجد کی چھت پر ایک سیڑھی نصب کی گئی جس کے ذریعہ آپ نے آسمانوں کی طرف عروج فرمایا۔ یہ سیڑھی ایک خاص قسم کی تھی جس کی صحیح کیفیت اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس میں متعدد درجات تھے، آج کل ایسی سیڑھی کا تصور مشکل نہیں ہے۔[۳]

صاحبِ روح المعانی نے صراحت کی ہے کہ صحیح یہی ہے کہ بیت المقدس سے آسمانوں پر آپ کا عروج "معراج" کے ذریعہ ہی ہوا ہے۔ اس کے خلاف وہم ہے۔

---

۱؎ بخاری و مسلم کذا فی المشکوٰۃ: ۲۸۳/۳، ۲؎ معراج کی باتیں بلندشہری، ۳؎ البدیہ والنھایۃ: ۱۰۸/۲،

اس سیڑھی کا مسجدِ اقصیٰ سے آسمانِ دنیا تک یا پھر تمام آسمانوں تک جانے کے لئے استعمال ہوا ہے۔[۱]

۳۔رفرف: سورۂ رحمٰن میں یہ لفظ ملائم ریشمی کپڑے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔[۲] لغتہً اس کا اطلاق چاندنیوں، تکیوں اور سبز رنگ کے ملائم ریشم پر ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سدرۃ سے آگے بارگاہِ رب میں شرف باریابی کیلئے اس عالی قسم کے ریشم سے تیار کی گئی کوئی خاص قسم کی مسند ہوگی۔اس پر تشریف فرما ہوکر آپ سدرۃ المنتھیٰ کے اگلے مقامات کے لئے روانہ ہوئے۔

عام طور سے ان ہی تین کا ذکر ملتا ہے۔لیکن صاحبِ روح المعانی نے العلائی کے حوالے سے درج ذیل پانچ سواریوں کا ذکر کیا ہے جو معراج کے دوران مستعمل ہوئیں۔

مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک براق۔مسجدِ اقصیٰ سے سماءِ دنیا تک معراج۔ سماءِ دنیا سے سماءِ سابعہ تک فرشتوں کے پر۔ساتویں آسمان سے سدرہ تک خاص جبرئیل کے پر اور سدرہ سے آگے رفرف۔واللہ تعالیٰ اعلم مستند روایات صرف پہلی دو کا پتہ دیتی ہیں وبس۔[۳]

---

۱ روح المعانی: ۸/۸　۲ معارف القرآن: ج:۸،　۳ روح المعانی: ۹/۸

# رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

حق تعالیٰ شانہ نے اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جن صفات حسنہ اور اخلاقِ عالیہ کا حامل بنا کر بھیجا تھا انمیں ایک اہم اور بنیادی صفت ” رافت ورحمت“ کی تھی ، خود حق تعالیٰ نے آپ ؐ کی تعریف کرتے ہوئے آپ کو ”رؤوف ورحیم“ قرار دیا ہے (حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِیْمٌ ) ایک اور جگہ آپ ؐ کو سراپا رحمت قرار دیتے ہوئے فرمایا (وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ ) ایک مقام پر آپ ؐ کے مزاجِ مبارک میں سختی وسنگ دلی کی نفی کرتے ہوئے فرمایا (لَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَا انْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ ) جبکہ خود اپنے بارے میں بھی اسی صفتِ رحمت کو اسمِ ذاتی کے مماثل قرار دیا ( قُلْ ادْعُوْا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوْاالرَّحْمٰنَ اَیَّمَا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی ) اپنی اس صفت کو ہر چیز سے وسیع قرار دیا (وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْئٍ) حتی کہ اپنی دیگر صفات پر بھی اسے غالب کر دیا (رحمتی سبقت غضبی ) یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت کو اس صفت سے متصف ہونے کی ترغیب دی اور فرمایا کہ رحم دلوں ہی پر خدا تعالیٰ بھی رحم فرماتے ہیں۔ (الراحمون یرحمهم الرحمن ) ایک موقع پر اسے خدا تعالیٰ کا خاص عطیہ قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا (هذه رحمة جعله الله فی قلوب عباده من یشاء ) یہ خبر بھی دی کہ وہی شخص صفت رحم وکرم سے محروم رکھا جاتا ہے جس کے لئے بد قسمتی مقدر ہوتی ہے (لا تنزع الرحمة الا من شقی ) ایک موقعہ پر آپ ؐ نے صحابہ کرامؓ کو بتلایا کہ ایک عورت فاحشہ محض اس لئے بخش دی گئی کہ اس نے پیاسے کتے پر اپنے

جذبۂ ترحم سے ترس کھایا تھا، اور مشقت اٹھا کے اس کو پانی پلانے کا انسانی فریضہ انجام دیا تھا—— اس کے بالمقابل ایک عورت اس وجہ سے دوزخ میں ڈالدی گئی کہ اس نے ایک بے زبان بلی کو باندھ کر رکھدیا تھا، نہ اس کو پیٹ بھر کھلاتی تھی اور نہ خود کھانے کیلئے چھوڑتی تھی—— آپؐ نے ایک شخص کو دیکھا کہ غلام کو بے تحاشہ پیٹ رہا ہے آپ سے دیکھا نہ گیا، یہ فرما کر کہ "تیرا بھی کوئی مالک ہے" تنبیہ فرمائی اور عفو درگذر کی تعلیم دی، عورتیں سواریوں پر سواری کر رہی تھیں، ان کے چلانے والے سے فرمایا کہ آبگینوں کے ساتھ نرمی برتو (رفقا بالقواریر)

یہ اوران جیسی بے شمار تعلیمات کے علاوہ عملی طور پر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اس صفت رحمت کا مجسمہ ہے، اپنے تو اپنے رہے پرایوں کے ساتھ حتیٰ کہ جانوروں کے ساتھ رحم وکرم کی عملی مثالیں آپ نے اس طرح قائم فرمائیں کہ آج "حقوق انسانی" اور "تحفظ بہائم" کے نعرے بلند کرنے والوں کو اس کا علم ہوجائے تو آنکھیں کھل جائیں اور شرم سے پانی پانی ہوجائیں۔

آپؐ کی خواہش وتمنا ہمیشہ یہی رہتی تھی کہ آپؐ کے سب ماننے والے اپنا مزاج اسی طرح کا بنالیں۔ اسکے لئے آپ انہیں مختلف عنوانوں سے ترغیبیں دیتے اور موقعہ بموقعہ ذہن سازی فرماتے تھے، ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے ایک شخص کو جوان کے قتل کے درپئے تھا، مقابلہ میں زیر کر کے اس کو قتل کیلئے تلوار سونت لی، عین ایسے وقت اس نے کلمہ طیبہ پڑھ لیا، انہوں نے قرائن سے یہی سمجھا کہ جان بچانے کیلئے کلمہ کو ڈھال بنارہا ہے اسلئے اس کے باوجود اسے قتل کردیا جب یہ خبر آپؐ کی خدمت مبارکہ میں پہونچی تو آپ کو سخت تکلیف محسوس ہوئی اور ارشاد فرمایا ''هلا شققت قلبه ......'' یعنی تمہیں دل کی کیفیت کی کیا خبر؟ کہ مخلصانہ اسلام قبول کیا یا جان بچانے کیلئے۔ تمہارا کام تو ظاہر حال کو قبول کرلینا تھا، یہ صفت رحمت ہی تو

تھی کہ آپ بار بار اس لفظ کو دھراتے رہے، یہاں تک کہ ان صحابیؓ کے دل میں یہ تمنا ہونے لگی کہ میں آج کے دن سے پہلے مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا، یعنی میری غلطی سے جو صدمہ آپؐ کو پہنچ رہا ہے، میں اس کا سبب نہ بنتا تو اچھا تھا، اندازہ کیجئے کہ یہ ان لوگوں کے حق میں آپؐ کے دریائے رحم کا جوش ہے جو چند لمحے قبل تک آپؐ کے اور اہل اسلام کے خون کے پیاسے تھے، اور اب بھی نہیں معلوم کہ حقیقت کیا ہے۔

ایک دفعہ آپؐ نے صفا پہاڑی پر چڑھ کر شرفائے مکہ اور روساء قریش کو نام بہ نام جمع فرمایا، جب سب جمع ہو گئے تو آپؐ نے انہیں اسلام کی دعوت بڑے ہی حکیمانہ و مشفقانہ انداز میں دی، مگر اس کے جواب میں سب لوگوں نے بدکلامی اور سنگباری کی اور بدتمیزی کا بھی مظاہرہ کیا، اتنے میں ملائکۃ اللہ نے حکمِ الٰہی سے بارگاہ عالی میں پہونچ کر عرض کیا کہ اگر ارشاد ہو تو ان سب کو ہلاک کر دیا جائے، اس وقت شریف سے شریف آدمی بشری تقاضے سے کیا جواب دے سکتا تھا سب سمجھ سکتے ہیں، لیکن قربان جائے کہ رحمۃ للعالمینؐ نے اسکے جواب میں ارشاد فرمایا ”**انما بعثت رحمة لهم لا عذابا عليهم**“ میں ان کے لئے رحمت بنا کر مبعوث کیا گیا ہوں عذاب بنا کر نہیں، گویا میں ان کی ہدایت کا خواہشمند ہوں ہلاکت کا نہیں۔

یہ تو انسانوں کے حق میں آپؐ کی مہربانی تلطف وترحم کی ہلکی سی جھلک ہے، ورنہ اس کی تفصیل کیلئے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں، اب دیکھئے کہ اس رحمت عالم و عالمیاں صلی اللہ علیہ وسلم کا بے زبان جانوروں کے ساتھ ہمدردی و شفقت کا کیا حال تھا؟

ایک دفعہ آپؐ کہیں تشریف لیجارہے تھے، اثناء راہ ایک اونٹنی نے آپؐ کو اپنی جانب متوجہ کیا، اور شکایت کرنے لگا کا اس کا مالک اس سے کام تو بہت لیتا ہے مگر غذا کم دیتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شکایت سنی تو اس کے انصاری مالک کو طلب کیا اور سرزنش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا (**افلا تتقى الله فى هذه**

**البهیمة التی ملکک ایاھا** )ان بے زبان جانوروں کے سلسلہ میں خوف خدا نہیں کرتے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارا مطیع امر بنا دیا ہے۔

ایک سفر میں صحابہ کرامؓ کی نظر کسی چڑیا کے گھونسلے پر پڑی، اس میں ننھے ننھے بچے تھے، صحابہ کو اچھے لگے تو انہیں پکڑ کے لے آئے، چڑیا گھونسلے پر پہونچی تو اپنے بچوں کو نہ پا کر بے چین ہوگئی، وہ انسانوں کے قافلہ پر اضطراب و بے چینی کے ساتھ منڈلانے لگی، آپ نے دیکھا تو سمجھ لیا کہ اس کے بچے اس سے جدا کئے گئے ہیں فوراً صحابہ کرامؓ کو تنبیہ فرمائی اور ارشاد ہوا کہ انہیں چھوڑ دیا جائے (**من فجع ھذہ بولدھا ردوا ولدھا** ) کس نے اس کے بچوں کو جدا کر کے اس کا دل دکھایا ہے فوراً اس کے بچے اسے واپس کردو۔

ایک دفعہ آپ کہیں تشریف لے جارہے تھے، آپؐ کے صحابہؓ ساتھ تھے، انہوں نے ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا کہ وہاں چیونٹیاں بکثرت تھیں، اور ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے انہیں اچھی خاصی زحمت ہوئی، اپنی قیام گاہ پر ان لوگوں نے ان کے ضرر سے بچنے کے لئے گھاس جمع کر کے آگ لگا دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اس پر پڑی تو ارشاد فرمایا کہ کسی جاندار کو جلانے کی جرات و ہمت سوائے اس ہستی کے اور کسی کو نہیں ہونی چاہیے جس نے انہیں پیدا کیا، (**انہ لا ینبغی ان یعذب بالنار الا رب النار**)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مزاج اور ان کی مذکورہ تعلیمات کو سامنے رکھئے پھر مسلمانوں کے موجودہ معاشرے پر ایک نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ آج امت میں رافت ورحمت اور تلطف وترحم کے بجائے کس قدر سنگ دلی اور قساوت پیدا ہوگئی ہے، آئے دن ایک دوسرے کا بے دردانہ قتل، خانہ جنگی، لوٹ کھسوٹ، خودکشی وخودسوزی، بے ایمانی ودغا بازی، دھوکہ وخیانت، دوستوں میں منافرت پیدا کرنا، زوجین کے درمیان چغلخوری بلکہ بہتان طرازی کے ذریعہ جدائی ڈلوانا، امانتوں

میں خیانت کرنا، جانور تو جانور انسانوں کو اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کے سامنے جلا دینا، بلا تحقیق ایک دوسرے سے بدگمان ہوجانا، اور اس کی بنیاد پر نفرت وکدورت کی عمارت کھڑی کرنا وغیرہ جیسے واقعات آج مسلمانوں کے معاشرہ میں کوئی بُری بات نہیں رہ گئے ہیں، بلکہ کمال و ہنر سمجھے جانے لگے ہیں۔ یہ سنگدلی عذاب الٰہی اور غضبِ خداوندی نہیں تو اور کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہودیوں کی بےایمانی، بربادی اور نافرمانی کا اہم سبب یہی "سنگدلی اور قساوتِ قلبی" قرار دیا ہے۔(ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَالِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةٍ )افسوس کہ جس قساوتِ قلبی اور سخت مزاجی کے روگ نے امم سابقہ کو ہلاک کیا تھا، وہی سنگدلی وقساوتِ قلبی امت محمدیہؐ کا پیارا شعار بن رہی ہے، اسکا جو نتیجہ ہونا چاہئے وہ آنکھوں کے سامنے ہے، بہرحال اگر اس مرض کی طرف توجہ اور اصلاح کی فکر نہ کی گئی تو اس سے بھیانک حالات کا سامنا کرنے پر ہمیں مجبور ہونا پڑے گا۔ اس لئے ربیع الاول کے اس مبارک مہینہ میں (جس کی آمد کے ساتھ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و وفات کے حالات ایک مومن کے قلب وذہن میں پر چھا جاتے ہیں) ہم مسلمانوں کو یہ پختہ عہد کر لینا چاہیے کہ اب سنبھل جائیں گے، ابتک بس جشن وجلوس پر اکتفاء کر کے مطمئن ہو بیٹھتے تھے اب میدانِ عمل میں اترنے کا عزم لے کے کھڑے ہو جائیں گے، اور فرد و مجتمع دونوں کی اصلاح کیلئے بےچینی کے ساتھ کام شروع کر دیں گے، اقبال کے اس پیغام پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ؎

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کردے

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عمل عطا فرمائے۔ آمین

# حقوق العباد

# اسلام میں اس کی اہمیت اور اسلاف کا طرز عمل

اسلام میں مسلمانوں پر لاگو ہونے والے حقوق دو طرح کے ہیں ۔ایک حقوق اللہ، دوسرے حقوق العباد ۔پھر حقوق العباد کی بھی سمجھئے کہ دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا تعلق بندوں کے املاک واموال سے ہے، دوسرے وہ جو ان کی عزت وآبرو سے متعلق ہے۔

قرآن وحدیث نے ان تمام حقوق کی نشاندہی کی اور مسلمانوں سے ان کی ادائیگی کا سخت ترین مطالبہ کیا ہے، ان حقوق کی تفصیل میں جانا اس وقت چونکہ مدنظر نہیں ہے، اس لئے ہم حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے رسالہ "حقوق اسلام" سے صرف ان حقوق کی فہرست درج کر دیتے ہیں ۔جس سے اندازہ ہوگا کہ آپس میں ایک دوسرے کے حقوق کی صرف انواع اس قدر ہیں تو ہر نوع کے تحت ان کے افراد کتنے ہونگے ؟ رسالہ "حقوق الاسلام" کے عنوانات یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالی کے حقوق (۲) پیغمبروں کے حقوق (۳) اہل بیت کے حقوق (۴) علماء ومشائخ کے حقوق (۵) زندگی میں والدین کے حقوق (۶) بعد انتقال والدین کے حقوق (۷) دادا، دادی، نانا، نانی کے حقوق (۸) اولاد کے حقوق (۹) دودھ پلانے والی انا کے حقوق (۱۰) سوتیلی ماں کے حقوق (۱۱) بہن بھائی کے حقوق (۱۲) رشتہ داروں کے حقوق (۱۳) استاذ و پیر کے حقوق (۱۴) شاگرد و مرید کے حقوق (۱۵) زوجین کے حقوق (۱۶) حاکم ومحکوم کے حقوق (۱۷) سسرالی

عزیزوں کے حقوق (۱۸)عام مسلمانوں کے حقوق (۱۹)پڑوسی کے حقوق (۲۰)یتیموں ضعفیوں کے حقوق(۲۱)مہمانوں کے حقوق (۲۲)دوستوں کے حقوق(۲۳)غیر مسلموں کے حقوق (۲۴)جانوروں کے حقوق (۲۵)خود اپنے آپ کے حقوق۔

یہ تو رہی صرف فہرست! ان میں سے ہر عنوان کے تحت دسیوں حقوق ہیں جنکی ادائیگی کا اسلام نے سختی سے مطالبہ کیا ہے۔اور ادانہ کرنیکی صوررت میں دنیاوآخرت کی شدید وعیدیں سنائی ہیں،ذیل میں اس سلسلہ کی چند احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

**عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ علیہ وسلم قال لتئودن الحقوق الی اھلھایوم القیامۃ حتی یقاد للشاۃ الجلحاء من الشاۃ القرناء.**[1]

قیامت کے دن ہر حقدار کواس کا حق ضرور دلایا جائیگا۔یہاں تک کہ بے سینگ والی بکری کو سینگ والی بکری سے اس کی زیادتی کا حق دلوایا جائیگا۔

ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا حقوق العباد کی اہمیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان الفاظ میں نقل فرمارہی ہیں: **من ظلم قید شبر من الارض طوقہ من سبع ارضین**[2]

جس نے کسی دوسرے کی ایک بالشت زمین بھی ظلماً لے لی وہ ساتوں طبق سمیت قیامت کے دن طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈال دی جائیگی۔

ظلم کا انجامِ بد ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**ان اللّٰہ لیملی للظالم فاذااخذہ لم یفلتہ**" اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے(تا آنکہ مزید پختہ ہوجائے) پھر جب پکڑتا ہے تو اسکو چھوڑتا نہیں۔

قبیلہ بنی ازد کے ایک شخص نے اموال مسلمین میں خیانت کی تھی اسوقت آپ

---

۱؎ مسلم شریف:۲/۲۸۳ ۲؎ بخاری شریف:۹۸۴،

ﷺ نے اس سلسلہ میں ایک خطبہ دیا تھا، اسی میں یہ بھی فرمایا:

| | |
|---|---|
| **واللّٰہ لا یا خذ احدکم منکم شیئا بغیر حقہ الا لقی اللّٰہ تعالیٰ یحملہ یوم القیمۃ**[۱] | بخدا! تم میں سے کوئی کسی شخص کی کوئی چیز ناحق طور پر نہیں لیتا مگر یہ کہ قیامت کے دن اسے اپنے اوپر لادے ہوئے حاضر ہوگا۔ |

اسی طرح حضرت ابوامامہ حارثی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| **من اقتطع حق امری مسلم بیمینہ فقد اوجب اللّٰہ لہ النار وحرم علیہ الجنۃ فقال رجل وان کان شیئا یسیرا یارسول اللّٰہ! فقال وان قضیبامن اراک**[۲] | جس شخص نے مسلمان کا کوئی حق (جھوٹی) قسم کے ذریعہ ضائع کیا تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کو واجب اور جنت کو حرام کر دیتے ہیں، یہ سن کر ایک شخص نے پوچھا یارسول اللہ! اگر وہ کوئی حقیر سی شئے ہو؟ فرمایا: اگر چہ پیلو کی ایک ٹہنی ہی کیوں نہ ہو |

اسی طرح ایک مرتبہ آپ نے مفلس کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

| | |
|---|---|
| **وعن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اتدرون من المفلس، قالوا المفلس فینا من لا درھم لہ ولا متاع، فقال ان المفلس من امتی** | آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: ہمارے نزدیک مفلس وہ ہے جسکے پاس دینار ودرہم یعنی مال ودولت نہ ہو، فرمایا: |

۱ بخاری شریف: ٥/٢٠٠ ۲ بخاری شریف: ٥/١٦٢،

من یاتی یوم القیامہ بصلاۃ وصیام وزکوۃ ،ویاتی قد شتم ھذا وقذف ھذاواکل مال ھذا وسفک دم ھذا وضرب ھذا فیعطی ھذا من حسناتہ وھذا من حسناتہ، فان فنیت حسناتہ قبل ان یقضی ما علیہ اخذ من خطایا ھم فطرحت علیہ ثم طرح فی النار[۱]

حقیقی مفلس میری امت کا وہ ہے جو قیامت میں نمازوں روزوں اور زکوٰتوں کولیکر آئے ۔مگر ساتھ ہی یہ اعمال بھی کہ فلاں کو برا بھلا کہا تھا، فلاں پر بہتان طرازی کی تھی، فلاں کا مال کھالیا تھا، فلاں کا خون بہایا تھا، فلاں کو مارا تھا، پس ان حقوق کی وجہ سے ان میں سے کسی کو اس کی کچھ نیکیاں دیدی جائینگی کسی کو کچھ، پھر اگراسی طرح دوسروں کودیتے دیتے اسکی نیکیاں ختم ہوجاتی ہیں اور حقوق پھر بھی باقی رہ جاتے ہیں تو ان کے گناہ لے کراس پر لاددئے جائینگے، اس طرح باوجود اتنے سارے اعمال لانے کے بعد بھی محض حقوق العباد سے غفلت کی وجہ سے جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔

ایک اورموقعہ پرآپؐ نے مسلمان کوگالی گلوچ کرنے کی برائی کرتے ہوئے ارشادفرمایا:"سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر"مسلمان کوگالی دینا بے دینی کی بات ہے اوراس کاقتل کفر ہے۔[۲] اسی طرح چغلخوری کا انجام بیان کرتے ہوئے فرمایا:"لا یدخل الجنۃ نمام" چغلخور جنت میں نہ جائیگا۔[۳] غیبت کے

[۱] مسلم شریف:۲/۳۸۳، [۲] بخاری شریف:۷۹۷، [۳] مسلم شریف:ص:۴۱۱،

بارے میں فرمایا:"الغیبة اشد من الزنا" غیبت بدکاری سے بھی بڑھ کر ہے۔[1] مسلمان کو دھوکہ دہی کی ممانعت کرتے ہوئے فرمایا:"من غشنا فلیس منا" جس نے دھوکہ دیا ہم میں سے نہیں۔[2] گنجائش کے باوجود قرض کو بروقت ادا نہ کرنے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:"مطل الغنی ظلم" مالدار کا ادائے قرض میں تاخیر کرنا ظلم ہے۔[3] آپس میں بیر رکھنے اور حق سلام وکلام ترک کرنے پر شدید وعید سناتے ہوئے ارشاد فرمایا:"لا یحل لمسلم ان یهجر اخاه فوق ثلاث فمن هجر فوق ثلاث دخل النار" کسی مسلمان سے تین دن سے زائد کسی دنیوی غرض سے بولنا چھوڑ دینا جائز نہیں، جس نے ایسا کیا اور اسی حال میں مر گیا تو جہنم میں جائیگا۔ اسی طرح ارشاد ہے:" کل المسلم علی المسلم حرام دمه وعرضه وماله بحسب امرء من الشر ان یحقر اخاه المسلم"[4] مسلمان پر مسلمان کی آبرو خون اور اس کا مال حرام ہے آدمی کے برا ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ بھائی مسلم کی تحقیر کرے حتی کہ اگر دوسرا ہماری حق تلفی کرتا ہے تو بھی اس کی اجازت نہیں کہ اسکی حق تلفی کریں۔اسی طرح ارشاد ہے:" انها ستکون بعدی اثرة وامور تنکرونها.قالوا یا رسول اللّٰه! فما تأمرنا ؟قال تؤدوا الحق الذی علیکم وتسالون اللّٰه الذی لکم"[5]

میرے بعد جلد ہی نفسا نفسی اور ایک دوسرے کی حق تلفی شروع ہو جائیگی۔اور ایسے معاملات سامنے آئیں گے جن کو تم ناپسند کرو گے۔صحابہؓ نے عرض کیا کہ ایسے وقت ہمارے لئے کیا ہدایت ہے؟ فرمایا تم دوسروں کے حقوق ادا کرتے رہو اور اپنے حقوق کا سوال بس اللہ سے کیا کرو۔

اس جگہ بطور نمونہ کے مذکورہ بالا چند روایات ذکر کر دی گئی ہیں، ورنہ ذخیرۂ احادیث میں بے شمار روایات ہیں جو حقوق العباد کی وضاحت اور ان کے تلف

[1] مشکوٰۃ شریف:ص:۴۱۵، [2] صحیح مختصر مسلم:ص:۳۳۴، [3] ایضاً، [4] ایضاً ص:۴۷۴، [5] مسلم شریف:ص:۸۷،

کرنے والے پر شدید وعید ظاہر کرتی ہیں۔

اس سب کے باوجود انسان آخر انسان ہے، جس سے بعض دفعہ ان تعلیمات سے ذہول ہوسکتا ہے اور بہت سوں سے تو بوجہ علم دین سے دوری کے —— خصوصاً اس زمانہ میں کہ اکثر مسلمانوں کو سرے سے معلومات ہی نہیں کہ کس کا کیا حق ہے؟ —— یہ حقوق ضائع ہوتے رہتے ہیں، اور آدمی ان کے نتائج بد کا بجا طور پر موردو مستحق بن جاتا ہے، —— وجہ کچھ بھی ہو خواہ جہالت کی وجہ سے خواہ ذہول و نسیان یا غلبہ طبعیت کی بنا پر —— تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کا حل کیا ہے اور اس نقصان کی تلافی کی شکل کیا ہوسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں معلوم ہونا چاہیے کہ آپ ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ آدمی ایک تو اللہ تعالیٰ سے صدق دل سے اس کوتاہی کی توبہ کرے اور دوسرے اہل حق کا حق جو ضائع کیا ہے اس کو اب ادا کرے یا پھر اس سے معافی حاصل کرے، چنانچہ ارشاد ہے: ”**من كانت عنده مظلمه لا خيه من عرضه او من شيئى فليتحلله منه اليوم قبل ان لا يكون دينار ولا درهم**“ جس شخص کے اوپر اپنے بھائی کا کوئی حق باقی ہو خواہ اموال کا یا آبرو کا، تو اسکو چاہئے کہ اس دن کے آنے سے قبل جس دن دینار و درہم نہیں ہونگے معافی مانگ کر، یا ادا کر کے اس سے دستبردار ہو جائے۔

چونکہ حقوق العباد کی کوتاہی کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتے اس لئے اس کا راستہ بس یہی ہے کہ جب اس کو ہوش آجائے اس وقت یا تو اس حق کو ادا کر کے اس سے بری ہو جائے، یا اسکی سکت نہ ہو تو صاحب حق سے معافی مانگ کر اس معاملہ کو صاف کر لے، پھر یہ کام چونکہ اسی دنیا میں ہوسکتا ہے، اور موت سے پہلے ہی ہوسکتا ہے، اس لئے اس میں جلدی بھی کرے کہ نہ معلوم کب موت آجائے، اور یہ قیمتی موقع ہاتھ سے نکل جائے۔

یہی وجہ ہے کہ دین کو صحیح معنوں میں سمجھنے اور پورے طور پر اختیار کرنے والے مسلمان ـــــ جنہیں ہم "اللہ والے" کہتے ہیں ـــــ وہ اس معاملہ میں بہت چوکنا اور بیدار رہتے ہیں، چنانچہ ان سے اگر کسی کا حقیر سے حقیر حق بھی ترک ہو جاتا ہے تو اسکی صفائی اور یکسوئی میں تاخیر نہیں کرتے، انہیں جب اپنی کوتاہی اور حق تلفی پر تنبہ ہوتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان کی بھوک اور نیند تک حرام ہو گئی ہے، اسلئے وہ جب تک اس کا حق ادا نہیں کر دیتے یا معافی نہیں مانگ لیتے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے، چند سبق آموز واقعات عبرت ونصیحت کیلئے ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔

ابن ہبیرہ رحمۃ اللہ" خلیفہ مقتضی باللہ" کے دور میں بغداد کے وزیر اعظم تھے، ساتھ ہی ساتھ بڑے درجہ کے عالم و عابد تھے، انہوں نے "صحاح ستہ" کے حدیثوں کی شرح بڑے جامع و دقیق انداز میں "الافصاح" کے نام سے لکھی تھی، اور باوجود وزارتِ عظمیٰ کی مشغولی کے وہ خود اس کتاب کا باقاعدہ درس بھی دیا کرتے تھے، مولانا مناظر احسن گیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے اسی درس کے دوران پیش آئے ان کے ایک سبق آموز واقعہ کا ذکر فرمایا ہے، بہتر ہے کہ یہ واقعہ آپ مولاناؒ ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں وہ لکھتے ہیں:

ابن ہبیرہؒ کے دوران درس ایک مالکی مذہب کے فقیہ نے خواہ مخواہ ان سے الجھنا شروع کیا، علماء کا حلقہ تھا ہر ایک شخص اس فقیہ کو سمجھاتا تھا، فن کی معتبر کتابیں لا لا کر دکھلائی جاتیں، مگر مرغی کی ایک ٹانگ پر ملا کا اصرار برابر جاری رہا، قدرتاً اس اصرار بے جا پر ابن ہبیرہؒ کو غصہ آ گیا، اور زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل گیا "تم جانور ہو" کہنے کو تو اس وقت ابن ہبیرہؒ نے انہیں جانور کہہ دیا لیکن اس کے بعد جب ان کے شریف نفس میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوا تو پھر کس حال میں وہ مبتلاء ہوئے؟ بس یہی سننے کی بات ہے۔

اس دن کی مجلس تو ختم ہوگئی، دوسری مجلس میں جب لوگ جمع ہوئے اور قاری نے قراءت شروع کرنی چاہی تو ابن ہبیرہؒ نے اس کو روک دیا، اور مالکی فقیہ سے مخاطب ہوکر فرمایا: کل آپ کے اصرار بے جا نے خواہ مخواہ میری زبان پر ایک ایسے لفظ کو جاری کر دیا کہ جب تک اسی سے آپ مجھے مخاطب نہ کر لینگے سبق شروع نہ ہوگا، ابن ہبیرہؒ فرمارہے تھے آخر آپ کو جانور کہنے کا مجھے کیا حق حاصل تھا؟ مجلس سناٹے میں آگئی، خلافت عباسیہ کا وزیر اعظم، الحاح وزاری کے ساتھ ایک مولوی کے سامنے قصور کا اعتراف کر کے یہ استدعا کر رہا ہے کہ مجھے بھی جب تک آپ ( بدلہ میں ) جانور نہیں کہہ لیں گے میرے دل کو اطمینان نہ ہوگا۔ اہل مجلس پر رقت طاری ہو گئی، لوگ رونے لگے، مالکی فقیہ شرمندہ ہورہے تھے وزیر اعظم سے کہہ رہے تھے: حضرت! قصور تو میرا تھا، مجھے معذرت کرنی چاہیئے تھی، مگر ابن ہبیرہؒ کی زبان پر ایک ہی لفظ تھا "قصاص! قصاص!" آخر لوگوں نے مالکی فقیہ کو سو اشرفیاں ( ہتک عزت کے عوض ) ابن ہبیرہؒ سے لیکر انہیں کو مطمئن کرنے پر زبردستی آمادہ کیا۔[۱]

آپ نے دیکھا؟ ایک عظیم المرتبت عالم دین اور اپنے وقت کا وزیر اعظم کس طرح ہاتھ جوڑ کر خوشامد کر کے ایک طالب علم سے اپنی لفظی زیادتی کی معافی مانگ رہا ہے۔

آیئے! ایک دوسرا عبرت انگیز واقعہ پڑھئے، یہ واقعہ جلیل القدر عالمِ دین اپنے ملک کے مفتی اعظم، ہزراروں مریدوں کے شیخ ومربی، ہزاروں علماء کے استاذ و اتالیق، دار العلوم کراچی کے بانی ومہتمم، حکیم الامت تھانویؒ کے خلیفۂ اجل، مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ کا ہے، انکی صاحبزادی اپنے ایک مقالہ میں لکھتی ہیں۔

ایک مرتبہ میں جب حاضر خدمت ہوئی تو ابا جان کسی بات پر مجھ سے ناراض ہوگئے، اور خفگی بڑھتی چلی گئی اس ناکارہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وجہ ناراضگی کیا

[۱] مقالاتِ احسانی: ص: ۱۷۴

ہے؟ آپ کو راضی کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن خفگی برقرار رہی جسکی وجہ سے میں بہت غمگین تھی اور کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا، اچانک میرے منھ سے نکلا کہ مجھے اب تک یہی سمجھ میں نہ آیا کہ آپ کی ناراضگی کی وجہ کیا ہے؟۔اس کے بعد شام کو میں اپنی قیام گاہ واپس آگئی، ابا کی ناراضگی کا خیال دل کو بے چین کیا ہوا تھا اور کسی پل چین نہیں ملتا تھا، دوسرے دن شام کے وقت پیغام پہونچا کہ والد شفیق نے یاد فرمایا ہے، امید وبیم کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ پہونچی، دیکھتے ہی مسکراہٹ کے ساتھ سینہ سے لگالیا، اس وقت نماز کا وقت قریب تھا، فرمایا نماز کے بعد بات کرونگا، پھر بعد نماز تنہائی میں لیجا کر فرمایا تو تو کل چلی گئی اور میں رات بھر سو نہ سکا، وہ ایک جملہ جو تو آخر میں کہہ گئی تھی اس کو سونچتا رہا اور بالآخر شرح صدر اس پر ہوا کہ میری ناراضگی صحیح نہ تھی۔اس وقت میں نے تجھے اسی لئے بلایا ہیکہ معافی مانگ لوں، آپ کی یہ بات سنکر میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور زبان سے کچھ نہ کہہ سکی تو فرمایا: یہ حقوق العباد کا معاملہ ہے اس میں بڑے چھوٹے کی قید نہیں، جب تک تو زبان سے معاف نہ کریگی مجھے سکون نہ ملے گا۔[1]

سبحان اللہ! کیا شان ہے تقوی کی! آپ کچھ سوچ رہے ہیں؟ ایک جلیل القدر باپ اپنی بیٹی سے ذراسی بات کی معافی مانگ رہا ہے۔وہ باپ جس نے اس بیٹی کو پالا پوسا، دن رات ایک کیے، پیدائش سے لیکر جوان ہونے تک کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا ہے، کتنی تکلیفیں جھیلی جاتی ہیں، اور نادانی میں خود بیٹی نے کتنی تکلیفیں نہیں پہونچائی ہونگی اور اب بڑھاپے کی اس عمر میں اپنی ذراسی زیادتی کا احساس ہوا تو کس بے تکلفی وسادگی کے ساتھ معافی مانگی جارہی ہے۔واقعی

**انہی کے اتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی**

اور اب ادھر آئیے! یہ پھولپور کی خانقاہ ہے، شیخ المشائخ شاہ عبدالغنی صاحب

---

[1] البلاغ کا مفتی اعظم نمبر: ص:۱۱۵۵

نوراللہ مرقدہ مسند مشیخت پر تشریف فرما ہیں، صاحبِ نسبت بزرگ اور کامل الحال شیخِ طریقت ہیں، دوسری جانب فارغ التحصیل اور مستند عالمِ دین بھی ہیں، تیسری طرف غازیانہ مزاج کے حامل، جہد و عمل کے جذبات سے سرشار، راتیں گریہ و بکا، ذکر و شغل کی نذر، تو دن افادہ وارشاد کے نثار!

دیہات سے ایک نوجوان حاضر خدمت ہوا، اور کسی غلطی پر شیخ نے اس کی گرفت و مواخذہ فرمایا، مواخذہ سخت نوعیت کا ہوا، وہ شخص عقید تمند تھا، اس ڈانٹ کو سعادت سمجھا ہنسا اور واپس چلا گیا، شیخ نے ڈانٹ ڈپٹ کرنے کو تو کر دی لیکن جب اس سلسلہ میں اپنے آپ کا محاسبہ فرمایا تو ضمیر نے کہا، وہ شخص نہ شاگرد تھا نہ مرید! پھر اس کو اس قدر سخت سست کہنے کا ہمیں کیا حق تھا؟ بلاشبہ اس پر یہ زیادتی ہوئی ہے، اب شیخ کے دل میں اضطراب پیدا ہوا، بے چینی بڑھنے لگی، بے کلی میں اضافہ ہوا تو رومال اٹھا کر کندھے پر ڈالا، لاٹھی ہاتھ میں لے لی اور تن تنہا اس دیہاتی کے گاؤں کی طرف چل پڑے، پیدل چلتے چلتے شام کے وقت اسکے گھر پہونچے، دستک دی، آواز آئی کون؟ فرمایا عبدالغنی! لب ولہجہ اور نام سے کچھ اندازہ کیا دروازہ کھول کے جو دیکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ شیخ کھڑے ہوئے ہیں! ششدر و حیران رہ گیا وہ جس کے سامنے آنے سے بڑے بڑے کانپتے ہیں اور جس کی جوتیوں میں امیر و کبیر لوگ اپنی عزت تلاش کرتے ہیں، وہ مجھ ایسے دیہاتی کاشتکار کے دروازہ پر رونق افروز ہے؟ بڑی مشکل سے دل کو تھاما، سانس کو قابو میں کیا، اور دست بستہ عرض کیا، حضور نے غریب خانہ کو رونق بخشی، کرم ہوگا اگر اندر تشریف لے آویں۔

ارشاد ہوتا ہے: نہیں جی! میں اس وقت اندر نہیں آنے کا، میرے ہاں مہمان ہیں، مجھے ان کی فکر کرنی ہے، میں تو اپنی ایک غرض اور ضرورت لیکر آیا ہوں۔ وہ پوری کر دو بس چلا جاؤنگا۔ عرض کیا حضرت! مجھے طلب فرمالیا ہوتا، خادم بسر و چشم

حاضر ہو جاتا، فرمایا نہیں! میری اپنی ضرورت ہے اور اسکے لئے مجھے ہی آنا چاہئے تھا، عرض کیا ضرورت بیان فرمائی جائے۔ فرمایا: تم جو وہاں آئے تھے اور میں نے فلاں بات پر تمہاری تنبیہ کی تھی بعد کو میں نے سونچا تم نہ میرے مرید نہ میرے تلمیذ! پھر مجھے کیا حق تھا اس ڈانٹ ڈپٹ کا؟ بس اسی غلطی کی معافی چاہنے آیا ہوں۔ غریب حیرت زدہ رہ گیا شرم سے آنکھیں زمین میں گاڑھ لیں، کہنے لگا توبہ توبہ میں آپ کو معاف کروں؟ آپ بزرگ ہیں بڑے ہیں، میرے دادا کے برابر ہیں، آپ کی بات کا میں نے برا بھی کب مانا تھا؟ فرمایا نہیں بابا! یہ حقوق العباد کا معاملہ ہے، قیامت میں یہ سب باتیں نہیں چلیں گی، جب تک تم مجھے معاف نہیں کروگے میں تمہارے دروازہ سے ٹلنے کا نہیں، بیچارہ اللہ کا بندہ اس حالت کو دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ حضرت! اطمینان رکھئے میں نے معاف کر دیا۔

کوئی ٹھکانہ ہے اس پاس حقوق اور احساس حدود کا؟ اور آگے بڑھنے سے قبل ذرا یہ بھی سن لیجئے کہ حقوق العباد کی ادائیگی کی اس فکر اور اس کے لئے اپنے آپ کو مٹانے اور فنا کر دینے کا صلہ آخرت سے قبل ہی اس دنیا میں بھی کیسا لذیذ و عجیب ملا، شیخ خود فرماتے ہیں کہ اسی رات کو جب میں سو گیا خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دریا ہے، اس میں دو کشتیاں ہیں، ایک کشتی میں میں سوار ہوں اور ایک میں سرکار دو عالم ﷺ اور حضرت علیؓ، آپ حضرت علیؓ سے فرمارہے ہیں علیؓ! ہماری کشتی کو عبد الغنی کی کشتی سے ملا دو، چنانچہ حضرت علیؓ دوڑاتے ہوئے لاکر آپ ﷺ کی کشتی کو میری کشتی سے جوڑ دیا۔ اور فرماتے تھے کہ دو کشتیوں کے ملنے کی وجہ سے کھٹ کی جو آواز آئی وہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے، دیکھا آپ نے؟ کیسی تسلی کا سامان کیا گیا۔ اس خواب پر خود حضرت پھولپوریؒ نے ایک شعر فرمایا ہے۔

مضطرب دل کی تسلی کے لئے
حکم ہوتا ہے ملا دو ناؤ کو

اسی طرح حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک دفعہ آپ کی اہلیہ محترمہ نے آپ کے سامنے آپ کے بھائی کے خادم کے حوالہ سے کوئی بات نقل کی، آپ نے اسی وقت اسکو طلب کر کے تحقیق حال فرمائی، اس نے جواب میں صاف انکار کر دیا اور حضرت سے کہنے لگا "مولانا! خدا کا خوف کیجئے! مجھ پر الزام نہ لگایئے، جب اس نے اس الزام کا انکار کر دیا تو حضرت نے اپنی اہلیہ سے فرمایا جو پس پردہ تھیں۔ دیکھو تم نے اس شخص پر الزام لگایا ہے تم قصوروار ہو اس لئے اب تم اس سے معافی مانگو، وہ خفا ہوئیں اور کہنے لگیں آپ مجھے نوکروں کے سامنے فضیحت کرنا چاہتے ہیں؟ فرمایا مگر تم یہ نہیں سمجھ رہی ہو کہ میں قیامت میں اللہ کے محبوب بندوں کے سامنے تمکو فضیحت ورسوائی سے بچا رہا ہوں، اسطرح آپ نے ایک نوکر کا حق اپنی بیوی سے دلوا کر اپنے متبعین کو بتلا دیا کہ خوفِ خدا اور احتسابِ آخرت اسکو کہتے ہیں۔

کہنے کو یہ معمولی بات ہے لیکن اس کے لئے جس غیر معمولی خوف خدا اور ایمان بالاخرت کی ضرورت ہوتی ہے وہ کسی عقلمند سے مخفی نہیں، کیونکہ ہر کس و ناکس کا یہ حوصلہ نہیں ہوتا کہ بھائی کے نوکر کے سامنے اپنی بیوی کو غلطی تسلیم کر کے معافی مانگنے پر مجبور کر لے۔ اور یہی نہیں کہ اپنے دست نگروں اور ماتحتوں کے ساتھ یہ رویہ تھا بلکہ خود اپنی ذات کے لئے بھی ان کا یہی طرز عمل وطریق کار تھا۔ چنانچہ اہل تذکرہ نے لکھا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں باقاعدہ اعلان فرمایا تھا کہ جس کا مجھ پر کوئی حق نکلتا ہو وہ اسکی وضاحت کر کے مجھ سے وصول کر لے۔ کیونکہ اب چل چلاؤ کا وقت ہے، اور کام اب نہ ہو سکا تو پھر قیامت کے دن اتنی آسانی اور سہولت کے ساتھ نہ ہو سکے گا، بلکہ حضرت نے اپنے دل کے ان احساسات وجذبات کو الفاظ کے آئینہ میں اسطرح پیش فرمایا تھا۔

کسی کو اگر میں نے مارا بھی ہو
بری بات کہہ کر پکارا بھی ہو
وہ آج آن کر ہم سے لے لے انتقام
قیامت کے دن پر نہ رکھے یہ کام
کہ خجلت بروز قیامت نہ ہو
خدا پاس مجھ کو ندامت نہ ہو

اندازہ کیجئے کہ ایک شیخ وقت جواسی برس کی عمر میں ہے، بچپن وتعلیم کے بیس سال اس میں سے نکال بھی دیں تو ساٹھ سال تک انتہائی اخلاص اورللّٰہیت سے انتھک اور مسلسل خدمت قوم کی کرتا رہا، وعظ ونصیحت ،رشد وہدایت، تالیف و تصنیف ،تادیب وتدریس، تفہیم وتشریح ،اصلاح وتزکیہ،غرض دین کا کونسا شعبہ تھا جس میں آپ نے اپنے دور میں قابل لحاظ ہی نہیں لائق فخر خدمات انجام نہیں دیں تھیں؟ اور وہ بھی اس شان کے ساتھ کہ اپنوں اور پرایوں ۔معتقدوں اورنکتہ چینوں سبھی نے بالاتفاق شہادت دی کہ راہِ خدا میں وہ ہر تکلیف وزیادتی کو کوہ استقامت بنکر سہہ لیتے تھے،لیکن کبھی خود دوسرے کے لئے باعث زحمت اور وجہ ایذاء نہیں بنتے تھے، نہ کبھی قلم سے کسی کی دل آزاری فرمائی اور نہ زبان سے، وہ اخلاق کے اتنے اونچے مرتبہ کے حامل تھے کہ اپنے ایک ایسے حاسد ومخالف جنہوں نے انکی تکفیر وتحقیر میں کوئی کسر اٹھا کے نہیں رکھی تھی ان کا نام بھی بغیر لفظ ''مولانا'' کے لینا پسند نہ فرماتے تھے بلکہ سننا بھی گوارہ نہیں تھا، آپ سونچیں کہ انہوں نے کسی سے کیا لیا دیا تھا؟ جو کچھ کیا تھا وہ اللہ واسطے، اور جو زندگی گذاری تھی وہ وقف علی القوم تھی ، پھر بھی اپنے مریدین ومتعلقین سے معاملہ کی صفائی کی فکر اور محض احتیاط کے طور پر انتقام یا معافی کی درخواست فرمارہے ہیں۔

حقوق کی ادائیگی اور معاملات کی صفائی کا یہ اہتمام خوف خدا، خشیت وانابت، اور قرآن وحدیث کی تعلیمات پر ایمانِ کامل اور یقین واثق کا نتیجہ ہوتی ہیں، واقعی حضرت اپنے وقت کے پائے کہ عارفین اور اولیاءِ کاملین میں سے تھے، اسلئے کہ مذکورہ صفات، بلامعرفت کاملہ کے کسی کو حاصل نہیں ہوتیں، اور جس درجہ کی معرفت ہوگی اسی درجہ میں ان صفات کا ظہور ہوگا۔

یہ تو بزرگانِ دین اور اولیاءِ امت کے واقعات تھے، اس مسئلہ میں صحابہ اکرامؓ کا حال تو ان سے بھی اعلیٰ وارفع تھا، بزرگان دین تو انہی لوگوں سے فیض پا کر "بزرگ" اور انہی کے سانچے میں ڈھل کر "مقبول بارگاہ" ہو سکے ہیں۔

حدیث کی کتابوں میں واقعہ ملتا ہے کہ ایک دفعہ سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہما کے درمیان کسی معاملہ میں کچھ بحث وتکرار ہوگئی۔ صدیق اکبرؓ نے اس وقت کچھ سخت کلمات اپنے دوست کی گفتگو کے جواب میں کہہ دیئے، بات ختم ہوگئی اور دونوں اپنے اپنے گھر پہونچ گئے، تو صدیق اکبرؓ کے ضمیر صادق نے اس پر ملامت کی کہ تو نے کیوں سخت کلامی سے کام لیا؟ صبر وضبط کو ہاتھ سے کیوں چھوڑ دیا؟ قلب کے اس مواخذہ سے آپ بے چین ہو گئے، اتنے مضطرب اور بے چین کہ فوراً گھر سے نکلے اور عمر فاروقؓ کے دروازہ پر پہونچے، اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی کی درخواست کی، عمر فاروقؓ پر ابھی ان باتوں کا طبعی اثر باقی تھا، فرمانے لگے۔ میں نہیں معاف کرونگا یہ جواب سننا تھا کہ صدیق اکبرؓ کی بے چینی اور بڑھ گئی پریشان و بے تاب ہو گئے کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی بجز اس کے کہ وہ سیدھے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ عالی میں پہونچ کر اپنے مقدمہ کو آپ کے سامنے پیش کر دیں، چنانچہ سیدھے چلے آئے، عرض کیا حضورؐ! مجھ سے ایسی خطا ہوگئی، مجھے اپنی زیادتی کا اقرار ہے مگر میرے دوست عمرؓ کو معافی سے انکار

ہے۔ادھر حضرت عمرؓ کو بھی خود اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ حضرت ابو بکرؓ کی تلاش میں نکلے۔[1]

پورا واقعہ اپنی جگہ قابل مطالعہ واستفادہ ہے، مجھے صرف اسی پہلو کو پیش کرنا تھا کہ اپنے دوست کے ساتھ ایک معمولی سی زیادتی پر صدیق اکبرؓ کس قدر بے چین ہو جاتے ہیں، اور اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک کہ ان سے معافی مانگ کر انہیں خوش نہیں کر لیتے، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ دنیا دار العمل ہے اس کے بعد ایک دوسرا عالم سامنے آنے والا ہے جو "دار الجزاء" ہے، جس میں ہر صاحب حق کو اس کا حق دلانے کا بے مثال انتظام کیا گیا ہے، اور اگر کسی صاحب حق کا حق صاف یا معاف کرنے سے رہ گیا تو زندگی بھر کی کمائی کہیں لٹ نہ جائے۔

اللہ اکبر! کیا ٹھکانہ ہے خوف خدا اور تعلق مع اللہ کا! اسکے برخلاف ایک ہم ہیں کہ صبح وشام ہزاروں قسم کی زیادتیاں، صریح مظالم وحق تلفیاں کرتے چلے جاتے ہیں، موذی درندوں کی طرح جی رہے ہیں، اس قدر خود غرض بن گئے ہیں کہ اپنے حقوق لڑلڑ کے حاصل کرتے ہیں، مگر کبھی بھول کر دوسروں کا حق ادا کرنے یا معاف کرا لینے کا خیال نہیں ہوتا، آپس میں اپنے ساتھیوں سے معافی تلافی کر لینا، اور بڑوں کا اپنے چھوٹوں سے معاملہ صاف کر لینا تو کجا، چھوٹے آج بڑوں کے آگے جھکنے تیار نہیں ہیں، اولاد ماں باپ سے، مریدین پیر سے، تلامذہ اساتذہ سے معافی مانگنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھنے لگے ہیں، کبھی خیال بھی آتا ہے تو ہر شخص دوسرے کی پہل کا منتظر رہتا ہے۔اخلاق کی یہ پستی سوچئے کہ عقیدہ آخرت کی کمزوری اور ضعف ایمان کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے؟

اب میں آپ کے سامنے اس سلسلہ کی ایک آخری مثال پیش کرنے جارہا ہوں جس کے بعد اس سلسلہ میں مزید خامہ فرسائی کی کوئی حاجت باقی نہیں رہ جاتی

[1] تاریخ الخلفاء: ص:۶۱ بحوالہ بخاری عن ابی الدرداء

بلکہ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون ہی اس روایت پر ختم ہو جاتا ہے۔

بخاری و مسلم نے سیدنا حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ دعا میں یوں فرمار ہے تھے۔

**اللّٰھم انی اتخذ ت عند ک عھدا لن تخلفنیه فانما انا بشر فای المؤمنین اذیته شتمته لعنته جلدته فاجعلها له صلوٰۃ و زکوٰۃ و قربة تقر به بھا الیک**[۱]

اے اللہ! میں آپ سے ایک وعدہ لیتا ہوں (مجھے یقین ہے کہ) آپ ہرگز اسکے خلاف نہیں فرماوینگے (وہ یہ ہے کہ چونکہ) میں ایک بشر ہوں (اوراس تقاضے سے کسی وقت احیانا) اگر میں نے کسی مسلمان کو تکلیف پہونچائی ہو، یا برا بھلا کہا ہو، یا لعنت وملامت کی ہو، یا مارا ہو، تو ان عملوں کو اس مسلمان کے حق میں باعث رحمت وتزکیہ بنا دیجئے اور ایسی قربانی بنا دیجئے جسکے ذریعہ وہ آپ کے قربِ خاص کا مستحق ہو جائے۔

اللہ اللہ! کیا ٹھکانہ ہے اس شان بندگی کا، اور کیا انتہا ہے اس ترحم علی امتہ کی؟ آپ سوچ سکتے ہیں وہ رحمت مجسم اور سراپا شفقت وکرم جس نے خون کے پیاسوں اور جان کے دشمنوں تک کے خلاف زبان نہیں کھولی، جس نے سنگباری کر کے سر سے پیر تک لہولہان کر دیا تھا ان کے حق میں بھی بجز دعائے ہدایت کے اور کچھ نہیں فرمایا، وہ ذات کیا کسی مسلمان پر زبان یا ہاتھ سے کوئی زیادتی فرما سکتی ہے؟ پھر اسکے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اپنی بشریت (قارئین سے گذارش ہے کہ نفس مضمون سے استفادہ فرماویں۔) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کو اپنی بشریت پر قیاسِ فاسد کر کے غیر ضروری الجھاوے میں نہ پڑیں کہ ؎ کارِ پاکاں را بر خود قیاس مگیر) کے احساس نے کسی مسلمان کی درجہ میں کوئی تکلیف پہونچنے کا احتمال بدرجہ

۱؎ مشکوٰۃ شریف: ص: ۱۹۲

احتمال ذہن مبارک میں پیدا کر دیا تھا کہ اسی کے اثر سے اس کی تلافی محسن انسانیت وشرف آدمیت نے اس عجیب طریقہ سے فرمائی کہ اسے بھی اس امتی کے لئے تزکیہ معاصی وتقرب بارگاہ الٰہی کا سامان بنا دیا۔ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ امت کو اپنے عمل سے آپ ؐسبق سکھانا چاہتے تھے کہ حقوق العباد کا معاملہ اس قدر حساس اور نازک معاملہ ہے کہ میں نبی بلکہ امام الانبیاء وافضل المرسلین اور رحمت عالم وعالمیان ہو کر اتنی فکر واحتیاط کرتا ہوں تو تم غریقان بحر معصیت وخفتگان فرش غفلت کو کتنا اہتمام والتزام اس کی صفائی کا ہونا چاہئے۔

ویسے صاحب مرقاۃ ملا علی قاریؒ نے اس روایت کے ذیل میں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام سے باہر تشریف لے جا رہے تھے اتنے میں حضرت صدیقہ عائشہؓ نے آپ کو روک لیا، اور کسی ضرورت کی فرمائش کرنے لگیں، اور اس خوف سے کہ کہیں آپ چلے نہ جائیں، آپ کا دامن مبارک پکڑ لیا، آپ کی زبان مبارک سے اس وقت یہ الفاظ نکل گئے "**قطع اللّٰہ یداک**" اس پر انہوں نے چھوڑ دیا اور آپ تشریف لے گئے۔ پھر جب لوٹ کے آئے تو آپ نے دیکھا کہ صدیقہ عائشہ ؓ روٹھی ہوئی اور غمگین بیٹھی ہیں۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ آپ کے کلمات "**قطع اللّٰہ یداک**" سے غمگین اور خوف زدہ ہیں اسی موقعہ پر آپ نے ان کے قلب کی تسلی واطمینان کے لئے مذکورہ دعا فرمائی، بہر حال سبب اور واقعہ جو بھی ہو یہ دعا ہماری غفلت کا پردہ چاک کرنے اور حقوق العباد کا شعور بیدار کرنے کے لئے کافی ہی نہیں بہت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی ہمارے حال پر رحم فرماویں، اور غفلت وسنگدلی کا خاتمہ فرماویں۔ آمین

# تہذیب نفس وتصحیح اخلاق

یہ ایک بدیہی اور ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس زمانے میں دین کا تصور صرف اسکے ایک پہلو یعنی" طاعات وعبادات" تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، دوسرا پہلو جس میں ترک معاصی ومنکرات اور تہذیب نفس وتصحیح اخلاق وغیرہ شامل ہیں اس کو اب عملاً وفکراً ہر طرح یا تو بالکل فراموش کر دیا گیا ہے، یا اس سے تجاہل عارفانہ برتا جا رہا ہے، عام طرز عمل سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس دوسرے پہلو کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، حالانکہ ایک حیثیت سے یہ پہلو پہلے والے پہلو پر زیادہ اہمیت وفوقیت رکھتا ہے، کیونکہ منکرات ومعاصی کی موجودگی طاعات کے اثرات وثمرات کو باقی رہنے نہیں دیتی۔

اس وقت میرے سامنے حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کا رسالہ" **ادب المسلم فی الیوم واللیلة** "ہے۔دورانِ مطالعہ یہی مضمون" **القول فی اجتناب المعاصی** " کے تحت عنوان نظر سے گذرا، امام صاحبؒ نے اپنے ممتاز اصلاحی اسلوب، اور مؤثر انداز بیان، پھر الفاظ کے سفینے میں ان کے درد دل کے خزینے نے اس مضمون کی چند سطروں میں وہ تاثیر پیدا کی ہے کہ لمبی لمبی تقریروں سے بے نیاز کر دے اور سنگ دل سے سنگ دل انسان بھی کچھ نہ کچھ اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکے، امامؒ کے اسی مضمون کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں" حاصل مطالعہ" کے طور پر ذیل میں پیش کر رہا ہوں، اس امید پر کہ اللہ کا کوئی بندہ اس کا صحیح اثر قبول کر لے تو میرے لئے بھی باعث ثواب ونجات ہو، وہ فرماتے ہیں:

احکام دین اصولی پر دو حصوں میں منقسم ہیں، ایک "اوامر" یعنی کرنے کے کام دوسرے "نواہی" یعنی چھوڑنے کے کام۔ان دونوں میں باعتبار عمل کے "ترک مناہی" یعنی منع کی ہوئی چیزوں اور عادتوں کا چھوڑنا عام طور سے ذرا مشکل اور مجاہدہ کا کام ہے، کیونکہ آدمی لئے نیکیوں کا اختیار کرنا طبعی طور پر سہل اور آسان ہوتا ہے، برخلاف مناہی ومعاصی کو ترک کرنے کے کہ اس مسئلہ پر اکثری اعتبار سے صرف اللہ کے خاص بندے ہی قدرت وقابو حاصل کر پاتے ہیں۔اسی لئے سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "حقیقی مہاجر وہ ہے جو برائی کے کاموں سے ہجرت کرے یعنی ان سے اجتناب اور احتیاط کرے۔اور حقیقی مجاہد وہ ہے جو اپنی خواہشات نفس سے جہاد کرے یعنی ان کا مقابلہ کر کے ان کے تقاضے پر عمل سے باز رہے" اس حدیثِ پاک سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ منکرات ومعاصی کا چھوڑنا نہایت ضروری کام اور عظیم عمل ہے، وہیں یہ بھی پتہ چلا کہ یہ قیمتی دولت حوصلہ اور مجاہدہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔اگرچہ منکرات وشہوات پر قابو پانا اور ان سے جان چھڑانا نصف دین کی تکمیل ہے مگر چونکہ گناہوں کے کرنے میں ایک گونہ لذت حاصل ہوتی ہے اور ان کا چھوڑنا نفس پر بہت شاق وناگوار ہوتا ہے، اس لئے آدمی ان کے ترک کی جانب زیادہ توجہ نہیں دیتا معتد بہ مجاہدہ کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔اسی وجہ سے بہت سے لوگ طاعات وعبادات میں قابل لحاظ بلکہ بسا اوقات قابل رشک وفخر مشغولی کے باوجود گناہوں کی حرام لذت میں بھی مبتلاء دکھائی دیتے ہیں۔خصوصاً ان سات اعضاء یعنی آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پیر، پیٹ، اور شرمگاہ، کے ذریعہ صادر ہونے والے گناہوں سے بہت کم لوگ محفوظ رہتے ہیں جبکہ اکثر گناہوں کا صدور انہی اعضاء سے ہوتا ہے، یہ وہ نعمتیں ہیں جنہیں اللہ رب العزت نے آخرت کی تیاری اور اپنی جائز ضرورتوں میں استعمال کرنے کے لئے بطور امانت کے انسان کو عطا فرمایا

تھا، انہیں غلط استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا جاتا ہے، شاید اسی وجہ سے جہنم کے بھی سات دروازے بنائے گئے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**لھا سبعة ابواب لکل باب منھم جزء مقسوم**" جہنم کے سات دروازے ہیں، ہر دروازہ کا حصہ مقرر ہے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے بعد یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ گنا ہوں اور نافرمانیوں کی نحوست سے اپنے آپ کو بچانا اگر چہ مشکل کام اور نفس پر بہت بار ہے لیکن عملاً ناممکن بھی نہیں، اس لئے کہ اگر یہ کام آدمی کے تحمل سے زائد اور اسکی قدرت سے باہر ہوتا تو حق تعالیٰ اپنے بندوں کو اس کا مکلّف نہ بناتے، ہاں اس کے لئے عزم کی پختگی اور حوصلہ کی بلندی کو استعمال کرنیکی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آدمی ان خداداد صلاحیتوں سے کام لینا شروع کر دے تو وہ ضرور نفس اور اس کی بے جا خواہشات پر قابو پا سکتا ہے۔ چنانچہ اللہ کے نیک بندے اسی راستہ سے یعنی انہی صلاحیتوں کو استعمال کر کے اپنے آپ کو مناہی و معاصی کی ذلت سے دور رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ہمت و عزم کے استعمال کے ساتھ ساتھ دو چیزیں اور ہیں جن میں غور کرتے رہنا اور ان کا استحضار رکھنا اس مقصد کی کامیابی میں بہت ہی مددگار ثابت ہوتا ہے۔

(۱) یہ غور کرنا کہ میں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کر رہا ہوں وہ انہی اعضاء وجوارح کے ذریعہ کر رہا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے کرم سے مجھے عطا فرمائے ہیں، ارشاد ہے: "**وما بکم من نعمة فمن اللّٰہ**" اور بطور امانت عطا فرمائے ہیں، یہ اعضاء میری ملکیت نہیں ہیں۔ پس کیسی ناشکری اور ناقدری کی بات ہے کہ کسی محسن کے انعامات واحسانات کو اسی کی نافرمانی اور ایذاء رسانی میں استعمال کر کے احسان فراموشی اور دغابازی کا ثبوت دیا جائے۔ نیز جب یہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی

طرف سے میرے پاس محض ایک امانت ہیں تو ایسی کریم ورحیم ذات کی امانت میں خیانت کرنا کس قدر کمینگی اور گندگی کی حرکت ہے۔خصوصاً جب کہ ان تمام نعمتوں کے بارے میں قیامت کے دن مواخذہ اور مطالبہ بھی ہوگا۔

(۲) یہ مراقبہ کرنا کہ نصوص قطعیہ سے یہ بات ثابت ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام اعضاء جسمانی کو ایسی قوت گویائی عطا فرمادینگے جس سے وہ پوری فصاحت وبلاغت کے ساتھ برسرِ محشر آدمی کے کرتوتوں کی شہادت پیش کردینگے۔ارشادِ ربانی ہے: **يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ الخ ۔ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَى اَفْوَاهِهِمْ الخ** وغیرہ آیات اس پر دال ہیں، تو جب میرے اعضاء ہی میری ان بری حرکتوں اور گناہوں پر اپنی زبان سے گواہی پیش کرینگے اور میرے خلاف حجت بن جائیں گے تو اس وقت مخلوق خدا کے سامنے میری کیسی گت بنے گی؟ اور کس قدر فضیحت ورسوائی کا سامنا ہوگا؟ غرض ان امور میں غور کرنے سے خصوصاً گناہ کے تقاضہ کے وقت ان کا استحضار رکھنے سے امید قوی ہے کہ آدمی اپنے جذبہ معصیت پر بڑی حد تک قابو پالیگا۔اور طاعات وعبادات کی طرح ترک معصیات ومنہیات بھی اس کے لئے سہل اور خوشگوار امر بن جائینگے۔

اللہ تعالی ہم سب کو اپنی نافرمانیوں سے بچنے کی ہمت اور اس کا حوصلہ نصیب فرمائے آمین

نوٹ: اس مضمون میں اصل مواد امام غزالیؒ کا ہے اور ترتیب وتعبیر راقم کی ہے۔کیونکہ ان کی مختصر عبارت کا محض ترجمہ عام قارئین کے لئے مفید مطلب نہیں ہوتا۔

# آج بھی ہو جو براھیم کا ایماں پیدا !

اللہ تعالیٰ کی آزمائشوں سے سب سے زیادہ انبیاء و رسل دوچار ہوتے ہیں، وہ جس قدر امتحانات سے گذرتے ہیں کوئی اور نہیں گذرتا، قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر حالات پیش آتے رہتے ہیں، پھر وہ ان آزمائشوں میں بفضلِ الٰہی ثابت قدمی اور صبر و استقامت کے پیکر بھی ثابت ہوتے ہیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ انھیں مزید ترقیات وتقربات سے نوازتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اسی سنتِ جاریہ کے مطابق سیدنا ابراھیم علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ آزمایا اور وہ ہر امتحان میں صد فی صد کامیاب ہوتے رہے، جس کے انعام میں اللہ تعالیٰ نے انھیں قوم وملت کی امامت کا مقام عطا فرمایا، "اِنِّــــیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَاماً " ان کے امتحانات میں سب سے کٹھن اور بڑا ہی اہم امتحان اپنے لختِ جگر کے سلسلہ میں ہوا، جو اسلامی تاریخ کا ایک سنہرا باب اور قربانی کی اساس اور بنیاد ہے، اسی واقعہ سے قربانی کی حقیقت و اہمیت اور تقرب الی اللہ کا درس وابستہ ہے، اور کامیابی وکامرانی کا راز اسی میں مضمر ہے، اسی لئے یہاں اختصار کے ساتھ اُسے ذکر کیا جارہا ہے۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام کی بڑی اہلیہ حضرت سارہؓ تھیں، لیکن چھیاسی برس کی عمر تک بھی ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی، ادھر حضرت ابراھیم علیہ السلام کو اولاد کی چاہت بھی تھی اور ضرورت بھی، وہ دعا فرمایا کرتے تھے رَبِّ ھَبْ لِیْ مِنَ الصَّالِحِیْنَ یعنی "اے اللہ! مجھے نیک اولاد عطا فرما" ان کی اہلیہ حضرت سارہؓ

نے ان کی اس خواہش وتمنا کو دیکھ کر اور اپنے ذریعہ سے اولاد پیدا ہونے کے توقع سے مایوس ہوکر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا یہ اسکی حکمت ومشیت ہے! یہ میری خادمہ ہاجرہؑ ہے یہ میں آپ کو ہبہ کئے دیتی ہوں ممکن ہے اللہ پاک اس کے ذریعہ آپ کو اولاد عطا فرمائے۔

چنانچہ حضرت ابراھیمؑ نے ان سے نکاح فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ آپ کو اولاد بھی عطا فرمائی، اپنے اس بیٹے کا نام آپ نے "اسماعیل" رکھا، ابھی یہ لڑکا شیر خوار ہی تھا کہ اللہ رب العزت نے انہیں مکہ مکرمہ کی اسبے آب وگیاہ سرزمین پر —— جہاں کوئی ایک جاندار بھی نہیں رہتا تھا —— اس لڑکے کو اور اس کی والدہ کو چھوڑ آنے کا حکم دیدیا۔ حسبِ ہدایت آپ انہیں لیکر اس لق ودق صحرا میں پہونچے اور دونوں کو وہاں چھوڑ دیا، ساتھ میں ایک جھولی میں کچھ کھجوریں اور ایک مشکیزہ میں پانی دے دیا، کیونکہ اس علاقے میں نہ کوئی درخت تھا اور نہ ہی پانی کا دور دور تک کہیں پتہ تھا، جب آپ انھیں چھوڑ کر واپس لوٹنے لگے تو سیدہ ہاجرہؑ نے عرض کیا کہ آپ مجھے اور اس معصوم کو اس بے آب وگیاہ میدان میں —— جہاں کوئی مونس ہے نہ غمخوار —— کیوں چھوڑ کے جارہے ہیں؟ حضرت ابراھیمؑ نے اس خیال سے کہ کہیں ان کی محبت تعمیلِ حکم میں رکاوٹ نہ بن جائے، ان کی جانب بالکل التفات نہ فرمایا، یہاں تک کہ حضرت ہاجرہؑ نے خود پوچھا: کیا اللہ پاک کا حکم ہے؟ فرمایا: ہاں! عرض کرنے لگیں: تب تو آپؑ بے فکر رہیں مجھے بھی اطمینان ہوگیا کہ جب اس نے حکم دیا تو وہی ہماری حفاظت فرمائے گا اور اللہ پاک ہمیں ضائع نہ فرمائیگا اس طرح حضرت ابراھیمؑ اطمینان کے ساتھ حکمِ رب کی تعمیل کر کے واپس فلسطین پہونچ گئے۔

پھر حضرت اسماعیلؑ جب ذرا ہوشیار ہوئے تو حضرت ابراھیم علیہ السلام نے

ایک خواب دیکھا جس کا حاصل یہ تھا کہ انہیں اپنے بچے کو ذبح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ــــــانبیاء کا خواب چونکہ وحی الٰہی کی ایک صورت ہے اور واجب العمل ہے، اسلئے حضرت ابراھیم علیہ السلام نے تعمیلِ حکم کا ارادہ فرمالیا ـــــــ اور اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لئے ان سے فرمایا: بیٹا! میں نے خواب میں یہ دیکھا کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں، تم بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے؟ **یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَریٰ فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَریٰ** صالح بیٹے نے فوراً عرض کیا: ابا جان! آپ کو جو حکم ملا ہے اسے کر گذرئے اور جہاں تک میرا ساتھ دینے کا معاملہ ہے تو انشاء اللہ مجھے آپ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ **یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَاتُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْشَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰابِرِیْنَ** سیدنا ابراھیمؑ نے جب سعادتمند بیٹے کے اس سعادت مندانہ اور فرماں بردارانہ جواب کو سنا تو بہت مطمئن اور خوش ہوئے اور انہیں لیکر منیٰ کی وادی میں تشریف لے گئے، بیٹے کو زمین پر کنپٹی کے بل لٹا دیا، جیسے جانوروں کو ذبح کے لئے لٹا دیا جاتا ہے، پھر چھری نکال کرانہیں ذبح کرنے کا ارادہ فرمایا، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس حکم سے صرف ان کی عبدیت کی آزمائش مقصود تھی اور وہ ہو چکی تھی۔اسلئے اللہ تعالیٰ نے چھری کو اسماعیلؑ کا گلا کاٹنے سے روک دیا، اور ان سے ارشاد فرمایا: **یَآ اِبْرَاھِیْمَ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا** اے ابراھیمؑ! تم نے خواب سچا کر دکھایا، یعنی تکمیل حکم کر دی۔ ہمارا منشاء بیٹے کو ذبح کروانا نہیں تھا، بلکہ تمہارے جذبہ ایثار و قربانی کا مشاہدہ کرنا تھا، سو وہ ہو چکا۔اب جنت سے یہ دنبہ بھیجا جا رہا ہے، اس کو اسماعیلؑ کے بدلے میں ذبح کر دو، حضرت ابراھیمؑ نے پلٹ کر دیکھا تو ایک سفید رنگ کا فربہ بکرا موجود تھا، آپ نے حضرت اسماعیلؑ کے عوض اسے ذبح فرما دیا، حق تعالیٰ نے فرمایا اب ہم اس رسمِ ایثار و قربانی کو قیامت تک کے لئے جاری کئے دیتے ہیں، اور تم پر سلامتی اُتارتے ہیں، **تَرَکْنَا عَلَیْہِ فِی الْاٰخِرِیْنَ سَلَامٌ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ** نیز ہم ہر مطیع و فرمانبردار اور

نیکوکار بندے کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ كَذَا لِكَ نَجْزِيُ الْمُحْسِنِيُنَ چنانچہ اس زمانہ سے آج تک ان کی ملت ایامِ تشریق میں خوب ذوق وشوق کے ساتھ اس رسمِ قربانی کو انجام دیتی چلی آرہی ہے۔

یہ ایک مختصر سا سرسری خاکہ ہے جو قربانی کی عظیم تاریخ کے پس منظر کو واضح کرنے کے لئے نقل کر دیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ قربانی محض جانور کے قربان کرنے یا گوشت خوری کا نام نہیں بلکہ تقربِ خداوندی اور رضائے الٰہی کے حصول کیلئے اپنی تمام خواہشوں اور تمناؤں کو قربان کرنے اور بارگاہِ احدیت میں فدارکارانہ جذبۂ قلبی کے ساتھ نذرانۂ عبودیت پیش کرنے کا نام ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے بطور خاص اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانُحَرُ آپ اپنے رب کیلئے نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے۔

حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ قربانیاں کیا ہیں؟ (یعنی ان کی اصل کیا ہے) آپؐ نے ارشاد فرمایا: تمہارے باپ ابراھیمؑ کی سنت ہے، صحابہؓ نے پوچھا: اس پر عمل کرنے میں ہمارے لئے کیا ثواب ہے؟ آپ نے فرمایا: ہر بال کے بدلے ایک نیکی ہے، پوچھا گیا: اون کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اون کے بھی ہر بال کے عوض ایک نیکی ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی عمل قربانی کے دنوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربانی سے زیادہ پسندیدہ نہیں ہے اور یہ قربانیاں قیامت کے دن اپنے سینگوں اور بالوں اور کھروں کیساتھ لائی جائیں گی اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے پاس مقبول ہوجاتا ہے، پس دل کی خوشی سے قربانیاں کیا کرو۔

مذکورہ دونوں احادیث اور اس سلسلہ کی دیگر احادیثِ مبارکہ میں ذکر کئی گئیں فضیلتیں یعنی قربانی کا سنتِ ابراھیمی ہونا، ہر بال کے عوض ایک نیکی کا ملنا، اور قطرۂ خون زمین پر گرنے سے پہلے عند اللہ مقبول ہو جانا وغیرہ، یہ اس وقت معتبر ہیں جبکہ قربانی کا عمل اخلاص کے ساتھ انجام دیا گیا ہو، اگر قربانی خلوص اور رضائے رب کی طلب سے خالی ہو تو پھر اس قربانی کی حیثیت خون بہانے کے سوا کچھ نہ رہے گی، اور ایسی قربانی سے نہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوگا اور نہ قربانی کرنے والا کسی اجر و ثواب کا مستحق ہوگا، بلکہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہونے کے باوجود اس کے حق میں بے وزن و بے وقعت ہو کر رہ جائے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو قربانی کا نہ گوشت مطلوب ہے اور نہ ہی پوست، بلکہ اس کا منشا بندوں کے قلوب میں تقویٰ اور اخلاص کی آزمائش ہے، جیسا کہ اس کا پاک ارشاد ہے: **لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآئُهَا وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُم** اللہ تعالیٰ کے پاس ان قربانیوں کا نہ گوشت پہنچتا ہے نہ خون بلکہ تمہارا تقویٰ (اور اخلاص) پہو نچتا ہے۔

اخلاصِ عمل کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ قربانی دل کی خوشی سے ہو، دل پر بوجھ ڈال کر اور شکستہ خاطر ہو کر قربانی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر کوئی صاحبِ استطاعت جس پر قربانی واجب ہو وہ قربانی نہیں کرتا تو ایسا شخص اللہ اور اسکے رسول کے نزدیک مبغوض و ناپسندیدہ ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت ہے جس میں تارکینِ قربانی کیلئے آپ ﷺ کا یہ سخت ترین ارشاد ہے کہ "جو شخص گنجائش رکھنے کے باوجود قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے"۔ اس لئے ہر صاحبِ استطاعت کو چاہیے کہ قربانی جیسے قیمتی عمل کو دل کے ذوق و شوق کے ساتھ بجالائے، اور اس کا تارک نہ بنے تا کہ اس سخت وعید سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔

بہر حال! قربانی کی حقیقت و روح اللہ کی خاطر غیر اللہ سے قلب کو پاک کر لینا

اور اپنی جان و مال، اولاد و خواہشات تمام چیزوں کو آقا و مالک کی مرضیات کے تابع بنا لینا ہے۔اس لئے حضرت ابراھیم علیہ السلام کی اس عظیم قربانی کے تاریخی پس منظر کے موقعہ پر جہاں ہم جانوروں کا خون بہا کر بارگاہِ رب العزت میں اپنی وفاداری و جان نثاری کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔آیئے ہم اسی موقعہ پر حق تعالیٰ سے تمام بدعات وخرافات اور ایسے رسوم ورواج —— جو غیر شرعی ہونے کے علاوہ سماج کے لئے وبال بھی ثابت ہو چکے ہیں —— کی قربانی کا وعدہ کرلیں، اور یہ بھی کہ پوری زندگی قرآن وسنت کے موافق گذارنے کے لئے کسی بھی طرح کی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہ کریں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عمل عطا فرمائے۔آمین برحمتک یاارحم الراحمین

# طاعون رحمت بھی عذاب بھی!

۲۲ر ستمبر ۱۹۹۳ء وہ تاریخ ہے جس میں صوبہ گجرات کے مشہور صنعتی شہر "سورت" میں طاعونی مرض "پلیگ" کے پھیلنے کی اطلاع پورے ملک کے اخبارات نے دی۔ اس سے چندروز قبل حکومت کے ارباب اقتدار "لاتور" کے زلزلہ سے متاثرہ علاقوں میں چوہوں کی کثرت پر تشویش ظاہر کر رہے تھے۔ اندیشہ کہاں کے لئے کیا جارہا تھا، حادثہ کہاں پیش آیا؟ یہ حادثہ ان لوگوں کے لئے نہایت حیرت کا سبب ہوگیا جن کی نظر و فکر مظاہر کے پردوں میں مخفی حقائق کو تلاش کرنے سے عاجز ہے۔ کہتے ہیں کہ طاعون ان پسوؤں کی وجہ سے عام ہوجاتا ہے جو چوہوں کے جسم سے چمٹے اوران کا خون چوستے رہتے ہیں، جسم میں خون کم ہوجانے کی وجہ سے ان چوہوں کی موت ہوتی رہتی ہے، اور کبھی ان چوہوں کا یہ مرنا اتنی کثیر تعداد میں ہوتا ہے کہ پسو انہیں چھوڑ کر آدمیوں کی جانب متوجہ ہوجاتے ہیں۔ پھر یہ مرض جنگل کی آگ کی طرح پورے پورے علاقہ کو اپنے ظالم شکنجوں میں اس طرح کس لیتا ہے کہ اسکے اثر سے جان کو بچا کر نکال لینا علی العموم ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایسے موقع پر انسانی جانیں بےحساب ضائع ہوجاتی ہیں۔

"طاعون" ایک قدیم مرض ہے اس کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ طاعون ایک عمومی مرض اور خطرناک وباء ہے۔ جو آب وہوا کو مسموم اور مکدر کردیتا ہے، پھر یہ آب وہوا انسانی مزاجوں اور بدن کو متاثر کردیتی ہے۔[1]

[1] مرقاۃ: ۸۵۳/۸

علامات اس کی یہ بتلائی جاتی ہیں کہ بخار شدید ہوجاتا ہے اور مدافعت کی قوت گھٹ جاتی ہے، بغل میں یا کہیں گلٹی نکل آتی ہے، پھر ہلاکت سے بچنا مشکل ہوجاتا ہے، یہ گلٹی کبھی سرخ، کبھی سبز، کبھی سیاہ ہوتی ہے، مرض کی نوعیت کے اعتبار سے طاعون کی متعدد قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وباء خدا تعالیٰ کے فرمانبرداروں کے حق میں ایک رحمت ہے، اور نافرمانوں اور منکروں کے لئے قہر الٰہی ہے۔ جیسا کہ امام بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے متعلق دریافت کیا تھا کہ یارسول اللہ! ﷺ طاعون کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا "وہ پہلے اللہ تعالیٰ کا عذاب تھا، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے اس بلاء بے درماں کے ذریعہ عذاب دیتے تھے، پھر اس کو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے حق میں رحمت بنادیا، پس اگر کہیں یہ وبا عام ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کا جو مومن بندہ ایمان واحتساب اور رضا بالقضا کیساتھ وہیں مقیم رہا، اللہ تعالیٰ اس کو شہادت کا مرتبہ عطا فرماتے ہیں[۱]

حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے عذابِ الٰہی کی شکل میں واقع ہونے کی مختلف تاریخی نظیریں بیان کی ہیں مثلاً "بلعام باعوراءؒ" کا واقعہ

مشہور ہے کہ وہ مستجاب الدعوات اور خاصانِ خدا میں سے تھا، جب موسیٰ علیہ السلام نے حکمِ الٰہی سے اس کے علاقہ پر چڑھائی کی تو اس کی قوم نے اس سے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے لشکر پر بددعا کرنے کی درخواست کی، اس نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ وہ حکمِ الٰہی سے تشریف لا رہے ہیں، لوگوں نے اصرار بھی کیا مگر وہ نہ مانا، پھر قوم نے ایک دوسری چال چلی اور نہایت بیش قیمت تحائف وہدایا اس کی خدمت میں پیش کئے تو اس نے اپنی بیوی کی حرص ولالچ

[۱] بخاری شریف: ۶/ ۱۷۰

میں یہ ہدایا قبول کر لئے ۔ ہدیے قبول کر لینے کے بعد جو اصرار اور دباؤ کا سلسلہ بڑھا تو اس سے انکار کی ہمت نہ ہو سکی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے بد دعا کا ارادہ کر لیا جب وہ بد دعا کر رہا تھا تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ اس کی زبان سے موسیٰ علیہ السلام کے بجائے اپنی قوم کے حق ہی میں بد دعا نکل رہی تھی، وہ سمجھ گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قہر ہے، اور قوم سے کہنے لگا میں تو بارگاہِ الٰہی میں مردود ہو ہی گیا، اب تمہیں ایسی ترکیب بتلاتا ہوں جس پر عمل کرنے سے قومِ موسیٰ (علیہ السلام) بھی عذابِ الٰہی کا شکار ہو جائے گی ۔ وہ ترکیب یہ ہے کہ شہر کی خوبصورت دوشیزاؤں کو نہلا دُھلا کر خوب سنوار کر اور اچھی طرح ٹرینڈ کر کے حضرت موسیٰؑ کے لشکر میں بھیج دو اور انہیں تاکید کر دو کہ اگر کوئی مسلمان سپاہی رغبت ظاہر کرے اور پھسلانے لگے تو ہرگز انکار نہ کریں، چنانچہ انہوں نے اس کا انتظام کر دیا ۔ ادھر موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ سازش کا پتہ چل گیا تو انھوں نے اپنی قوم کو دشمن کے اس دامِ تزویر و تلبیس سے خبر دار کرتے ہوئے اس میں نہ پھنسنے کی سخت تاکید فرما دی، سب مسلمان اس آزمائش سے ہوشیار اور چوکنا رہے مگر "زمری" نامی ایک شخص اپنی حفاظت نہ کر سکا اور اس قوم کی شہزادی جس کا نام "کشتا" تھا اس کے پھسلانے میں آ کر اسے اپنے کیمپ میں لے گیا اور برائی میں ملوث ہو گیا، بس اسی وقت حق تعالیٰ شانہ نے طاعون کی شکل میں اپنا عذاب نازل فرما دیا ۔ جس کا اثر اس قدر تیز رفتار اور خطرناک تھا کہ صرف ایک دن میں چوبیس ہزار مسلمان ہلاک ہو گئے ، اور یہ سلسلہ بڑھتا ہی رہا یہاں تک کہ "فخناس بن ہارون" نامی ایک مسلم سردار نے دونوں بدکاروں کو نیزہ مار کر ختم کر دیا، اس کے بعد یہ عذاب رفع ہوا اور نصرتِ الٰہی نازل ہوئی ۔

اسی طرح ایک دفعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ آپ کی امت میں گناہوں کی بہتات و کثرت ہو گئی ہے ، میں ان پر عذاب بھیجنے والا ہوں البتہ اس عذاب کے سلسلہ میں انہیں اختیار دیتا ہوں کہ تین صورتوں میں سے ایک کا

انتخاب کرلیں۔ یا تو دو ماہ تک قحط میں مبتلاء کئے جائیں گے۔ یا اتنی ہی مدت تک ان پر دشمن مسلط کیا جائیگا یا پھر تین روز تک طاعون کا سامنا کرنا ہوگا۔ انہوں نے اس معاملہ کو حضرت داؤد علیہ السلام ہی پر چھوڑ دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے سہ روزہ طاعون کو ترجیح دی۔ چنانچہ طاعون کی شکل میں عذاب الٰہی آیا یہ طاعون ایسا خوفناک اور زود اثر تھا کہ ایک لاکھ نفوس اسی دن زوالِ آفتاب سے پہلے پہلے موت کا لقمہ بن گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو انسانوں کی اس ہلاکت پر بہت ترس آیا۔ سجدہ میں گر گئے، خوب گڑگڑایا تا آنکہ اللہ پاک نے ان کی دعا سن لی اور اپنے اس قہر کو رفع فرمالیا۔

نیز قرآن مجید کی آیت "لَئِنۡ كَشَفۡتَ عَنَّا الرِّجۡزَ لَنُؤۡمِنَنَّ لَكَ الاية" کے تحت (جس میں فرعون کا مقولہ ذکر کیا گیا ہے کہ اے موسیٰ! آپ اپنے رب سے ہمارے لئے دعا فرمایئے اگر یہ عذاب جو آیا ہوا ہے رفع ہوجائے تو ہم آپ پر ایمان لائیں گے۔ اور بنی اسرائیل کو آپ کے ہمراہ بھیج دینگے)۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ رجز سے مراد طاعون ہی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے قبطیوں پر بھیجا تھا اور یہ طاعون بھی ایسا خطرناک تھا صرف ایک دن میں اس نے ستر ہزار دشمنانِ خدا و رسول کو کھالیا تھا۔[1]

اس امت میں بھی وقتاً فوقتاً طاعون کی وباء پھیلتی رہی ہے۔ چنانچہ ۱۸ھ یعنی عہدِ فاروقی کے دوران ملک شام میں طاعون پھیلا تھا، جو تاریخ میں "طاعون عمواس" کے نام سے مشہور ہے۔ اسیطرح حضرت زبیر ابن العوامؓ جب مصر پہونچے تو وہاں بھی طاعون پھیلا ہوا تھا۔ گذشتہ دو صدیوں کے دوران بھی طاعون کے بڑے بڑے حملے ہوئے ہیں، ۱۶۶۴ء میں انگلینڈ کے شہر لندن میں ایک خطرناک طاعون نے ستر ہزار آدمیوں کی جان لے لی تھی۔ اس کے کوئی ڈیڑھ سو سال بعد

---

[1] فتح الباری: ۱/ ۱۲۸

۱۸۹۴ء میں ہانگ کانگ میں طاعون پھیلا اور ایک لاکھ نفوس کو ہضم کر گیا۔اس سال کے متصل بیس برسوں میں دنیا بھر کے اندر اس مرض سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد ایک کروڑ بتلائی جاتی ہے، اسی کے بعد عالمی صحت وطبابت کے شعبوں نے اس مرض کی تشخیص اور مکمل ازالہ کے لئے مسلسل فکر شروع کی اور اس پر بے انتہاء صلاحیتوں کو صرف کیا۔ بالآخر وہ وقت بھی آیا جب کہ ان لوگوں نے دعویٰ کیا تھا کہ ہم نے اس موذی مرض پر قابو پا لیا ہے، اور شاید اب وہ سر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔مگر اس کو کیا کیجئے کہ شامتِ اعمال اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اب سورت میں خطرناک طاعون نے (خارجی ذرائع کے مطابق) ہزاروں انسانوں کو چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اس طرح ابدی نیند سلا دیا کہ عالمی برادری کے کان کھڑے ہو گئے، بلکہ ہوش اڑ گئے اور روح کانپ گئی۔

گو حکومت نے اس کی مادی وجوہات اور حسی عوامل کا کھوج لگا کر یہ وضاحت پیش کی کہ اصل میں "پلیگ کا مرض" ختم نہیں ہوا تھا بلکہ چوہوں کے ساتھ جنگلوں میں چلے جانے کی وجہ سے صرف شہر بدر ہو گیا تھا۔مگر سیلابوں اور زلزلوں نے چوہوں کو وسعتِ صحرا سے پھر شہر کا خوگر بنا کے لوٹا دیا ہے، اس لئے ہمیں دوبارہ اس مرض کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہم بہت جلد ادویہ کی کثرت اور صفائی میں سرعت پیدا کر کے اس پر قابو پالیں گے۔ دوسری جانب ملک کے ایک نامور لیڈر نے حسب معمول یہ انکشاف بھی فرما دیا کہ "سورت کے پلیگ" کے پس پردہ دشمن وطن کا کرشماتی ہاتھ کارفرما ہے۔ (اس سیاسی بصیرت کو سمجھنے کیلئے وہ واقعہ تازہ کر لیجئے کہ ایک حاذق حکیم کے اناڑی بیٹے نے مریض کے تخت کے نیچے ٹاٹ کا تھیلا دیکھ کر تاڑ لیا تھا کہ مریض نے آج رات ٹاٹ کھایا ہے۔ کیونکہ اس کے باپ نے گذشتہ دفعہ کسی مریض کے تخت کے نیچے انار کے چھلکے دیکھ کر مریض کا انار کھانا پہچان لیا تھا۔)

لیکن اگر ہم حق تعالیٰ کے قانون ”پاداش عمل“ پر نظر کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا کا نظام اتفاقات پر مبنی نہیں ہے بلکہ تکوینات کے ماتحت اور تابع ہو کر قائم ہے۔ اور یہ کہ بندوں کے افعال و اعمال آسمانوں پر اٹھائے جاتے ہیں اور انہی کے موافق آسمانوں سے فیصلے بھیجے جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ”مَنْ عَمِلَ صَالِحاً فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيْدِ “ آپ غور فرمائیں کیا لاتور کے زلزلے صرف بخارات میں ہیجان وشدت کا عمومی نتیجہ تھے؟ اور سورت کا پلیگ محض عادت کے مطابق پیدا ہونے والی ایک عام بیماری تھی؟ کیا اس میں قہرِ الٰہی اور عذابِ خداوندی روزِ روشن کی طرح چشم بینا کیلئے واضح نہیں تھا؟ نزدیکانِ بے بصر اگر ان حقائق کے مشاہدے سے محروم رہے تو کیا ہوا؟ دورانِ باخبر انکے ادراک سے ہرگز قاصر نہیں رہے ہونگے۔ میں نے خود چشمِ دید گواہوں سے سنا ہے کہ لاتور میں ایک شخص آسمان کی طرف سر اٹھا کر ایک ہی آواز لگاتا پھرتا تھا کہ اے آسمان والے! یہ صحیح ہے کہ میں نے تیرے گھر کے گرانے میں حصہ لیا، مگر میرے بچوں نے تو یہ قصور نہیں کیا تھا۔ اور سورت کے ابناءِ وطن ان پاکدامن دختران اسلام کے مزاروں پر جاکر (جنکی عصمتوں کو لوٹنے کا داغ ان کی قوم کے چہروں سے مٹا نہیں ہے) سجدہ ریز ہو کر معافیاں مانگ رہے تھے کہ تمہاری مظلوم آہوں کی حرارت نے ہمارے خاندانوں کو گلا کے رکھ دیا ہے، اور تمہارے معصوم اشکوں کے سیلاب نے ہماری تمناؤں کو غرقاب کر دیا ہے۔

البتہ یہ بات متأثر مسلمانوں کی تسلی وتشفی کی ہے کہ احادیثِ صحیحہ کے مطابق طاعون میں جو مسلمان مرجاتے ہیں، انہیں شہادت کے درجات عالیہ سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت انسؓ نے حفصہ بنتِ سیرین سے پوچھا کہ تمہارے بھائی یحییٰ کی موت کس طرح ہوئی؟ انہوں نے کہا کہ

طاعون کے اثر سے ہوئی! اس پر حضرت انسؓ نے خوش خبری سناتے ہوئے ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے" طاعون مسلمان کے لئے شہادت ہے" [۱] چنانچہ حضرت عقبہؓ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن طاعونی اموات کے جسم سے خون اس طرح رس رہا ہوگا جس طرح شہداء کے جسم سے رستا ہے، اور ان زخموں سے مشک کی خوشبو مہک رہی ہوگی۔ [۲] بلکہ شہادت سے مزید مناسبت ومشابہت پیدا کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا" طاعون میں اسی جگہ مقیم رہنے والا شہید ہے اور بھاگنے والا ایسا ہے جیسا جہاد سے بھاگنے والا" [۳]

علماء نے فرمایا ہے کہ شہادت کا رتبہ اس شخص کے لئے ہے جو صبر وثبات اور ایمان واحتساب کے ساتھ قائم رہے، جیسا کہ ملا علی قاریؒ وغیرہ نے ان احادیث کی شرح میں وضاحت فرمائی ہے۔

یہ شریعت اسلامی کی تعلیمات اعتدال کا کرشمہ ہے کہ ایک طرف اس نے ایسے حالات میں اپنا علاقہ نہ چھوڑنے اور صبر وثبات، ایمان واحتساب اور رضاء بالقضاء کیساتھ وہیں ٹھیرے رہنے اور وقت موعود آجائے تو تسلیم وتفویض کا مظاہرہ کرتے ہوئے رختِ سفر باندھنے لینے کی تعلیم فرمائی ہے، اور ایسی موت پر شہادت عطا کئے جانے کی طمانیت دی ہے تو دوسری جانب جو لوگ پہلے سے کسی ایسی جگہ موجود نہ ہوں ان کے وہاں پہونچ کر جوکھم مول لینے اور خطرہ میں پڑنے کو خلافِ دین ودانش قرار دیکر انہیں ایسی جگہوں میں قصداً اور بلا ضرورت داخل ہونے سے منع فرمادیا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ سے مروی ایک حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے" **اذا سمعتم به بارض فلا تقدموا عليه واذا وقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا فرارا منه**" یعنی اگر تم کسی جگہ طاعون پھیلنے کی خبر سنو تو وہاں مت جاؤ، اور اگر تم پہلے سے وہیں ہو تو ڈر کر وہاں سے بھاگو مت۔ ظاہر ہے

۱ بخاری شریف:۶/۲۶۱، ۲ مرقاۃ:۳/۲۸۳، ۳ فتح الباری:۱/۱۲۸

کہ ایسے موقع پر اس سے اچھی تعلیم ممکن نہیں ہے۔رہ گیا یہ سوال کہ اس میں حکمت کیا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ امورِ شرعیہ میں عقلی حکمتوں کا معلوم ہونا ان پر عمل کرنے کے لئے کوئی ضروری نہیں، تاہم علماء نے بلا تکلف جو باتیں سمجھ میں آئی ہیں انہیں بیان بھی کیا ہے۔مثلاً

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ایسی جگہوں میں داخلہ سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ اس میں اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنا پایا جاتا ہے، نیز اسمیں کمال توکل وغایت اعتماد علی اللہ کا دعویٰ بھی عملاً پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں اہلاک نفس، دوسری صورت میں عجب موجود ہے اور یہ دونوں ہی شرعاً مذموم ہیں، اسلئے اسے ممنوع قرار دیا گیا۔اور وہاں سے نکلنے کی ممانعت میں بظاہر یہ مصلحت سمجھ میں آتی ہے کہ ایسا کرنے میں تدبیر میں غلو اور اسباب میں حد سے زیادہ انہماک محسوس ہوتا ہے، اسلئے اسے بھی شارع نے منع فرما دیا۔اور اس تحقیق کی نظیر آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد " **لا تتمنوا لقاء العدو فاذا لقیتموھم فاصبروا** " ہے۔کیوں کہ اس میں مصیبت کی خواہش نہ کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، خصوصاً جب کہ اس میں اغترار نفس کو دخل ہو کیونکہ ہوسکتا ہے اگر وہ مصیبت پہونچ گئی تو پھر اس کو سہار نہ سکے اور ہمت ہار جائے۔ہاں اگر منجانب اللہ ایسے حالات آجائیں تو تفویض وتسلیم کے ساتھ صبر کرنے کی تلقین فرمائی گئی۔[1]

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: طاعون کو جب عذاب الٰہی قرار دیا گیا ہے تو اس میں داخل ہونا تہور (یعنی اس کے ساتھ لاپرواہی برتنا) اور خطرہ میں پڑنا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ عقلاً بھی درست نہیں۔اور وہاں سے بھاگ جانا تقدیر سے بھاگ جانا ہے جو بالکل مہمل حرکت ہے کیونکہ وہ وہاں سے بھاگ کر اپنے مقدر سے بچ نہیں سکتا۔نیز یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں سے بھاگنے میں کمزور اور غریب لوگوں کی دل شکنی وحق تلفی

[1] فتح الباری: ۱/۵۱۱

ہو، کیونکہ اس صورت میں ان کے بیماروں کی دیکھ ریکھ کرنے اوران کے اموات کی تجہیز وتکفین کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔اور یہ انسانیت کے ساتھ بڑی بے مروتی کی بات ہوگی۔واللہ اعلم[۱]

ہاں اگر کوئی اورضرورت سے اس علاقہ سے جانا پڑے تو پھر ضرورتاً نکلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

آخر میں اپنے مسلمان بھائیوں سے مجھے پھر یہی کہنا ہے کہ یہ سطریں میں نے تفریحِ طبع یا خوش فہمی کا سامان کرنے کیلئے نہیں تحریر کی ہیں۔بلکہ محض عبرت و موعظت اوراحتساب کی جانب اپنی اورآپ کی توجہ مبذول کرنے کے لئے تحریر کی ہیں۔آج بدعملی، بےحیائی، ظلم وستم اورفسق وفجور سے خود ہمارا معاشرہ بھی محفوظ نہیں ہے،طرح طرح کی بدعملیاں اورقسم قسم کی نافرمانیاں مسلمانوں کے معاشرہ کا حصہ بن چکی ہیں،حرص وطمع نے ایکدوسرے کی قتل وغارتگری پرآمادہ کردیا ہے،فیشن کی رنگ رلیوں نے بےحیائی وبےحجابی کا بازار گرم کیا ہوا ہے۔رسم ورواج کی جکڑ بندیوں نے اتباعِ شریعت سے کوسوں دور بلکہ نفور کردیا ہے۔ایسے حالات میں اگر مصائب کا رخ خدانخواستہ ہماری جانب ہوجائے تو بعید نہیں، چنانچہ ابن ماجہؒ نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا" پانچ چیزوں سے میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں" پھران چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک بات یہ بھی فرمائی۔"جب بےحیائی عام ہوجائیگی تو طاعون پھیلےگا اورایسی بیماریاں وجود میں آئیں گی جو پچھلے لوگوں میں نہیں تھیں"۔پس جب ایسے حالات ہمارے سامنے ہوں تو ہم دوسروں کا احتساب کرنے کے بجائے اپنا جائزہ لیں،اورانابت واستغفار کی کثرت کریں۔

ملاعلی قاریؒ نے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ" **ان العذاب لا یدفعه الفرار وانمایمنعه التوبة والاستغفار** "اللہ کا عذاب بھاگنے سے دفع نہیں

---

۱ مرقاۃ :۳/۳۶۰

ہوتا، اس سے نجات کی صورت تو توبہ واستغفار ہے۔ [۱]

اس لئے میں قارئین کرام سے مخلصانہ استدعا کرتا ہوں کہ اپنے اپنے حلقہ اثر میں اصلاح معاشرہ وانسداد منکرات وفواحش کی جانب خصوصی توجہ فرمائیں کہ اصلاحِ حال اور رجوع الی اللہ کے علاوہ کوئی صورت خدا تعالیٰ کے قہر سے بچنے کی ممکن نہیں ہے۔

**وفقنا اللّٰہ وایاکم لما یحبہ ویرضیٰ**

[۱] مرقاۃ: ۳/۳۶۰

# تعلیم، مسلم سماج کا ماضی اور حال

**بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم**

اسلام، زمانہ میں رائج ادیان و مذاہب کی طرح چند خود ساختہ نام نہاد وخانہ ساز رسوم و عادات پر مبنی مذہب نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی ذات میں مکمل دستورِ حیات اور مستقل تہذیب ہے، وہ انسانی سماج کی انفرادی واجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں داخل وشامل اور کافی راہنما ہے۔ اس کے اپنے اصول وضوابط، اقدار وافکار ہیں، جو اپنی جامعیت اور کاملیت کی وجہ سے کسی ترمیم واضافہ، یا کسی دوسرے مذہب کے اقدار وافکار سے استفادہ کا چنداں محتاج نہیں۔

اور جب یہ بات ہے تو اسلام کی تعلیمات کا تعلق صرف عبادات وعقائد کے ساتھ خاص ومحدود ہونے کے بجائے لازماً ضروریات زندگی، مسائلِ بشری اور تقاضہائے انسانی کے ساتھ بھی پورے طور پر ہے، اس لئے اسلام کے مآخذ اصلی یعنی" قرآن وحدیث" میں دونوں سے متعلق احکام موجود ہیں۔ جسکی تفصیل شارحین قرآن وسنت نے اپنے موقعہ پر کردی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اہلِ اسلام نے جہاں ایمانیات وعبادات کی طرف علماً وعملاً اور بلاغاً توجہ دی ہے وہیں انہوں نے ان علوم وفنون پر بھی پورا عبور واقتدار حاصل کیا جو اسلام کے ابتدائی دور میں یونان وہندوستان کی خصوصیت سمجھے جاتے تھے۔ اور انہی کو ان پر اجارہ داری کا دعوی تھا۔ نہ صرف یہ کہ مسلمان علماء وحکماء نے ان علوم وفنون کی تحصیل میں سعی کی بلکہ اسکی ترقی، توسیع اور اس کے ذریعہ انسان زندگی کے

وسائل میں اضافہ وسہولت بھی پیدا کیا۔فن سے فن کو ایجاد کیا،علم سے علم کا انکشاف کیا۔ چنانچہ نویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک دنیا کے تمام مادی علوم وفنون پر مسلمان قابض اور ہرفن کے ماہر واستاذ رہے۔چنانچہ آج یورپ اپنی تمام تر ترقی بلکہ اپنے وجود میں بھی مسلمان محققین فنون کا رہین منت ہے۔ یہ نہ مبالغہ ہے نہ خودستائی کی بے جا کوشش ہے۔کوئی بھی شخص انصاف کے ساتھ تاریخ کا اگر تجزیہ کرے تو تاریخ اس حقیقت پر سے پردہ اٹھائیگی اور ہر دیانتدار وغیر جانبدار ناقد کو اعتراف وتسلیم پر مجبور کرے گی۔"کولمبس" نے امریکہ کی دریافت اور "واسکوڈی گاما" نے ساحل ہند کے پانے کے سلسلہ میں کیئے گئے سفروں میں "قطب نما" اور"بحر پیمائی" کے جو آلے اور نقشے استعمال کیئے،انہیں کس نے ایجاد کیا تھا؟اس میں دورائیں نہیں ہوسکتیں کہ ان کے موجد مسلمان تھے، اور ان کے استعمال کا طریقہ انہوں نے اسلامی درسگاہوں میں سیکھا تھا۔مسلمان نہ ہوتے تو یورپ کو زندگی گذارنے کا سلیقہ بھی نہ ہوتا۔تمام فنون وعلوم میں یورپ،امریکہ اور مغربی اقوام مسلمانوں کی شاگرد ہیں۔لیکن انہوں نے اس حق کو چھپانے کی سعی کی اورصدیوں سے وہ تاریخ کے چہرہ پر جھوٹ اور صناعت وبناوٹ کا پردہ ڈالنے میں مشغول ہیں ۔انہوں نے مسلمانوں کی کتابیں اپنے نام سے شائع کیں اور مسلمانوں کے کارناموں کی اصلاح وعنوان تبدیل کرکے اپنے محققین کے سرمنڈھ دیا۔یوں دھیرے دھیرے یہ بات خودمسلمانوں کے ذہن ونظر سے اوجھل ہوگئی کہ کاغذسازی،قطب نما،گھڑیاں، چشمہ کی صنعت، ہوائی جہاز، پرنٹنگ پریس،کرین، واٹرموٹر،شیشہ سازی،قالین بانی، چمڑے کی دباغت ورنگ ریزی،چینی کے برتن جیسی بے شمار مصنوعات ہیں جن کے موجد مسلمان ہیں۔صنعت کے علاوہ فلسفہ، سائنس ،فلکیات ،ریاضیات ،جغرافیہ، طب ،آپریشن اور جراحی ، ہیئیت ،تاریخ

لغت وادب وغیرہ جیسے بیسیوں فنون ہیں۔جن میں نہ صرف کمال ومہارت ، بلکہ اصلاح وارتقاءاور تبلیغ واشاعت کا کام اس دور میں کسی اور قوم نے نہیں صرف اور صرف مسلمانوں اوران کے باذوق وعلم دوست حکمرانوں نے انجام دئے تھے۔اس لئے مدارس ،مصانع، کتب خانہ، اور تحقیقی مراکز قائم کئے اوران کے وسائل متعلقہ کے جمع کرنے پر کروڑوں روپیہ صرف کیا۔

یہ تحریر اسکی متحمل نہیں کہ ہم اس دعوے کوتاریخی شواہد و دلائل سے مزین کریں۔ ہمیں اس وقت صرف یہ کہنا ہے کہ ان سب علوم وفنون کی تحصیل میں مسلمانوں کا انہماک حذاقت ومہارت اورتوسیع واشاعت کا حقیقی سبب اور بنیادی وجہ اسلام کی طرف سے پوری اجازت بلکہ ترغیب واعانت تھی ۔اسمیں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا اصل موضوع اور حقیقی دعوت حیات اخروی کی کامیابی اور مابعدالموت کی تیاری ہے۔لیکن چونکہ خود یہ کام جس دنیوی زندگی کامحتاج ہےاس زندگی کی صحت، عافیت اورراحت انہی وسائل مادیہ کی فراہمی اوراستعمال پر موقوف ہے ۔اس لئے ضرورت کے درجہ میں ان علوم وفنون کوبھی اسلام نے اپنے دامن میں جگہ دی۔ اس کا ادنی اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حدیث وفقہ کی کتابوں میں معاملت و معاشرت،یعنی زراعت،تجارت، ملازمت، لین دین، باہمی تعلقات اورانفرادی واجتماعی نظام زندگی کے احکام،عبادتوں کے احکام سے کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ہاں اسلام کا یہ مطالبہ ہمیشہ رہااور ہمیشہ رہیگا کہ تم اولاً مسلمان یعنی خدا ورسول کے مطیع وفرمانبردار ہو پھر کچھ اور! یہ حقیقت کبھی فراموش نہ ہونے پائے۔

بقول اکبر مرحوم کے ؎

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں کھیلو
جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو

پر اتنی بات بندہ عاجز کی رہے یاد
تم خدا کی یاد، اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

لیکن افسوس کہ مسلمانوں پر جب ان کی شامت اعمال، آسمان سے بے توفیقی ومحرومی کا تازیانہ لے کر آئی تو وہ کہیں کہ نہ رہے۔ دنیا کو ترقی وسربلندی سے آشنا کرنے والی یہ قوم ہر دن پستی وذلت میں گرتی جارہی ہے۔ نہ قرآن وسنت کے علوم سے دلچسپی رہی اور نہ ہی مادی علوم کے ''متاعِ گم گشتہ'' کی واپسی سے کوئی تعلق رہا۔ بالخصوص ہندوستان میں صدیوں کے اقتدار میں مسلمان زمینداری اور تانہ شاہی کے عادی ہو گئے۔ پھر مغرب کے تسلط نے تو انہیں کان تھپک کے اور لوریاں دے دے کے ایسا سلا دیا کہ اب وہ بیداری کے نام سے گھبرارہے ہیں۔ اور اگر کچھ غمخواروں اور دردمندوں نے ان میں خود داری و بیداری کی روح پھونکی اور خواب غفلت کی ماری یہ امت کچھ بیداری کی انگڑائی لینے لگی، تو دشمن کو اپنی زندگی کے دن معلوم ہو گئے اور انجام بلاخیز آنکھوں میں نظر آنے لگا۔ اس نے دوسرا حربہ آزمایا اور تعلیم گاہوں کو اپنے نصاب ونظام کے ماتحت کر کے پوری کوشش کی کہ یہ قوم یا تو اٹھنے نہ پائے اور اگر اٹھے تو مذہب کی حمیت وغیرت سے محروم ہو کر اٹھے۔ اسی حقیقت کو جہاں دیدہ، وسرد وگرم چکیدہ اقبال مرحوم نے کہا ہے ؎

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اور اب صورتحال یہ ہے کہ اکثر مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کا شوق ہی نہیں۔ کچھ ابتدائی تعلیم حاصل کر کے یا کاروبار میں لگ جاتے ہیں یا پھر نوکری وملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اور جو تھوڑی تعداد اعلیٰ عصری تعلیم کی طرف توجہ دیتی ہے وہ حاصل بھی کرتی ہے، محنت ودولت بھی صرف کرتی ہے مگر

چونکہ ابتدائی اسکول سے لے کر کالج تک بلند ہونے تک ان کی زندگی عیسائی یا ہندو "مشنری" کے ماحول میں گذرتی ہے، نتیجۃً یہ طبقہ پڑھ لکھ کر قابل بننے تک اسلام کیطرف سے شکوک وشبہات میں مبتلاء ہوجاتا ہے۔ اورعلم دین سے مطلق واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے مذہب کے بارے میں ان کی جو کیفیت ہوجاتی ہے، وہ اس قدر سنگین ہے کہ نہ وہ ظاہر کر سکتے ہیں نہ ہم بیان کر سکتے ہیں۔ کل تک مسلمانوں کے پھر بھی گھروں میں کچھ نہ کچھ مذہبیت تھی آج وہ بھی کہیں مردہ ہوچکی ہے، کہیں دم توڑ رہی ہے، اب اس نسل کا کیا ہوگا جو آج دین سے دور، بے دینی وخدا بیزاری کے ماحول میں زیر تعلیم ہے۔ آج کبھی تاریخ میں تحریف کی بات ہے۔ کبھی وندے ماترم یا کسی اور ترانہ کے تسلط کا مسئلہ ہے۔ کہیں باقاعدہ پوجا پاٹ کی خبریں ہیں۔ کہیں عیسائیت کے گن گانے اور مراسم کے ادا کرنے کی پابندی ہے۔

جب ایسی باتیں منظرِ عام پر آتی ہیں تو مسلمان کچھ احتجاج، کچھ توڑ پھوڑ اور کچھ شور وشرابہ کر کے چپ سادھ لیتے ہیں، اوراس ردعمل کے بعد دشمن کا اپنا مقصد تو تکمیل پا جاتا ہے مگر مسلمان کسی ٹھوس اقدام اور مستقل انتظام میں کامیابی حاصل نہیں کر پاتے۔ ہمیں کسی مذہب کی اپنی تبلیغ اوراس سے محبت پر کوئی اعتراض نہیں کہ وہ ہر شخص کا انسانی اور ہر ہندوستانی کا آئینی حق ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس حق کا استعمال خود مسلمان کیوں نہیں کرتے۔ آج مسلمانوں کے اپنے تعلیمی وتربیتی ادارے اگر چہ ماضی کے مقابلہ میں بہت ہیں، لیکن ان کا نصاب ونظام مغربی دنیا سے مرعوبیت کے نتیجہ میں وہی ہے جو عیسائیت کا تیار کردہ ہے۔ ان میں دور دور تک اسلام نظر نہیں آتا۔ اوراس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان میں سے اکثر کا تعلیمی معیار بھی مسابقت کے معیار پر نہیں اترتا۔ نتیجۃً اعلی تعلیم کی خواہش رکھنے والوں کے بچے ان کی طرف رخ نہیں کرتے، کیونکہ ان کے سرپرست پیسہ تو خرچ کر سکتے ہیں لیکن

توجہ اور وقت نہیں دے سکتے ۔ وہ اپنے ہونہاروں کے روشن مستقبل کی تمنا میں انہیں انہی مشن اسکولوں کے ہاسٹلوں میں رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں ۔ یہاں بچوں کو ماؤں کی طرح ہمدردی و پیار سے پالا جاتا ہے، پڑھایا جاتا ہے، سکھایا جاتا ہے، یہ نقشہ دیکھ کر سرپرست مطمئن ہو جاتے ہیں ۔ مگر انہیں خبر نہیں کہ وہ اس طرح اپنے بچوں کے ایمان وعقیدہ کو داؤ پر لگا رہے ہیں ۔

اس صورتحال کا واحد اور معقول حل اگر کچھ ہے تو وہ یہ ہے کہ مسلمان خالص اسلامی اور دینی ماحول میں علومِ عصریہ کے معیاری ادارے قائم کریں اسی طرح صنعت وحرفت کے مراکز کا بھی انتظام کریں ۔ تاکہ مسلمان "سائنس اینڈ ٹکنالوجی" کے اس دور اور اس دوڑ میں کسی قوم سے پیچھے نہ رہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کا دین و ایمان محفوظ و مستحکم رہ سکے ۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس متاعِ ایمان اور امانتِ اسلام کو اپنے علم و ہنر کے ذریعہ زندگی کے تمام میدانوں میں مشغول بندگانِ خدا تک بہ سہولت پہونچا سکیں ۔

مختصر یہ کہ مسلمان ماضی میں علم کی دینی ودنیوی تقسیم کے بجائے نافع اور غیر نافع کی تقسیم سے واقف تھے اور ضروریاتِ دین کے علم کو چھوڑ کر —— کہ وہ فرض عین، اور ہر ہر مسلمان پر لازم ہے —— باقی علوم کو خواہ وہ عالم وحافظ بننا ہو یا ڈاکٹر، انجینیر، سائنٹسٹ بننا ہو یا انسانی سماج کے لئے ضروری ہنروں کا ماہر بننا ہو یکساں طور پر فرض کفایہ سمجھتے تھے، اور ان کے حصول کے لئے، عوامی جد وجہد بھی ہوا کرتی تھی، سرکاری سرپرستی بھی ہوا کرتے تھے، علماء اسلام اس کو منع تو کیا کرتے وہ خود کسی نہ کسی عصری علم و ہنر کے حامل ہوا کرتے تھے ۔ چنانچہ طب، فلسفہ، سائنس، ہیئت، جغرافیہ فلکیات، حساب جیسے بیسیوں طبعی علوم میں بنیادی وابتدائی لٹریچر علماء اسلام ہی کا ہے ۔ اسی طرح بڑے بڑے فقہاء ومحدثین کا ذریعہ معاش عام انسانی

ضرورت کے پیشوں دھاگہ بنانا، کپڑا بننا، کھانا پکانا جیسے معمولی کاموں سے وابستہ تھا۔غرض انسانی ضرورت کے معقول اور مباح کسی کام کو نہ حقیر سمجھا گیا اور نہ ان کے اختیار کرنے سے پہلو تہی کی گئی۔تقریباً چھٹی صدی ہجری تک یہی صورتحال رہی مگر اس کے بعد دھیرے دھیرے مختلف وجوہ واسباب سے اسمیں زوال آتا گیا۔ تا آنکہ اس وقت مادی وسائنسی ترقیات اور علومِ دینیہ میں درک وکمال، دونوں ہی میدانوں میں مسلمان ضعف وانحطاط کے شکار ہو گئے۔

علومِ دینیہ اسلامیہ تو الحمدللہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کے طور پر بھی قائم ودائم ہیں۔مگر علوم عصریہ میں مسلمانوں کے اوج کا گراف دن بدن آتا ہی جا رہا ہے۔یہ ہمارا ماضی اور حال تھا اور مستقبل کیلئے بس یہ ایک پیغام کہ ؎

**لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!**

اس کے لئے ضرورت ہے کہ علماء و دانشوران باہمی تعاون، آپسی تناصر اور ایک دوسرے کے تجربات وصلاحیتوں کے تبادلے کے ساتھ آنے والی نسلوں کو درپیش چیالنج کے مدافعہ کیلئے کمر بستہ ہو جائیں۔خدا کرے کہ ایسا ہو جائے اور جلد از جلد ہو جائے!

# اسلامی اور مغربی تصوراتِ تعلیم اور ان کے اثرات

**الحمد للّٰہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ امابعد !**

حضرات دانشوارنِ ملت ! ہمارا اور آپ کا آج یہاں جمع ہونا "ملتِ اسلامیہ کے نونہالوں" کے سلسلہ میں ایک عظیم سماجی واسلامی فریضے پر غور وخوض کیلئے ہوا ہے، نزدیک اور دور کے مختلف علاقوں سے تشریف لائے ہوئے آپ حضرات مجھے معلوم ہے کہ اپنی اپنی جگہ نہایت مصروف ومشغول ہیں، مگر یہ آپ کے دلِ دردمند اور فکرِ ارجمند کی علامت ہے کہ I.E.M کے مقاصد کی اہمیت کے پیش نظر اس کی دعوت پر اپنی مصروفیات سے علاحدہ ہو کر آپ سب یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ حق تعالیٰ ہمارے جمع ہونے کو اخلاص واختصاص سے متصف فرما کر شرفِ قبول عطا فرمائے ( آمین )

حضراتِ گرامی ! اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس کی تعلیمات زندگی کے تمام شعبوں اور ان شعبوں کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے اور ہر علاقہ، ہر زمانہ میں پورا کرنے کی بھر پور صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسی وجہ سے روزِ اول سے آج تک وہ ایک زندہ وتابندہ مذہب کی حیثیت سے قائم ودائم ہے، فرسودگی اور اضمحلال اس پر نہ کبھی طاری ہوا، اور نہ انشاءاللہ کبھی طاری ہوگا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تعلیم وتعلم اسلامی تعلیمات کا بنیادی حکم ہے، پہلی وحی ہی پڑھنے پڑھانے، سیکھنے سکھانے، کی ترغیب وتحریص لیکر نازل ہوئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تعارف ”معلم“ کی حیثیت سے فرمایا، اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں اور ان کے حکمرانوں نے اپنے عہدِ زریں اور دور ہائے اقتدار میں ”علم وفن“ کی ایسی خدمات انجام دی ہیں کہ اس کی مثال یورپ میں علمی بیداری پیدا ہونے سے پہلے تک دوسری کسی قوم میں ملنی مشکل ہے، دینی ومذہبی تحقیقات کا سلسلہ تو اب تک الحمدللہ جاری ہے، مگر افسوس کہ مختلف سیاسی وسماجی عوامل کے نتیجہ میں عرصہ ہوا کہ مسلمانوں نے مادی اور عارضی علوم یعنی حکمت وصنعت (Science & Technology) کی طرف سے اپنے کو غافل کرلیا ہے، جبکہ دنیا میں آج کی سب سے اہم اور سب سے بڑی ضرورت ”علم“ ہی ہے، دینی بھی عصری بھی۔

مندوبین کرام ! یہ صحیح ہے کہ قرآن وحدیث میں جو ”علم وعلماء“ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں ان کا حقیقی مصداق علمِ دین اور علماء دین ہیں، بعض ناعاقبت اندیش لوگوں کی طرح مہمل تاویلات کے ذریعہ کھینچ تان کر قرآن وحدیث کے اصطلاحی فضائلِ علم کا مصداق علومِ عصریہ کو بنانا ہمارے لئے صحیح نہیں ہے، ان سے ہٹ کر کتاب وسنت کی روشنی میں متعدد دلائل اور بے شمار نظائر موجود ہیں جو علومِ عصریہ کی تحصیل وترویج میں دلچسپی اور جدوجہد کا جواز بلکہ ترغیب فراہم کرتے ہیں، جن سے ہم اس مسئلہ پر بھرپور استدلال کر سکتے ہیں لیکن اس وقت اس کی تفصیل میں گئے بغیر میں اپنے موضوع پر گفتگو کر رہا ہوں۔

تعلیم خواہ دینی ہو یا عصری ! اس کی ترکیب تین اجزاء سے ہوتی ہے، مقصد، نظام، اور نصاب۔ مقصد کہتے ہیں ہدف (Target) کو کہ کس غرض اور فائدے کے حصول کے لئے یہ کام کیا جارہا ہے، نظام سے مراد طریقِ تعلیم اور نصاب کا

مطلب وسائلِ تعلیم ! حقیقت یہ ہیکہ تعلیم کے اچھے یا بُرے نتائج ان ہی تین امور کے اچھے یا بُرے ہونے کے اعتبار سے سامنے آتے ہیں۔اسلئے آج ہمارے بچوں کا اہم ترین مسئلہ جہاں یہ ہیکہ اُنھیں علم وفن سے وابستہ وآراستہ کیا جائے ،وہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم یہ ہے کہ مقصدِ تعلیم ، نظام تعلیم اور نصابِ تعلیم کو اسلامیانے یعنی مزاجِ اسلام کے موافق بنانے کی جدو جہد کی جائے۔اس لئے کہ ہم مسلمان ہیں اور اسلام سے آزاد ہوکر یا ایمان کی قیمت پر کوئی دولت حاصل کرنا اپنی اور اپنے رب کی غیرت کے خلاف سمجھتے ہیں۔

دانشوارنِ قوم وملت ! یہ ایک خوش آیند اور اطمینان بخش بات ہے کہ ہماری قوم میں تعلیم کا رجحان دن بہ دن بڑھتا جارہا ہے،ساتھ ہی ساتھ مذہبی شعور میں بھی اضافہ ہوتا جارہاہے ، آج ایک جاہل اوران پڑھ شخص بھی اپنے بچوں کو تعلیمیافتہ اور قابل دیکھنے کا خواہشمند ہے ، اور اس کے لئے اچھے اسکولوں کا انتخاب کرنے اوراس پر اپنی کمائی کا بڑا حصہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہے،مگر بد قسمتی سے ہمارے ملک میں تعلیم کا موجودہ نظام مغربی سامراج یعنی برٹش دورِ اقتدار میں" لارڈ میکالے" کا قائم کردہ نظام ہے ، جوتھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ پورے ملک میں تاہنوز جاری وساری ہے ، اور ملکی تعلیم گاہوں کا تو ہم کیا شکوہ کریں ،ان سے زیادہ رنج وافسوس کی بات یہ ہے کہ جو درسگاہیں خود مسلمانوں کے اہتمام وانتظام میں ہیں وہ بھی مشنریز کے نظامِ تعلیم سے چنداں مختلف نہیں ہیں، بلکہ اسی کا بعینہٖ چربہ ہیں،جبکہ اسلام کا مطلوبہ نظامِ تعلیم اس سے بالکل علاحدہ ہے ، ذیل میں ہم دونوں نظاموں کا تقابلی خاکہ پیش کرتے ہیں ، تاکہ بنیادی فرق سمجھنے میں سہولت ہو۔

## اسلامی نظریۂ تعلیم

شخصیت کی تعمیر، فطری صلاحیتوں کے ابھار واستعمال کی ترغیب، اور جذبۂ خدمتِ خلق کی تحصیل۔

(ثبوت کے لئے فضائل علم سے متعلق احادیث کا ملاحظہ کافی ہے)

## نصاب

متعلقہ علوم وفنون کے اتنے مواد کی فراہمی جو ہر مضمون کی ضرورت پوری کر سکے، اس کی تسہیل، پھر درجہ بدرجہ تدوین اس طور پر کہ ہر مضمون میں اخلاقِ اسلامی کا عنصر اور اس کی روح کارفرما ہو۔

## نظام

باحیاء اور پاکیزہ ماحول، بلند کردار، ہمدرد وملنسار، خوش عقیدہ ومتبع سنت اساتذہ، اور سہولت بخش وسائل کی فراہمی۔

## میکالے کا نظریۂ تعلیم

عیسائی عقیدہ وتہذیب کا فروغ، پر تعیش زندگی کی تحریص، اور ڈگری کے ذریعہ شہرت وناموری کا فریب، اور تہذیبِ اسلامی کے تشخص وامتیاز کی پامالی۔

(تفصیل اور حوالہ کے لئے کتاب ''میکالے کا نظریہ تعلیم'' ملاحظہ فرمائیں)

## نصاب

ہر مضمون میں یورپ کا محض تقلیدی مواد جواز دیاد معلومات کا کام کرتا ہو مگر تخلیقی صلاحیتوں کو ابھار کر تحقیقی میدان میں سرگرم کرنیکی صلاحیت نہ رکھتا ہو، جس کے ذریعہ بس کسی سند کا حصول اور چند ٹکوں کا وصول ہو سکے۔

## نظام

لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط، صلیبی کلچر اور مسیحی ماحول اور مخالف اسلام ذہن سازی وہ بھی کمرشیل بنیادوں پر۔

## نتیجہ

خدا ترس ، پاکباز، انسانیت نواز ایک دوسرے کے ضرر سے محفوظ، ایک دوسرے کو فائدہ پہونچانے والے منظّم ومتحد معاشرہ اور مہذب وروبہ ترقی سماج کی تشکیل، یعنی انسانیت کی تکمیل۔

## ثبوت کیلئے

اسلامی نظامِ تعلیم کے دور میں پیدا شدہ دینی وعصری علوم کے ماہرین پر نظر ڈال لی جائے کہ وہ اپنے اپنے فنون میں یکتائے زمانہ اور نادر روزگار ہونے کے ساتھ صورت شکل، کردار وعمل اور خدمتِ خلق کے اعتبار سے کیسے کامل ومکمل اور مخلص وبے لوث تھے۔ اس کے ساتھ علم وہنر میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ وہ کائناتی حقائق جو معلومات کی تنگی اور مشاہدہ

## نتیجہ

خدا فراموش ، دین بیزار ، بداخلاق ، حیاء وحجاب سے عاری، نہایت خودغرض اور آخرت سے یکسر غافل وبے پرواہ سوسائٹی کا وجود ،جس کا عقیدہ وعمل مسیحیت سے قریب اور اسلام سے دور ہو، جس میں ایمان ویقین شکوک وشبہات سے مبدل اور اخلاق واعمال ایثار وقربانی سے عاری ہو۔

## ثبوت کیلئے

جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت کا حال دیکھ لیا جائے جو تکلف وتصنع کو اخلاق اور اخلاقِ اسلامی کو تشدّد سے تعبیر کرتے ہیں، جن کی نظر میں یورپین اقوام ہی خوش نصیبی اور ترقی کی ضامن ہیں ، ان کی تقلید جامد کے بغیر زمانہ میں پنپنا اور رفتارِ ترقی کا ساتھ دینا ناممکن ہے، بہت سوں کی مغربی غلامی کا یہ حال ہے کہ وہ اسلام کی تعریف بدلنے اور قرآن کی نئ تعبیر وتشریح کرنے کے حق میں

کے محدود وسائل کی وجہ سے انسانی عقل سے بالاتر تھے اور جن کے بارے میں موجودہ معلومات ومزعومات کو عقائد کا درجہ اور توہمات کا ٹیکا دیکر اسی پر اکتفاء کر لیا گیا تھا اُنہیں توہمات کی جکڑ سے آزاد کر کے تحقیقات وانکشافات کا ایسا سلسلہ قائم فرمایا جو آج تک پورے کر وفر کے ساتھ رواں دواں ہے، یورپ کی سائنسی ترقی اور تخلیقی دوڑ اگر چہ بہت آگے بڑھ گئی اور بڑھتی جارہی ہے مگر تاریخ اقوام ناطق اور چشمِ فلک گواہ ہے کہ خود یورپ نے یہ دولت مسلمان سائنسدانوں کی شاگردی میں حاصل کی ہے، آٹھویں صدی ہجری تک جدھر دیکھو مسلم سائنسدانوں ہی کا غلغلہ اور شور مچا ہوا تھا۔لیکن شامتِ اعمال سے اس کے بعد مسلمانوں کا یہ علمی ورثہ یورپ کی میراث بن گیا اور دیکھتے دیکھتے دنیا کی نظروں سے اس حقیقت کو چھپا دیا گیا نظر آتے ہیں ۔ یورپ کا ہر اعتراض ان کو اپنے مذہب پر ایسا داغ نظر آتا ہے کہ اس کو مٹانے کے لئے وہ اس حکم کو حذف کر دینے پر آمادہ ہیں اور اس کی حفاظت کرنے والے ملاؤں سے سخت چڑ ہے۔ان لوگوں کو اولاً تو دینداری ،دقیانوسی محسوس ہوتی ہے، اور اگر ادھر کچھ رغبت بھی ہوتی ہے تو وہ اسلام کو علماءِ اسلام سے سمجھنے اور حاصل کرنے کے بجائے دشمنانِ اسلام یا ان کے شکار مسلم اسکالرز کے ذریعہ حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں ،نتیجۃً اسلام کی کوئی نئی تعبیر اور خود ساختہ تصویر لیکر میدانِ دعوت میں اتر جانے اور اہلِ اسلام کیلئے دردسر بن جاتے ہیں ،ان کا حال عربی کے اس مقولہ کا ہوجاتا ہے اگر تو نہیں جانتا تو یہ ایک مصیبت ہے، اور اگر جانتا ہے تو یہ اس سے بڑی مصیبت ہے۔

معزز شرکاء اجلاس! یہ دونوں نظاموں کا ایک سرسری خاکہ تھا جسے دلائل وشواہد سے مزید مدلل وموکد کیا جا سکتا تھا، اس کا ارادہ بھی تھا، مگر آپ حضرات کی علمی وفکری استعداد کے مقابلہ میں میں نے اس اشارہ واختصار کے بعد مزید تفصیل کو تحصیلِ حاصل سمجھ کر ترک کر دیا ہے۔ الغرض میری ان گذارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

☆ مسلمان بچوں کو صنعت وحکمت (سائنس اینڈ ٹکنالوجی) سے آراستہ کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، لیکن اسی کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور نبوی اخلاق کے ذریعہ ان کے فکر وعمل کا قبلہ درست رکھنا اور غیر اسلامی افکار ونظریات، غیر مسنون تہذیب وکلچر کے جراثیم سے ان کی حفاظت کرنا بھی لازمی اور فریضۂ اسلامی ہے۔

☆ موجودہ نظام ونصابِ تعلیم ہمارے اس مقصد کو پورا کرنے سے قاصر ہے، کیونکہ حصولِ علم کے مقاصد کے سلسلہ میں اسلامی نظریات اور مشنری اغراض ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور دو علاحدہ سمتوں کی جانب اس طرح مائل ہیں کہ دونوں کو جوڑنا ناممکن ہے۔

☆ اس لئے ضروری ہے کہ علومِ دینیہ کے فارغین اور علومِ عصریہ کے ماہرین، اشتراکِ فکر وعمل کیساتھ مسلمانوں کے لئے ایک ایسا نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم فراہم کریں جو تعلیم کے اسلامی مقاصد کی تکمیل کر سکتا ہو، یعنی تقاضہائے زمانہ اور رفتارِ ترقی سے ہم آہنگ بھی ہو اور مطالباتِ شرعیہ کو پورا کرنیکی صلاحیت بھی رکھتا ہو، اور تمام خانگی مدارس یا کم ازکم وہ مدارس جنکے ذمہ داروں کو امت کی فکر ہے یکساں طور پر اس نظام کو اپنے اسکولز میں جاری کر کے ملتِ اسلامیہ کے نونہالوں کو الحاد وزندقہ کے بے رحم ہاتھوں برباد ہونے سے بچالیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام وقت طلب بھی ہے دقت طلب بھی! سوسالہ نظام بہ

یک جنبش قلم سر سے لیکر پیر تک تبدیل ہو جانیوالا نہیں ہے، میں اس خوش فہمی میں نہیں ہوں کہ جو کچھ کاغذ پر جس آسانی سے لکھا جا رہا ہے وہ میدانِ عمل میں بھی اسی سہولت کے ساتھ نافذ العمل ہو جائیگا۔ مگر اس کے باوجود بہت احترام سے عرض کروں گا کہ خواہ کتنا بھی وقت لگے ہمارے اس سفر کی منزل یہی ہے، یہی ہونی چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم قدم قدم آگے بڑھیں گے دھیرے دھیرے ہی سہی ترقی کرتے رہیں گے۔ اگر ''میکالے'' کا نظریہ سو سال کے بعد امت کی تباہی کا یہ رنگ دکھا رہا ہے تو ہماری کوششیں بھی ہوسکتا ہے کہ سو سال کے بعد ہی برگ و بر لائیں، مگر کام تو ابھی سے شروع کرنا ہوگا اللہ کی ذات سے مجھے یقین ہے کہ اگر .....ابھی کام شروع کر دیا گیا تو صرف پچیس برس بعد کوئی دوسرا ہی سماج ہمارے سامنے ہوگا، انشاء اللہ۔

بہر حال کام کی ابتداء، ابتدائی عمل کو لیکر فوری طور پر ہو جانی چاہیے، اس کے لئے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس عظیم مقصد کی تکمیل اور اس ہدف کی تحصیل اپنے اسکولوں میں محض دینیات یا اسلامیات کے نام سے ایک (Period) بڑھا دینے اور بچوں کو کچھ اسلامی کلمے واذکار رٹا دینے سے ہرگز نہیں ہوسکے گی۔ اس کے لئے بانیانِ اسکول کو سب سے پہلے اپنا'' ذہن'' تعلیم کے اسلامی مقاصد سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ اور یہ طئے کرنا ہوگا کہ اس اسکول کے چلانے سے ہمارا مقصد صرف قوم کے بچوں کو روزگار کے قابل بنانا نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی نسل کی تیاری ہے جو عقیدہ وعمل کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حامل، پوشیدہ قدرتی صلاحیتوں کے نکھار و استعمال پر قادر، اور قوم وملت ملک ووطن کی سچی ومخلص خدمت گذار ہو محض حصولِ معاش اس کا مقصدِ حیات نہ ہو۔ اگر بانی کا نظریہ درست ہوگا تو منتظمین وعملہ کا انتخاب اسی اعتبار سے کریگا، یا کم از کم

انہیں اپنے ذہنی وفکری سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے گا۔اور جب اساتذہ وعملہ کا فکری رُخ بدلے گا تو وہ اسکول کے نظام اور ماحول کواس رنگ میں رنگنے کا اہتمام کریں گے،اس کی برکت سے طلبہ، جوان کے زیرسایہ تعلیم وتربیت پارہے ہیں ان کی طبیعتیں اس رخ پر چل پڑیں گی اوران کی فکر ونظر، اخلاق وعادات اسلامی تہذیب کی روشنی سے منور ہونا شروع ہوجائیں گی۔

بانیوں اور منتظمین کا ذہن بن جانے کے بعد جو عملی جدوجہد کا آغاز ہوگا اس کے چاراہم پہلو ہیں (۱) اساتذہ کی تربیت (۲) طلبہ کی تربیت (۳) ماحول کو اسلامیانے کی صورت (۴) نصابی مواد ومنصوبہ کی ضرورت۔ میں چاہوں گا کہ ان چار پہلوؤں پر قدرے تفصیل سے گفتگو کروں۔

☆ اساتذہ کی تربیت:-اس کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ متعلقہ مضامین کی تدریس میں مہارت پیدا کرنا ،انہیں تدریسی اصولوں اورآداب سے باخبر کرتے رہنا،اس کام کے لئے مناسب وقفوں کے بعد ماہرینِ تدریس کے تربیتی لکچرز اور سوال وجواب کی محافل منعقد کرنے کا اہتمام کرنا بہت مفید ہوگا۔

دوسرے ان کی اخلاقی وعملی تربیت، یہ نہایت اہم کام ہے، بچے کتاب سے زیادہ عمل سے اخلاق وعادات کو اخذ کرنے کے عادی ہوتے ہیں، بڑی جماعتوں سے لیکرنرسری اور کے.جی.تک کے معلمین ومعلمات کوحُسنِ اخلاق اور اسلامی تہذیب کا عملی نمونہ ہونا چاہئے۔اس ضرورت کی تکمیل کے لئے ہر مہینہ کم از کم ایک گھنٹہ اسکول کے اوقات یا خارجی اوقات میں ان کی تربیت کیلئے کسی عالمِ دین کا وقت حاصل کیا جائے۔جس میں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معلمانہ شان کی خصوصیات، غایتِ حلم، کثرتِ عفو، حکیمانہ اسلوب، ہمدردی ومحبت، نرم خوئی ورحمدلی، دلسوزی وخیرخواہی، اورزیرتربیت افراد کے مزاج وماحول کی رعایت وغیرہ

جیسی صفات کو واقعات کی روشنی میں ان کے سامنے پیش کریں۔ اسکے لئے کسی خشک عالم کے بجائے اگر کسی صاحبِ نسبت بزرگ کا انتخاب کیا جائے تو اس سلسلہ کی برکات سامنے آئیں گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان اساتذہ کو پیشہ ور معلم کے بجائے شفیق ومہربان مربی بنانے کی کوشش ضروری ہے۔ علماء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معلمانہ شان کی دوخصوصیتوں کو بہت اہتمام سے نوٹ کیا ہے ایک زیر اثر لوگوں کے ساتھ شفقت ورحمت کا معاملہ کرنا، دوسری یہ کہ جو باتیں دوسروں کو سکھائی جائیں ان پر دوسروں سے زیادہ خود عمل کرنا۔ نیز اساتذہ کو اس بات کی ٹریننگ بھی ضروری ہے کہ بوجہ مجبوری عصری مضامین کے جو حصے اسلامی عقیدہ یا تہذیب کے خلاف پڑتے ہیں اس کو اس طرح پڑھائیں کہ ان غیر اسلامی باتوں کا کچھ زیادہ اثر بچوں پر نہ پڑنے پائے، ہو سکے تو ایسے موقع پر اسکے مقابلہ میں جو اسلامی تعلیم ہو اس کا بھی مختصراً واشارۃً ذکر کرتے چلیں، تاکہ صحیح باتیں قلوب میں نقش ہو جائیں۔

☆ طلبہ کی تربیت: - بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں تین امور کی رعایت ضروری ہے، یعنی ایک تو ان کے نصاب کی مستحکم اور معیاری طریقے پر تکمیل، اس سلسلہ میں کوشش کی جائے کہ معیار تعلیم کسی دوسرے تعلیمی ادارہ کے معیار سے کسی طرح بھی کم نہ ہو، اس کے لئےبھی ماہرینِ تعلیم کے ساتھ تجرباتی اور کتابی مواد کے علاوہ اساتذہ کی تفہیمی مساعی، اور نفسیاتی اصولوں کی رعایت کا اہتمام، اور اس کی انتظامیہ کی طرف سے نگہداشت۔ دوسرے اسلامیات کے گھنٹے کو بنیادی اہمیت دینا تاکہ اس پیریڈ کو بچے ثانوی درجہ دیکر غیر اہم نہ سمجھنے لگیں۔ بلکہ ہو سکے تو اس پیریڈ کی حاضری کو اوسط حاضری کا معیار بنا دیا جائے، تیسرے اساتذۂ کرام وقتاً فوقتاً دین وایمان کی باتیں ان کے سامنے کرتے رہیں، اخلاقیات پر کڑی نظر رکھی

جائے ، اور جو بھی عملی واخلاقی کوتاہیاں سامنے آئیں انہیں نظر انداز نہ کیا جائے ، اساتذہ ان کی اصلاح کو اپنا حقِ شرعی واخلاقی سمجھ کرٹو کیں ، اور محبت سے نصیحت کیا کریں ۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ہمارے اساتذہ معلمِ محض نہیں تھے مربیٔ کامل بھی ہوا کرتے تھے ، وہ طالبِ علمی ہی کے زمانہ میں اتنی نصیحتیں اور اتنی دینی باتیں بتلادیا کرتے تھے کہ ان کی برکت سے ایک طرف ذہنوں میں عقیدے راسخ ہوجاتے تھے ، تو دوسری جانب اعمال میں اخلاقِ حسنہ کا عنصر غالب آجاتا تھا ، یہ نہایت اہم کڑی ہے ، چوتھے مہینہ میں کم از کم ایک مرتبہ ان کیلئے بھی وعظ ونصیحت کی مجلس کا اہتمام کیا جائے ، کسی عالم کے ذریعہ صحابہ کرامؓ ، اولیاء عظامؒ کے بچپن کے واقعات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے چھوٹے چھوٹے قصے اور ہلکی پھلکی تعلیمات کا مذاکرہ ہو ، چاہے وہ زیادہ کچھ نہ سمجھ سکیں ۔ اس لئے کہ اس سے کم از کم علماء کرام سے جوڑ پیدا کرنے اور ان کی قدر واستفادہ کا مزاج بنانے میں بڑی مدد ملے گی ، جس سے ان کی اگلی زندگی روشن ہوگی ۔

☆ ماحول کو اسلامیانا :- اس کا مطلب یہ ہے کہ اسکول کے ماحول میں ہر چیز میں اور ہر کام میں اسلامی تہذیب کا رنگ غالب ہو مثلاً سلام کا عام رواج ہو ، اسمبلی اسلامی ڈھنگ اور اسلامی ترانوں سے قائم ہو ، استاذ جماعت میں داخل ہوکر خود سلام کرے واپس سلام کر کے نکلے ، نماز باجماعت کا انتظام اور اہتمام ہو ، کم از کم چوتھی جماعت سے لڑکوں اور لڑکیوں کے کلاس علاحدہ کردیئے جائیں ، معلمات کا لباس اور حجاب تقاضہائے شرعی کی تکمیل کرنے والا ہو ، معلمین ومعلمات میں بے تکلف گفتگو ممنوع ہو ، نمائشوں میں قومی ، تاریخی وثقافتی مناظر کے مقابلہ میں اسلامی مناظر کو نمایاں کیا جائے ، اور بے حیائی یا برہنگی کے مناظر قطعاً نہ شامل کئے جاویں ، کلچرل پروگراموں میں غیر اسلامی حرکات سے سختی سے اجتناب کیا جائے ،

بالغ اسی طرح چھوٹی مگر قد آور جولڑ کیاں ہوتی ہیں انہیں مردانہ اسٹیج پر نہ لایا جائے، تالیاں بجا کر داد دینے کے بجائے ماشاء اللہ اور بارک اللہ کا استعمال کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ

غرض یہ ہے کہ جس طرح ہندو مشنریز ہندو کلچر کے، کرسچین مشنریز کرسچین کلچر کے تعارف وتحفظ کیلئے اپنا ماحول اپنی تہذیب کے موافق بنائے ہوئے ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ مسلم اسکولوں میں اسلامک کلچر کا اہتمام ہونا چاہئے، اس کے ذریعہ سے بچوں کی ذہنی نشو ونما اور اخلاقی تربیت میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوگا۔

☆ نصابی مواد اور منصوبہ کی ضرورت: -اب الحمد للہ اسلامی افکار کے احیاء کے بعد عصری مدارس کے لئے اسلامیات کے چھوٹے بڑے بہت سے نصاب سامنے آگئے ہیں۔اور بہت سارے اسکولوں میں داخلِ نصاب بھی ہوگئے ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکثر جگہوں پر اس کو ثانوی درجہ دیا جارہاہے، بلکہ بعض اسکولوں میں تو صرف اسلامی ذہن والوں کو مائل کرنے کیلئے بطور اشتہار کے شامل کرلیا گیا ہے۔حتیٰ کہ میں بعض عیسائی اور ہندو اسکولس کو بھی جانتا ہوں جہاں تجارتی نفسیات نے مسلم بچوں کیلئے دینیات کے گھنٹے کا ڈھونگ کر رکھا ہے۔ سوچنا چاہئے کہ جب خود ان کے سینے نورِ ایمان سے منور نہیں ہیں تو وہ ہمارے بچوں کا کتاب کے ذریعہ کیا خاک ایمان بنائیں گے؟ الغرض کسی کتاب کو داخلِ نصاب کرلینا کافی نہیں ہے، اس مسئلہ کو بنیادی فکر اور مشن کے طور پر اپنانے کا نظام بنانا ضروری ہے، اس کے لئے قابل اساتذہ کا تقرر کرنا، سالانہ منصوبہ بندی کے ذریعہ مقدارِ خواندگی کی تعیین اور اس کی تکمیل کو یقینی بنانا۔اس کا امتحان ہونا اور اسکے نتائج کو انعامات سے جوڑنا ضروری ہے، پھر اس کے دو حصے ہیں ایک قرآن مجید کی

باتجوید ناظرہ تعلیم، اس حد تک کہ قرآن مجید نظراً و تلاوۃً مکمل ہو جائے، چند سورتیں نماز کی ضرورت کیلئے اور چند صورتیں مثلاً یٰسں، ملک، اور کہف تلاوت کی ضرورت کے لئے حفظ بھی ہو جائیں۔ دوسری دینی معلومات بنیادی عقائد، عبادات کے ضروری مسائل، سیرتِ نبوی اور کسی قدر تاریخ اسلامی پر مشتمل ہونا چاہیے، جو اگر چہ درجہ بدرجہ سہی مگر دسویں جماعت تک پہونچنے تک مسلمان بچے کو اسلام اور اسلامی تعلیمات سے متعلق اتنا علم آجائے کہ آگے اس کو کچھ دینی علوم کا موقع نہ ملے تب بھی دین پر ثبات اور ایمان پر استقامت کے لئے یہ مواد کافی ہو جائے۔

یہ چند معروضات ہیں جو میں نے بہت ہی عجلت کے ساتھ اور افکار کے ہجوم میں ساتھ ہی ساتھ ٹائپ کرواتے ہوئے مرتب کر لئے تھے، جو آپ جیسے فاضل وقابل، چنندہ اور فکرمند مندوبین کے معیار کے اگر چہ لائق نہیں مگر گذارش ہے کہ تعبیر و تحریر کے معیار میں گئے بغیر نفس مدعا کی طرف خدارا ضرور توجہ فرمائیں، اگر آپ حضرات کے ذہنوں میں یہ مدعا شرف قبول پا گیا تو اللہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ تعلیمی انقلاب کا یہ کارواں بہت آگے نکل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کرے کہ ایسا ہی ہو۔

**وا ٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ علی النبی الکریم**

# اسلام کا تصورِ امن اور مدارسِ دینیہ

۵/اپریل کو حیدرآباد میں نظام کالج گراؤنڈ پر ایک عظیم الشان "مخالف دہشت گردی کانفرنس" صدر رابطۂ مدارس اسلامیہ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم کی حسب ہدایت ریاستی پیمانے پر منعقد ہوئی، اس موقعہ پر یہ مضمون رقم کیا گیا ہے۔

آج ساری دنیا کے انسان خواہ وہ کسی قوم و مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، "دہشت گردی اور بدامنی" کی مصیبت کا شکار ہیں، "دہشت گردی" آج دنیا کا ایک ناقابلِ حل و بے قابو مسئلہ بنا ہوا ہے، یا بنا دیا گیا ہے۔ "دہشت گردی" کیا ہے؟ اسکا مطلب و مفہوم اور اس کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اس کے بارے میں کوئی اطمینان بخش اور معقول جواب کسی کے پاس بھی نہیں ہے، اسلئے کہ اس اصطلاح کی مصیبت یہ ہیکہ دنیا کے سارے علماء وعقلاء اور دنیا بھر کی ہزاروں زبانوں کی لغتیں اور ڈکشنریاں اسکے کچھ بھی معنی بتاتی ہوں گی! مگر مغربی آقاؤں کی اس سے متعلق اپنی ایک علاحدہ تشریح اور جداگانہ منطق ہے، جس کو سمجھنے سے آج ساری دنیا کے عقلمند عاجز و بے بس ہو چکے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک یہ اصطلاح، عام اصطلاحاتِ زبان کی طرح کوئی متعین معنیٰ اور مخصوص تعریف نہیں رکھتی بلکہ ایک جادو ہے جو ہر جگہ ان کی مرضی اور مراد کے سانچہ میں ڈھل جاتا اور سر چڑھ کر بولتا ہے۔

اس سے بڑھ کر افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مغربی افکار و نظریات کے معماروں نے آج کل "دہشت گردی" کو اسلام اور مسلمانوں سے در پردہ اور مبہم انداز میں جوڑنے کا عمل ترک کر کے اپنی خباثت باطنی کی وجہ سے باقاعدہ "اسلامی دہشت

گردی" کی ایک اوراصطلاح وضع کرلی ہے، جس نے پوری دنیا کو بالخصوص مسلمانوں کو عجیب کشمکش میں مبتلا کردیا ہے۔ مغربی میڈیا ان مفروضہ ومزعومہ اصطلاحات کو لیکر جس طرح اس کی تشہیر کررہا ہے وہ میڈیا کے غیر جانبداررول پر سوالیہ نشان ہے! مغربی میڈیا کے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اس طرزِ عمل اور جانبدارانہ بلکہ ظالمانہ پالیسی کا وہی نتیجہ نکلا جو نکل سکتا تھا۔

یہ کوئی ڈیڑھ سال قبل کی بات ہے جب کہ میں یو کے میں ایک دوست کے مکان کے سامنے کھڑا باتیں کر رہا تھا ،ایک مقامی انگریز شراب کے نشہ میں چُور، بڑبڑاتا ہوا سامنے سڑک پر جارہا تھا، وہ جب ہمارے پاس سے گذرا اور اس کو چند داڑھی جبّے والے افراد کھڑے نظر آئے تو انہیں دیکھ کر رُک گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا، " آپ لوگ یہاں رہیں، کمائیں، کاروبار کریں، گھر بنائیں سب کچھ کریں مگر بم بلاسٹ نکریں"۔ یہ سنکر مقامی احباب نے ٹھنڈے دل اور صبر وتحمل سے کام لیتے ہوئے اسلام اور اسلامی تعلیمات اور اپنے طرزِ عمل کا اس کے سامنے کچھ ذکر کیا جس کو وہ غور سے سنتا رہا، جب بات ختم ہوگئی تو بڑے احترام سے اس نے کہا، "میں آپ لوگوں سے دل آزاری کی معافی چاہتا ہوں، میری معلومات آپ لوگوں کے بارے میں بس وہی تھیں جو ٹی وی کے ذریعہ پہونچی تھیں" میرے خیال میں یہی ایک واقعہ مغربی میڈیا کے مسلمانوں کے تئیں بغض وعناد پر مبنی رویے کو اور ان کے اثرات کو سمجھنے کے لئے بہت کافی ہے۔

جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے تو اگر چہ اس ملک کا خمیر ہی گویا اخوت ومحبت سے تیار ہوا ہے ،جس کے نتیجہ میں باہمی مودت ومحبت ، آپسی ہمدردی وغمخواری اور سکھ دکھ میں ایک دوسرے سے اشتراک ہندوستانی عوام کا طرۂ امتیاز اور سرمایۂ افتخار، بلکہ اس ملک کی علامت وپہچان بن گیا ہے، لیکن گذشتہ کچھ عرصہ سے

بعض فرقہ پرست طاقتوں اور فتنہ پرور تنظیموں نے اپنے اغراض ومفادات کی خاطر ، یا ملک کی اس متحدہ جمہوری قوت کو منتشر کردینے کیلئے ، یا پھر مغربی افکار ونظریات کے آلۂ کار بن کر ملک میں مسلمانوں کے خلاف بدگمانیوں ، زہرافشانیوں اور بہتان تراشیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر رکھا ہے ،اس کے لئے بعض اسلامی تعلیمات کو اپنی مرضی کے معنی ومفہوم میں ڈھال کر اور صورت بگاڑ کر عوام کے سامنے پیش کیا جارہا ہے ، جبکہ سب کو معلوم ہے کہ اسلام ایک عالمی وابدی مذہب ہے ، دیڑھ ہزار برس سے پورے عالم میں موجود ہے ،اس نے اپنے ماننے والوں کو سماجی واقتصادی مسائل سے لیکر سیاسی واجتماعی تنظیمی وعسکری مسائل تک تمام شعبہ ہائے حیات اور ضروریات زندگی کیلئے معقول اور ناگزیر جملہ احکامات دیئے ہیں ،ان میں جنگ وجہاد اور بین الاقوامی تعلقات کے احکام بھی ہیں ، جنکی بڑی تفصیل ہے ،ان کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہے لیکن قرآن وحدیث ان احکام کے صرف اصول وقواعد کا علم دیتے ہیں ، پھر ان کی تشریح وتفسیر اور موقع محل کی تعیین ایک خاص ضابطہ اور اصول کی پابندی اور حالاتِ زمانہ کی رعایت کے ساتھ علماء کرام کی ذمہ داری ہوتی ہے ، جبکہ یہ فرقہ پرست طاقتیں اسلام کی بعض تعلیمات کی اپنے منشاء اور اپنے علم کے مطابق تشریح کرکے اسے زبردستی اسلام کی تعلیم قرار دینے ، برادرانِ وطن اور اقوام عالم کو ان کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں سے متنفر کرنے کیلئے مغربی وصیہونی سازشوں کی نہ صرف یہ کہ تقلید کررہی ہیں بلکہ ان میں رنگ بھرنے اور مرچ مسالہ لگانے کے مذموم عمل میں مشغول ہیں ۔اور ملکی میڈیا مغرب کی تقلید میں ان یکطرفہ اور ظالمانہ نظریات کو اپنے پروپیگنڈہ کی مدد سے مزید تقویت پہونچارہا ہے۔

برادرانِ اسلام ! اسی مغربی وصیہونی اور صیہونیت زدہ مسیحی مخالف اسلام

سازشوں کا ایک بڑا اور اہم پہلو "مدارسِ اسلامیہ عربیہ" کو دہشت گردی کی تعلیمات کا مرکز اور مسلمانوں کے بگاڑ کی جڑ اور اصل قرار دینا ہے، اس پہلو کو یہاں کی فرقہ پرست اور بھاجپا ذہنیت کی تنظیموں نے تو بہت جلد اور پورے اعتماد کے ساتھ قبول کر کے اپنی سرگرمیوں کا نمایاں حصہ بنا ہی لیا تھا، نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت اور انتظامیہ نے بھی اسی جھوٹے اور خلافِ واقعہ پروپیگنڈہ کی نظر سے مدارسِ اسلامیہ کو دیکھنا اور اسی کے موافق معاملہ کرنا شروع کر دیا ہے، جس کے نتیجہ میں ابنائے وطن، اور برادرانِ ملک کی نظروں میں "مدارسِ اسلامیہ" اور ان سے وابستہ خدمتگذاروں کا ملک وملت کے بارے میں صاف ستھرا کردار مشتبہ ہوکر رہ گیا ہے۔ حالانکہ "مدارس اسلامیہ" کوئی ڈھکے چھپے ادارے نہیں ہیں، کسی کو آنے ملنے دیکھنے اور معلومات حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، اسکی کوئی انڈر گراؤنڈ ایکٹی وٹیز نہیں ہیں، عسکری تربیت تو انمیں کیا ہوتی حفظانِ صحت کی بنیادی تدابیر اور ہلکی پھلکی جسمانی ورزشوں کا تک انتظام نہیں ہے۔ قوم کے بچوں کو صبح وشام اللہ رسول ؐ کی باتیں سکھانا ان پر عمل کرانا اور اخلاقی وانسانی اقدار کی عظمت کو ان کے ذہنوں میں اجاگر کرنے کی کوشش کرنا مدارسِ اسلامیہ کا کام ہے۔

قارئین کرام! فضلائے مدارس نے ملک کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، وہ ملک کی سلامتی وتحفظ کیلئے ہمیشہ پیش پیش رہے، جمعیۃ العلماء فضلاء مدارسِ دینیہ کی ایک تنظیم ہے جو نوے سال سے ملک میں موجود اور ہر ہر شہر میں قائم ہے، تمام سیاسی راہنما اس سے واقف ہیں، کیا یہ تنظیم کبھی کسی غیر سیکولر اور غیر قانونی ملک دشمن سرگرمی میں ملوث ہوئی ہے؟ جبکہ اس میں سب علماء ہیں یہ مدارسِ اسلامیہ کی تربیت کا فیضان نہیں تو اور کیا ہے؟ جدوجہد آزادی میں مسلمانوں نے ایک مذہبی اور دینی فریضے کے طور پر حصہ لیا بلکہ قیادت کی ہے، اسکے باوجود حکومت

میں شرکت کے لئے کبھی کوئی رسہ کشی نہیں کی، یہ مدارسِ اسلامیہ اور علماء کرام کی تعلیم کا ثمرہ نہیں تو اور کیا ہے؟ آج بھی ملک کے ہزاروں مدارس لاکھوں طلبہ کی تعلیم وتربیت کر رہے ہیں، مدارس کے فارغین جہاں کہیں ہیں وہاں پابندِ ڈسپلن شہری ہیں، وہ ملکی قوانین کی دوسروں سے زیادہ رعایت کرتے ہیں، رواداری ومحبت ان کا امتیاز ہے، نفرت وبغض سے کوسوں دور ہیں، گاؤں سے لیکر شہروں تک دیکھ لیا جائے کہ اپنے دین وایمان کے تحفظ کی فکروں، مسلمانوں کی فکری ونظری راہنمائیوں اور مخلوقِ خدا کی حتی المقدور خدمتوں، اپنی مختصر سی روزی روٹی کے انتظام کے علاوہ ان کی کوئی دوسری مصروفیت بھی ہے؟ یہ پُر امن ذہن ان لاکھوں علماء اور طلبہ کو مدارسِ دینیہ کے ماحول نے نہیں دیا تو پھر کس نے دیا؟ ایک آدھ عالم یا طالبعلم کسی غلط سرگرمی کی مثال ہے تو ہم بھی اس کا انکار نہیں کرتے، برا کہنے میں ہم سب کے برابر ہیں، لیکن کیا دو ایک مثالیں کسی بھی عقلمند کے نزدیک پوری قوم کو موردِ الزام ٹھیرانے اور ان کی تصویر وشبیہ کو بدل دینے کا سبب ہوسکتی ہیں؟ کیا اس قسم کے واقعات اس سے بھی کہیں زیادہ دیگر اقوام میں نہیں پائے جارہے ہیں؟ یہودی، عیسائی، اور دنیا کی دیگر اقوام، اسی طرح ہمارے ملک کی بہت سی غیر مسلم تنظیموں اور افراد میں کیا ایسے جرائم بالکل نہیں ہوتے؟ اور کیا آئے دن اخبارات میں خود حکمران جماعت کے افراد کے ایسے واقعات سامنے نہیں آتے؟ اگر آتے اور یقیناً آتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "دہشت گردی" کو صرف اسلام اور مدارسِ اسلامیہ سے منسوب کردینا اور بقیہ تمام اقوام کو اس سلسلہ میں معصوم و بے خطا سمجھ کر نظر انداز کردینا کہاں کا انصاف ہے؟

قارئین کرام! جہاں تک اسلام اور اس کی تعلیمات کا مسئلہ ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جس نے مصالحت ومفاہمت، امن وآشتی،

اور عدم تشدد کو اولین ترجیح دی ہے، آپ سوچیں کہ جس قرآن کریم نے ”توحید“ ـــــ جو بندوں کے خالق کا بنیادی اور لازمی حق ہے ـــــ کے معاملہ میں بھی تشدد کو روا نہیں رکھا، خود کو ”رب“ قرار دینے والے کے پاس اپنے نبی کو بھیجتے ہوئے ”قولا له قولا ليناً“ کہہ کر اس سے نرمی و سنجیدگی کے ساتھ بات کرنے کا حکم دیا، ”شرک“ کو بدترین جرم فرمایا، لیکن اس کے مرتکبین کو بھی آخرت کے انجامِ بد سے خبردار کر دینے کے بعد ”فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ“ کہہ کر دنیا کی حد تک انسانوں کو فیصلے کی شخصی آزادی دی، ایک انسان کے ناحق قتل کو ”فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً“ کہہ کر پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا، ”لاتُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ“ اور ”اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ“ کہہ کر بدامنی وفتنہ سامانی کو سخت ترین جرم بتلایا، ”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ“ اور ”لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ“ کہہ کے انسانیت کے بلندترین مقام اور اسکے احترام کو لازم کر دیا، ”اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى“ کہہ کر اپنے ماننے والوں کو اخوت و بھائی چارگی کی تعلیم اور ذات پات، اونچ نیچ کی عدم تقسیم کا پابند کیا، ”لاَ تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ“ کہہ کر ایک دوسرے کے اموال واملاک کو تحفظ فراہم کیا، ”وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ“ کہہ کر عام معاملات میں عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق عطا کئے، ”لاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا“ کہہ کر اختلافِ دین و مذہب کے باوجود ناانصافی وزیادتی سے بچنے کی تاکید کی، ”لاَ تَسُبُّوْا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ کہہ کر غیراللہ کی پرستش کرنیوالوں کو تک بُرا بھلا کہنے سے روک دیا۔ کیا اس قرآن کو آسمانی کتاب اور خدائی پیغام سمجھنے والے مسلمان، ان تعلیمات کے باوجود فساد اور بدامنی کو پسند کر سکتے ہیں؟

اسی طرح جس مذہب کے نبی نے"**الناس بنو آدم و آدم خلق من تراب**" کہہ کر تمام انسانوں کا ایک ماں باپ کی اولاد ہونا اوران کی حقیقت کا ایک ہونا بتلایا ہو،"**الخلق عیال اللّٰہ فاحب الخلق الی اللّٰہ من احسن الی عیالہ**" کہہ کرانسانیت کے احترام کوشاندار و بے مثال طریقہ پر یقینی بنایا ہو،"**ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء**" کہہ کر تمام زمین والوں سے رحمدلی وہمدردی کے سلوک کا حکم دیا ہو، حتیٰ کہ جس کی رحمدلی نے کسی جانور کی حق تلفی کو تک گوارانہ کیا ہو، اونٹ کو ٹیک لگا کے بیٹھنے پر بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، چڑیا سے اسکے بچے کو جدا کر لینے پر بھی جس کا دل بھر آیا ہو، وہ نبیؐ کیا اپنی امت کو خون خرابے، قتل وغارتگری، اور فتنہ وفساد کی تعلیم دے سکتا ہے؟ اوراس نبی کواوراس کی ایک ایک ادا کو متاعِ جان سے بھی زیادہ محبوب رکھنے والے اس کے اُمتی کیا ان تعلیمات کے برخلاف بلاوجہ ظلم وتشدد کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں!

پھر وہ مدارس ومراکز جو اللہ کی اسی مبارک کتاب اور اسکے نبی کی ان سراپا رحمت ارشادات کی تعلیم وتعلم کیلئے قائم کئے گئے ہیں، جہاں دن رات یہی سب باتیں پڑھی پڑھائی جاتی ہیں، ان مدارس اسلامیہ کو اگر دہشت گردی کے اڈے اور Terrorism کے سنٹرز قرار دیا جائے، اور جانتے بوجھتے ان کی شبیہ وتصویر کو بگاڑ کر پیش کیا جائے، تو آپ ہی بتلایئے کہ اس پر ہم کیسے خاموش بیٹھ سکتے ہیں؟ یہ صرف اہل مدارس ہی کیلئے نہیں پورے عالم کے مسلمانوں کے لئے انتہائی تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت صورتحال ہے، اس وقت سارے عالم کے مسلمان خصوصاً ہندوستانی مسلمان ـــــ جو اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت اوراس ملک کی تہذیب وروایت کا اٹوٹ حصہ ہیں ـــــ حکومت اور انتظامیہ کے اس طرزِ عمل بالفاظِ دیگر سرکاری دہشت گردی سے سخت بے چینی اور تشویش میں مبتلاء ہیں۔ یہ

رویہ ہم امن پسندوں اور ملک وملت کے وفاداروں کیلئے کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتا، کیونکہ جہاں ہم ظلم کرنے کو حرام سمجھتے ہیں ظلم سہنے کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں! اسلئے اُم المدارس دارالعلوم دیوبند نے ضرورت محسوس کی کہ پورے ملک میں اہلِ مدارس اس قسم کے اجلاس قائم کرکے میڈیا کے توسط سے انتظامیہ اور بردرانِ وطن بلکہ اقوامِ عالم کو بتائیں کہ مدارسِ اسلامیہ کا حقیقی کردار اور اسلامی تعلیمات کی صحیح تصویر کیا ہے؟ اسکے برخلاف مغربی افکار اور فرقہ پرست طاقتوں کا جھوٹا پروپیگنڈہ کیا ہے؟

چنانچہ "رابطۂ مدارسِ اسلامیہ عربیہ" نے سب سے پہلے سرزمینِ دیوبند اور دارالعلوم کے وسیع دامن پر ۲۵/فروری ۲۰۰۸ء کو ایک عظیم الشان "کل ہند مخالف دہشت گردی کانفرنس" منعقد کی، جس میں ملک کے تمام اسلامی مکاتبِ فکر کے سربراہوں نے شرکت کی اور ایک زبان ہوکر اس عالمی جھوٹ وبہتان سے اپنی برأت وناراضگی ظاہر کی اور ملکی انتظامیہ کے اس طرزِ عمل اور انداز نظر کا ملک کی یکجہتی کیلئے مضر ونقصان دہ ہونا واضح کیا۔ اسی مرکزی اجلاس میں یہ تجویز بھی پاس ہوئی کہ ملک کی تمام ریاستوں میں اس غرض ومقصد کے لئے ریاستی سطح کے "مخالف دہشت گردی اجلاس" منعقد کیے جائیں اسی کی تعمیل میں ریاست کے تمام مکاتبِ فکر کی اشتراکیت سے آج کا یہ متحدہ اجلاس بھی منعقد ہورہا ہے جس میں آپ نے شرکت کی زحمت فرمائی ہے۔

# مدرسین کی خدمت میں چند معروضات

چند برس پیشتر مجلس علمیہ آندھراپردیش کے زیراہتمام اساتذہ مدارس دینیہ کا ایک تربیتی کیمپ منعقد ہوا تھا، اس میں شرکت اور خطاب کا ذمہ داران مجلس کی جانب سے احقر کو بھی حکم ملا تھا، مگر مسلسل اسفار کی وجہ سے نہیں پہونچ سکتا تھا اسلئے چند معروضات لکھ کر ارسال کردی گئی تھیں۔

**الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین اما بعد**

جناب صدر، حضرات علماءواساتذہ!

اللہ تعالیٰ کے بے پناہ افضال وانعام کا ہم ناتواں کیا شکریہ ادا کرسکتے ہیں، پہاڑوں سے زیادہ بھاری نعمتیں ہواؤں سے زیادہ تیزی کے ساتھ اس نے ہماری جانب بھیجی ہیں، انہیں نعمتوں میں ایک عظیم نعمت علمِ دین ہے، کیونکہ علم دین ہی انسان کو مقاصد حیات سے باخبر اوراس کی تحصیل کیلئے متفکر بناتا ہے، اس کے بغیر انسان اپنے خالق ومالک کی معرفت نیز زندگی کی غرض وغایت سے کلیۃً غافل اور اسکی تحصیل کی فکر سے عاجز وبے خبر رہتا ہے۔اسی لئے قرآن وحدیث میں علم کے بڑے فضائل آئے ہیں اوراس کے بالمقابل جہل کی برائی ونقصانات کھول کھول کر بیان کئے گئے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ایک جگہ ارشاد ہے" علماء اور جہلاء برابر نہیں ہوسکتے" ایک جگہ اس کی فضیلت پر لطیف پیرائے میں روشنی ڈالتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم کی زیادتی مانگتے رہنے کی تعلیم فرمائی گئی ہے، اسی طرح اس کو کہیں نور اور روشنی سے تعبیر فرمایا گیا ہے تو کہیں اس کے حاملین کو خصوصی درجات

کی خوشخبری سنائی گئی ہے، کسی جگہ اسے خشیت الٰہی اور خوفِ خداوندی کا ذریعہ اور وسیلہ قرار دیا تو کہیں اس کی جانب توجہ نہ کرنے والوں پر خفگی اور ناراضگی کا اظہار فرمایا گیا ہے، غرض یہ کہ قرآن مجید کے بیشتر مقامات پر اللہ تعالیٰ نے مختلف انداز واسلوب میں علم دین کی اہمیت وفضیلت کو واشگاف کیا ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کو "معلمِ کتاب وحکمت" کا خطاب عطا فرما کر علم دین کے فضل وشرف کو نقطۂ عروج تک پہونچا دیا ہے۔

اس سلسلہ میں جہاں تک ارشادِ نبوی اور تعلیماتِ محمدی کا تعلق ہے تو وہ اس قدر زیادہ ہیں کہ اس مختصر مضمون میں ان کا احاطہ اور احصاء مشکل ہے، یہی کیا کم ہے کہ معلمِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے اور واضح الفاظ میں اعلان فرما دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو سعادت کا تاج پہنانا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے دین کی فقہ اور اس کی سوجھ بوجھ عطا فرما دیتے ہیں۔ ایک موقعہ پر آپؐ نے اس دنی دنیا کی ہر چیز کو ملعون قرار دیتے ہوئے عالم وطالب علم کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا، اسی طرح آپ نے علومِ حدیث کے سیکھنے اور سکھانے والوں کے لئے سرسبزی وشادابی کی دعا فرمائی ہے، اور علمِ دین کی ترغیب وتحریص میں یہاں تک فرما دیا کہ طالب علم تحصیلِ علم سے فارغ ہوکر گھر لوٹنے تک اللہ تعالیٰ کے راستہ میں شمار کیا جاتا ہے، اسی سلسلہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ طالبِ علم کو تحصیلِ علم کے دوران جس قدر مسافت ارضی طے کرنی پڑتی ہے اسی قدر اللہ تعالیٰ اس کو جنت سے قریب تر فرما دیتے ہیں، نیز یہ بھی آپ کا ارشاد ہے کہ کائناتِ ارضی وسماوی کی تمام مخلوقات طلباء وعلماء کی اس مقدس جماعت اور مبارک طبقہ کی مقبولیت ومغفرت کیلئے دعاؤں میں مصروف رہتی ہیں حتی کہ مچھلیاں پانی میں اور چیونٹیاں اپنی بلوں میں ان کیلئے دست بدعا رہتی ہیں، کبھی آپ نے علم کو انبیاء کا ترکہ اور ورثہ

قرار دے کر اس کے حاملین کو اپنی جانشینی کا شرف عطا فرمایا اور کبھی ان کے سونے کو عابدوں کے جاگ کر عبادت کرتے رہنے پر فضیلت دی، چنانچہ علومِ دینیہ کے حاملین کی غیر عالم عابدوں پر فضیلت کی مثال دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا جیسے چاند کو ستاروں پر فوقیت حاصل ہے، ایک دفعہ تو یہاں تک بھی فرمایا کہ مجھ کو ایک ادنیٰ امتی پر جو فضیلت حاصل ہے ایسی ہی فضیلت عالم کو عابد پر ہے۔

پھر ان علومِ دینیہ میں قرآن مجید کی تعلیم کو سب سے زیادہ فضیلت حاصل ہے اسلئے کہ مثل مشہور ہے" بادشاہ کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوا کرتا ہے"، تمام علوم علمِ قرآن کے مقدمات اور اس کی تشریح وتفہیم کے لئے بطور ذریعہ وآلہ کے ہیں، علماء کرام نے قرآن مجید کے تین حقوق بیان کئے ہیں، اسکے الفاظ کی صحت، اس کے معنیٰ کا علم، اور اس کے تقاضوں کی تکمیل، جہاں تک قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے کی فضیلت کا تعلق ہے تو خود قرآن نے اپنی تلاوت کے فضائل وبرکات اور اس کے درس وتدریس کے ثمرات کو بکثرت جابجا بیان فرمایا ہے، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ربانی ہے" ہم نے قرآن کریم کو بہت آسان یعنی سہل التلفظ اور سہل التذکر بنادیا ہے تو ہے کوئی یاد کرنے یا نصیحت حاصل کرنے والا؟" اور کسی جگہ غفلت برتنے والوں سے شکایت کے انداز میں یوں ارشاد فرمایا" مسلمانو! کیا تم اللہ تعالیٰ کی کتاب میں غور وفکر نہیں کرتے یا پھر تمہارے دلوں پر (غفلت ولا پرواہی) کے تالے لگ گئے ہیں؟" کہیں نبی کی زبان سے قیامت کے دن حقوقِ قرآن کے تارکین کی شکایت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ نبی فرمائیں گے:" پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو نظر انداز کردیا اور پس پشت ڈال رکھا تھا" اور کہیں خود نبیؐ کو خطاب کرکے ہدایت دی گئی ہے کہ" قرآن کو خوب صاف صاف اور عمدہ طریقہ سے پڑھا کیجئے" اسی طرح ایک جگہ صحابہؓ کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے ایک

صفت خصوصاً یہ بیان فرمائی کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، یہ تو چند نمونے ہیں ورنہ قرآن کریم سارا کا سارا اپنی فضیلت واہمیت کے بیان سے بھرا ہوا ہے۔

رہ گئیں احادیث تو وہ بھی بے شمار ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس کے ایک ایک حرف کی تلاوت پر دس دس نیکیوں کا وعدہ فرمایا گیا ہے، یہ بھی فرمایا گیا کہ قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے پڑھنے پڑھانے کیلئے لوگ کسی جگہ پر جمع ہوجائیں تو فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے اور سکینہ نازل کی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ بطور فخر ومباہات کے ان کا تذکرہ فرشتوں کی مقدس جماعت میں فرماتے ہیں، اسی طرح ایک دعاء میں آپ ؐ نے اللہ تعالیٰ کے اسماءِ خاصہ کا وسیلہ لے کر اللہ تعالیٰ سے یوں عرض کیا ہے کہ "یا اللہ! قرآنِ عظیم کو میرے دل کی بہار اور آنکھوں کی روشنی اور غموں کا مداوا اور فکروں کی جلا بنا دیجئے"۔ نیز آپ ؐ نے حفاظ قرآن کو امت کا شریف ترین طبقہ قرار دیا ہے، باعمل حفاظ کے والدین کو قیامت کے دن سورج سے زیادہ روشن تاج پہنا کر سر محشر عزت افزائی کا مژدہ سنایا ہے، اور اس کے پڑھنے اور پڑھانے کو بہترین مصروفیت قرار دیا ہے، اس کی آیات کو سیکھنے اور حفظ کرنے کو سرخ اونٹوں کے حاصل ہونے سے بدرجہا بہتر بتلایا ہے، اسکے برخلاف جس کے سینہ میں قرآن کا کچھ حصہ بھی محفوظ نہ ہو اسے اجاڑ گھر سے تعبیر فرمایا ہے، یہ اور ان کے علاوہ الغرض بہت سے فضیلتیں ترغیب، تحریص کے سلسلہ میں بیان فرمائی گئی ہیں، لیکن یہ سب اس وقت ہے جب کہ اسکے ظاہری اور معنوی دونوں حقوق ادا کئے گئے ہوں ورنہ جتنی فضیلتیں اس کی تحصیل پر وارد ہوئی ہیں اس سے کہیں زیادہ وعیدیں اس کے حقوق تلف کرنے پر منقول ہوئی ہیں۔

بہر حال! انہی فضیلتوں کی تحصیل اور اسکے تحفظ کے لئے حضرات علماء کرام نے ہندوستان کے چپہ چپہ اور کونے کونے میں مدارسِ دینیہ وقرآنیہ کا ایسا جال پھیلایا

ہے کہ اس کی برکت سے اس ملک میں قرآن وحدیث کے علوم زندہ وتابندہ ہیں، اورعوام الناس مذہبی شعوراور دینی غیرت وحمیت سے آراستہ ہیں، دن بہ دن حفاظ کرام اور علماء ذی احترام کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، دیگر مما لک بلکہ مما لکِ اسلامیہ کے مقابلہ میں بھی یہ خطہ دینی امتیاز کے اعتبار سے ایک خاص مقام رکھتا ہے، اورانہی مدارس دینیہ کی برکت اوران کا اثر ورسوخ ہے کہ سارے عالم اسلام میں مذہبی وتہذیبی انارکی پیدا کر کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت میں سلا دینے کے باوجود آج یورپین قیادتوں اوراسلام دشمن طاقتوں کو ہندوستانی مسلمانوں پر بری نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہورہی ہے، اسی لئے انہوں نے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کی طرح راست حملے کے بجائے ہندوستان کے مسلمانوں سے بالواستہ تہذیبی جنگ چھیڑ رکھی ہے، اسلامی شناخت وامتیاز کو مغربی تہذیبی یلغار میں ضم بلکہ گُم کردینے اور خودساختہ عالمی کلچر کا حصہ بنادینے کیلئے نت نئے ہتھکنڈے استعمال کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں، مدارسِ دینیہ کی تاثیر وقوت کا یہ خوش آئند اور ہمت افزا پہلو ہے، اورمبنی بر حقیقت ہے، لیکن اسکے ساتھ ہی ایک پہلو آج کل یہ افسوسناک اور مایوس کن جو ظاہر ہورہا ہے وہ مدارس دینیہ میں پیدا شدہ تعلیمی، تربیتی اورانتظامی اضمحلال اور جمود ہے، کیونکہ آج کل ان کا معیار علی العموم ابتر ہوتا جارہا ہے، تعمیرات کی طرف توجہ زیادہ اور تعلیم وتربیت کی جانب کم ہوگئی ہے، الا ماشاء اللہ

علومِ جدیدہ کے ماہرین یا حاملین نے جواعتراضات کا سلسلہ مدارسِ دینیہ کی بدعنوانیوں سے متعلق چلایا ہوا ہے، میں ذاتی طور پر ان کے اعتراضات کی بڑی مقدار کو موجودہ حالات کی روشنی میں معقول سمجھتا ہوں، البتہ ان کی تجویزات اصلاح اور محقرانہ انداز سے قطعاً متفق نہیں ہوں، تاہم ان لوگوں کے اعتراضات محض اعتراض سمجھ کر رد کردینے کے بجائے اس کے معقول حصہ کو تسلیم کرنا اور قرآن

وحدیث اور سلف کی تعلیمات کی روشنی میں ان کی درستی واصلاح کی کوشش کرنا ضروری سمجھتا ہوں، چنانچہ اس سلسلہ میں اس نمائندہ اجتماع مدرسین کے سامنے چند معروضات پیش کرنیکی جسارت کرتا ہوں، اگر مناسب معلوم ہوں تو قبول فرما کر انکی جانب توجہ فرمائی جائے ورنہ رد فرما دیا جائے۔

(ا) غرض وغایت کی تلقین:-

ہم لوگوں نے تدریس کا مقصد ارادۃً یا کم از کم عملاً علی العموم حصولِ معاش سمجھا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مدرسوں میں معیارِ تعلیم کی گراوٹ اور اخلاق وکردار کے انحطاط کی طرف اکثر وبیشتر اساتذہ کرام مطلق توجہ نہیں دیتے جب کہ مدرسہ قائم ہی نونہالانِ ملت کی علمی وعملی ترقی واستعداد کیلئے کیا جاتا ہے۔ بعض جگہ خود ذمہ داروں کو بھی توجہ نہیں ہے، بعض جگہ ذمہ دار تو اس سلسلہ میں متفکر ہوتے ہیں لیکن مدرسین کا ضابطہ کے کام اور محض ملازمت مزاج اس مقصد کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے اسی مزاج کے نتیجہ میں مندرجہ ذیل خامیاں وجود میں آتی ہیں۔

(الف) وقت پر حاضری اور وقت پر روانگی کا اہتمام نہیں ہوتا۔

(ب) رخصت لینے کیلئے ضرورت کے درجہ تک انتظار نہیں کیا جاتا، بلکہ ہر معمولی وجہ سے رخصت حاصل کر لی جاتی ہے۔

(ج) مدرسہ آنے کے باوجود اوقات کار کو جس طرح کام میں استعمال کرنا چاہیے نہیں کیا جاتا، بلکہ سستی ولاپرواہی اور غفلت کے ساتھ کام کرتے ہوئے گھنٹی کا انتظار ہوتا رہتا ہے۔

(د) طلباء کرام کی لیاقت واستعداد اور ان کی نفسیات سے باخبر رہنے کی طرف دھیان نہیں ہوتا، نتیجۃً بے استعداد وشوخ طلباء مزے کرتے ہیں اور ذی استعداد و باذوق بچے اپنی ترقی سے مایوس رہتے ہیں۔

(ہ) طلباء کے اخلاق واقدار کی نگرانی اور افہام وتفہیم کے ذریعہ مزاج سازی کو اپنا فرض نہیں سمجھا جاتا۔

(و) منتظمین کی جانب سے دار وگیر ہوتے ہی مزید نافرمانی کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے یا پھر استعفیٰ کا پیش کش کردیا جاتا ہے۔

(ز) اور اگر ذرا اچھی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں تو اسی جگہ دوسرا مدرسہ قائم کر کے بستی میں خلاف وشقاق اور جوڑ توڑ کی مسموم فضاء بنادیتے ہیں۔

یہ اور اس جیسی بہت سی کوتاہیاں اساتذہ کی جانب سے "مقصدِ تدریس" کو صحیح طور پر متعین نہ کرنے کی وجہ سے مدارس میں پیدا ہوگئی ہیں، اسلئے ضروری ہے کہ ہم اپنا مقصد تدریس "قرآن کریم اور علومِ دینیہ کے تحفظ واشاعت کے ذریعہ رضاء الٰہی واجر اخروی کی تحصیل" کو بنائیں پھر انشاء اللہ خدمت اور قناعت کا جذبہ ہمارے اندر ضرور پیدا ہوگا اور اس طرح مدارس دینیہ کی رونق رفتہ لوٹ کر آجائیگی۔

(۲) طریقۂ تعلیم:-

ہمارے یہاں طریقۂ تدریس وتعلیم جدید نفسیاتی طرز کے لحاظ سے تیسرے درجہ کا ہے، ہمارے معلمین کے اندر اپنے فن میں مہارت اکثر نہیں پائی جاتی اور نہ ہی پیدا کرنے کی فکر وسعی ہوتی ہے، نتیجۃً اب تعلیمی نظام قابلِ افسوس حد تک گر گیا ہے، چند کوتاہیوں کی طرف ذیل میں نشاندہی کی جارہی ہے۔

(الف) بہت سی جگہوں پر نورانی قاعدہ کے پڑھانے والے ضروری تجوید سے بھی واقف نہیں ہوتے ہیں، یا واقف ہوتے ہیں لیکن طلباء پر اتنی محنت نہیں کرتے کہ کم از کم اپنی طرح انھیں پڑھنا آجائے۔

(ب) اگر کوتاہیاں علم میں لائی جائیں تو اپنی کوتاہی کو تسلیم کرنے اور اسے درست کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔

(ج) ناظرہ پڑھانے والے اساتذہ کرام بچوں میں روانی، تجوید اور لحنِ جلی وغیرہ کی کمی پر نظر نہیں رکھتے بلکہ طالب علم سبق سناتے ہی استاذ تاریخ ڈال کر چلتا کر دیتے ہیں، جس سے بنیاد ہی غلط پڑتی ہے، کیونکہ قاعدہ ناظرہ، حفظ کی بنیادیں ہیں۔

(د) حفظ کے اساتذہ مقدار پر تو دھیان دیتے ہیں لیکن معیار کو ضروری نہیں سمجھتے طلباء آگے بڑھتے رہتے ہیں اور آموختہ خام ہوتا رہتا ہے، بعض دفعہ تو نہیں پڑھے ہوئے کے مانند ہو جاتا ہے اور لحنِ جلی کی بھی کثرت پائی جاتی ہے۔

(ہ) بعض اساتذہ کو دیکھا گیا کہ وہ خارجی مصروفیات اس قدر بڑھا لیتے ہیں کہ مدرسہ میں گویا کچھ ذرا آرام لینے کیلئے پہونچتے ہیں، چنانچہ طالب علم سنانا شروع کرتا ہے اور وہ سونے لگتے ہیں، جب وہ کہتا ہے کہ "مولوی صاحب" میں سنا چکا، تب بیدار ہو کر اگلی تاریخ ڈال دیتے ہیں۔ کیا ٹھکانہ ہے اس ظلم و بددیانتی کا؟

(و) تدریس میں بعض اساتذہ شفقت و ترحم کا نام بھی نہیں لیتے ظلم و تشدد کے ذریعہ طالب علم پر ایسا مسلط رہتے ہیں کہ وہ دور سے دیکھ کر گھبرا جائے، حالانکہ استاذ کو چاہیے کہ اپنے وقار کا لحاظ رکھتے ہوئے طلباء پر اس قدر مشفق ہو کہ طالب علم اس سے صرف عقیدت ہی نہیں محبت بھی رکھیں۔

(ز) درسگاہ کا ماحول صاف ستھرا اور علمی سرگرمیوں سے معمور نہیں رہتا، عام طور سے تفہیم اسباق، رفع موانع، اور طلبہ کی ہمت افزائی کے نفسیاتی اصولوں سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔

(ح) سبق کی مقدار، ذمہ داری کے بوجھ، اسی طرح سزاؤں کے دینے میں طلباء کی عمر، لیاقت، اور صحت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ اندھا دھند کام چلایا جاتا ہے، جو نہایت ہی بھونڈا اور نامعقول طریقہ تدریس ہے۔

(ط) تختہ سیاہ کا استعمال تو اب ہمارے مدارس میں تقریباً ترک ہو گیا ہے۔

درانحالیکہ مبتدی طلباء کو پڑھانے میں وہ بہت ہی زیادہ مددگار رہے، مبتدی اور کمسن طلبہ خصوصیت کے ساتھ سمع کے مقابلہ میں نظر کے ذریعہ زیادہ اخذ کرتے ہیں۔

(ی) حفظ کے اساتذہ بعد مغرب کی تعلیم اپنی نگرانی میں نہیں کراتے جبکہ اس کے بغیر تعلیم میں پختگی کا مطلوبہ معیار حاصل نہیں ہوسکتا نیز حفظ شروع کرانے میں تعجیل سے کام لیتے ہیں جو طالب علم کیلئے بوجھ اور بعض وقت مایوسی کا سبب ہوجاتا ہے (والدین کی عجلت کیوجہ سے اپنا معیار تعلیم گرالینا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔)

(ک) درجاتِ حفظ کے اساتذہ اکثر و بیشتر ضروری اصول وقواعد اور بنیادی اصلاحات تجوید سے بھی بے بہرہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے طلبہ صحیح معنوں میں مجود نہیں ہوتے، افراط وتفریط کے شکار ہوجاتے ہیں۔

(ل) قاعدہ میں تختی بہ تختی اور قرآن مجید میں پارہ بہ پارہ امتحان وجانچ کا رواج نہیں ہے اس لئے خامیٔ آموختہ کی اطلاع دیر سے ہو پاتی ہے اسی طرح مقدار آموختہ بہت قلیل ہوتی ہے جو ہرگز مناسب نہیں ہے، ہر طالب علم کا یومیہ آموختہ اوسطاً اسقدر ہونا چاہیے کہ ایک ہفتہ میں اس کا دور ہوجائے۔

اس سلسلہ میں مجھے اور بھی کچھ باتیں کہنی تھیں، مگر پہلے سے مرتب پرگراموں کی وجہ سے اس سے زائد وقت نہ نکل سکا اسلئے اسی پر اکتفاء کرتا ہوں۔

نیز میری معروضات کی بابتہ میں خوب سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات کے سامنے چھوٹا بڑی بات کے مترادف ہے، لیکن تعلیمی میدان میں شد بد خدمت کا گذشتہ چندسالوں سے کچھ موقع ملا ہوا ہے، اپنے تجربات کی روشنی میں حسب الحکم ”نائبِ ناظم صاحب مجلسِ علمیہ“ یہ جسارت کی گئی ہے۔

# قرآن کریم اور زمانے کے فتنے

بابری مسجد کی شہادت کے بعد پیش آئے حالات اور اس کے باوجود مسلمانوں کے معاشرہ کی بے حسی و بے راہ روی کے حوالہ سے لکھا گیا ایک مضمون جس کا مقصد صرف "ہجرت مما نھی اللہ عنہ" کی دعوت دینا ہے۔

**الحمد للّٰہ و کفیٰ سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد !**

اس وقت مسلمانوں کی حالت عالمگیر پیمانے پر تباہ و برباد ہوتی جارہی ہے، دن بہ دن حالات خراب ہورہے ہیں، تمام اسلامی و عربی ممالک بھی عجیب سیاسی و دینی کشمکش میں مبتلاء ہیں اور ہمارا پڑوسی ملک تو (خدا رحم فرمائے) اسلاف کرام کا خون پی کر بھی ان کے خوابوں کی تعبیر بن نہ سکا، ہمارے ملک ہندوستان میں گو اس طرح دین و ایمان کے بگڑنے اور اعمال و احکام سے بے اعتنائی برتنے کی کیفیت ان ممالکِ اسلامیہ اور بلادِ عربیہ سے کم سہی مگر جانی و مالی اعتبار سے عجیب بے چینی و پریشانی کے ماحول میں جی رہے ہیں۔

برادرانِ وطن میں سے بعضے طبقے بغض و عداوت، حسد و منافرت کی فضاء کو ہوا دینے اور اسے مشتعل کرنے میں سرگرم عمل ہیں، قون کو حمیتِ جاہلیہ کے سبق دیئے جارہے اور انسانیت کے آداب مٹائے جارہے ہیں، اور ان سب سے زیادہ حیرت انگیز و تعجب خیز بات یہ ہیکہ کفار و مشرکین، یہود و نصاریٰ اور تمام غیر مسلمین تو اپنی فرقہ بندی ترک کر کے اور مذاہب و قبائل کے اختلافات سے بالا ہو کر پورے عالم میں مسلمانوں کے خلاف اکھٹے ہورہے ہیں لیکن مسلمان ایسے گوناگوں اور پریشان

کن حالات میں بھی ایک طرف تحزب وتعصب، خاندانی و جماعتی عصبیت میں سخت سے سخت ہوتے جا رہے ہیں، تو دوسری طرف خدا بیزاری و مذہب ناشناسی میں خطرناک حد تک پہونچ رہے ہیں، تیسری طرف گھر گھر سے ذکر وفکر کے بجائے گانے بجانے، کھیل تماشوں کی آوازیں آرہی ہیں، نوجوان آوارگی اور گلی کوچوں کی گردش میں اپنا وقتِ عزیز برباد کر رہے ہیں، بہو بیٹیاں بے آبروئی و ذلت واہانت کے واقعات اخباروں میں پڑھنے کے باوجود اپنے آپ کو زیب و زینت سے سنوار کر بے پردہ کرتی پھرتی رہی ہیں، بڑے بوڑھے حالات پر تبصرہ کرنے عالمگیر سیاست پر رائے زنی کرنے کی بیٹھکوں میں نمازوں تک سے بے خبر ہوکر زندگی ضائع کر رہے ہیں، پوری ملت کا ملک گیر پیمانہ پر کوئی قائد ایسا نہیں جس کی آواز پر سب مسلمان ایک ہوسکیں، اور نہ ہی مختلف قائدین کے ملت کی خاطر جڑتے اور متحد ہونے کے آثار نظر آرہے ہیں، جس کے نتیجہ میں حالات سے نمٹنے کیلئے نوجوان کوئی اور پروگرام بنا رہے ہیں، بوڑھوں کا کچھ اور خیال ہے، علماء کسی اور نظام کے داعی ہیں، سیاسی لیڈر کسی اور راستہ پر بلا رہے ہیں، پھر ان میں سے ہر طبقہ میں بیسیوں نظریات وخیالات کے حامل علاحدہ علاحدہ گروپس ہیں، کسی کے نزدیک خدا پر بھروسہ کر کے خاموش ہو جانا چاہیے، کوئی کہہ رہا ہے کہ کیوں خاموش رہیں؟ جانیں قربان کر دینا چاہیے، کوئی کہتا ہے کہ ہزاروں مسجدیں گئیں ایک مسجد کا کیا ہے؟ کسی کا خیال ہے کہ مٹی کی اینٹیں اور پتھر کے ٹکڑے انسانوں کے خون سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، کسی کی نظر میں جہاد کا وقت آگیا ہے تو کسی کی نگاہ میں صبر وتحمل کی مدت پوری نہیں ہوئی ہے یہ اور اس طرح کے کتنے خیالات ونظریات ہیں جنہیں اس وقت صفحہ قرطاس پر سمیٹنے کا نہ موقع ہے نہ وہ مقصود ہے۔

عرض کرنا یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خون اور آنسوؤں کے صدقہ

میں تیار شدہ یہ امت یونہی اپنے اپنے جذبات وخواہشات کے کروڑوں راستوں پر سرگرداں ہوتی رہے گی یا اس کے لئے کوئی ایک ایسا راستہ بھی مہیا ہوسکتا ہے جو سہولت، راحت اور عزت کے ساتھ منزلِ مقصود سے ہمکنار کردے، مصائب و آلام، کرب و بے چینی، مظلومیت ومقہوریت، ذلت ورسوائی، بے کسی و بے بسی، تشتت و پھوٹ، ناامیدی ومایوسی کے ان گھٹاٹوپ اندھیروں سے نکال کر، راحت وآرام، چین وسکون مسرت وشادمانی، فرحت وانبساط کے روح افزاء مقام پر پہونچادے۔

غور فرمائیے! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ شفیق وکریم اور رؤف ورحیم نبیؐ نے ایسا کوئی راستہ اپنی چہیتی امت کیلئے نہیں چھوڑا بلکہ اس کے کمزور کاندھوں اور نازک شانوں پر ہی اپنے لئے راہِ نجات متعین کرنے کا بوجھ رکھ دیا ہے۔ معاذ اللہ! اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ نہ اپنے دین سے واقف ہے اور نہ نبی کی معرفت رکھتا ہے۔

میرے بھائیو! جس نے آپ کے لئے دنوں کے چین کو قربان کیا ہے، راتوں کی نیند برباد کی ہے، جس نے آپ کے لئے فقر وفاقہ کی مشقتیں جھیلیں ہیں، اور سرد وگرم کی تکلیفیں اٹھائی ہیں، جس نے آپ کیلئے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالا اور آرام کو داؤ پر لگایا ہے، جس نے آپ کے لئے پیٹ پر پتھر باندھے اور جسمِ نازک پر زخم کھائے ہیں، اس مہربان نبیؐ نے ـــــ ہمارے ماں باپ ان پر قربان ـــــ اپنی امت کو دنیا میں بے یارومددگار، بے سروسامان اور کفار ومشرکین کے ستم کا تختۂ مشق بنا کر نہیں چھوڑا، اس دانائے سبل اور حکیمِ امت نے بیمار اُمتیوں کے مسائل ومصائب کے حل کا بھرپور سامان اور سہل ترین حل عطا فرمایا، آنے والے زمانے کے احوال کی خبریں بھی دیں، خطرات سے بھی آگاہ کیا اور ان سے بچاؤ اور حفاظت کی راہیں بھی متعین فرمائیں۔

ترمذی اور دارمی نے امیر المؤمنین علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے یہ روایت نقل

کی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: **ستکون فتن** ’’بہت جلد طرح طرح کے فتنے سر اٹھانے والے ہیں‘‘ اس پر حضرت علیؓ نے عرض کیا: ان فتنوں سے نکلنے کی تدبیر بھی ارشاد فرما دی جائے کہ کیا ہوگی؟ اس لئے کہ جب زبانِ نبوت نے اس کی خبر دی ہے تو پہاڑوں کا ٹل جانا ممکن ہے مگر ان فتنوں کا بغیر وقوع ٹل جانا ممکن نہیں، تو فتنوں کی اقسام و کیفیات اور انکی تفاصیل معلوم کرنے کے بجائے ان سے نکلنے اور بچنے کی تدابیر جاننا ہی حضرت علیؓ کی عقل و علم اور فقہ وفہم کا تقاضہ تھا، اس لئے انہوں نے بجائے ان تفصیلوں میں جانے کے یہ اہم اور ضروری سوال فرمایا: **ما المخرج منها یا رسول اللہ!** اس کے جواب میں صرف وحی الٰہی کے ذریعہ کھلنے والی مبارک زبانِ نبوت نے ارشاد فرمایا: کتاب اللہ یعنی ان پیش آنے والے آزمائشوں سے نکلنے کا واحد راستہ ’’اللہ کی کتاب‘‘ ہے، کیونکہ ’’اس میں تم سے پہلے لوگوں کے واقعات ہیں‘‘ جن سے تم اپنے لئے عبرت پکڑ سکو ’’اور بعد والوں کے حالات ہیں‘‘ جن سے تم حصولِ نفع اور دفعِ ضرر کی پیشگی تیاری کر سکو اور ہر زمانہ کے ’’موجودہ حالات کے لئے احکامات ہیں‘‘ جن کو تم لائحہ عمل بنا کر صحیح نہج پر گامزن ہوسکو‘‘ وہی فیصلہ کن طاقت ہے‘‘ دیگر اقوام کی کتابوں کی طرح قصے، کہانیوں، ناولوں اور افسانوں کی لہو کتاب نہیں‘‘ جو کوئی اسے نظر انداز کر دے تو اللہ اسے تباہ کر دیگا‘‘ ’’اور جو کوئی اسے چھوڑ کر کہیں اور ہدایت کا متلاشی ہو تو اللہ اسے گمراہ کر دے گا‘‘ یعنی اس کتاب کی راہنمائی میں چلنے والا ہی آزمائش کی ان گھڑیوں میں کامیابی و فتحمندی کو پا سکتا ہے، اس کے برخلاف اسے چھوڑ کر عقل و خرد اور ہوا ہوس کی پیروی کرنے والا ناکام و نامراد ہو کر رہے گا۔ ’’وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے‘‘ کہ اس کے تھامنے والے ہی اپنی جان بچا سکیں گے، اس کے علاوہ تمام سہارے تارِ عنکبوت کی طرح کمزور ہیں ان سے مدد لینے والے ہلاکت کے گڑھے میں گر جائیں گے،

"وہ حکیم ودانا کا تذکرہ ہے" اسلئے اس میں تغیر وتبدل کی گنجائش نہیں اور قیامت تک بس یہی تذکرہ نجات دہندہ ہے "وہی صراط مستقیم کا ضامن ہے" اس لئے غیر قرآنی نظریات بالیقین صراط مستقیم سے ہٹانے والے اور گمراہی کی طرف لے جانے والے ہیں، "اور وہی ایسی کسوٹی ہے جس کے ہوتے ہوئے اہل ہوا وہوس اپنی گمراہیوں کو پھیلا نہیں سکتے" یعنی ہر دعوت وپکار کو پرکھنے اور اس کی صداقت وسچائی معلوم کرنے کا ذریعہ کتابُ اللہ ہی ہے، بشرطیکہ کتابُ اللہ کو رسول اللہ کی تعلیم کی روشنی میں سمجھا جائے۔ "اور اسکی برکت سے زبانیں گڈ مڈ نہیں ہوسکتیں" یعنی اس کی دوٹوک اور واضح ہدایات کی وجہ سے تحریف وتبدیل کی اس میں گنجائش نہیں۔ "علماء اس کے علوم وفنون، تحقیق وتفسیر سے کبھی تھکیں گے اور نہ کبھی سیر ہوں گے"۔ "اور نہ ہی اس کی چاشنی بکثرت پڑھنے سے پرانی ہوگی" بلکہ اس کے پڑھنے والے ہر مرتبہ نئی لذت پائیں گے اور نئے علوم حاصل کریں گے۔ "اور نہ ہی اس کی ہدایت آمیز وفیصلہ کن عجائبات کا کبھی خاتمہ ہوگا" زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کلام کی ایک ایک حقیقت اس طرح عیاں ہوتی جائیگی کہ گویا اسی زمانہ میں اس کا نزول ہوا ہو، "جس نے اس کی روشنی میں گفتگو کی تو بالکل صحیح کی اور جس نے اسکے تقاضوں پر عمل کیا تو بالیقین مستوجبِ اجر ہوگیا اور جس نے اس کی جانب اوروں کو دعوت دی تو خود بدرجہ اولی صراط مستقیم کو پا گیا"

اس پوری حدیث کی توضیح وتشریح کرنا میرا مقصد نہیں ہے (اور نہ ہی میں اس کا اہل ہوں) ورنہ اس مبارک حدیث کے لفظ لفظ نے بیشمار علوم کے دروازے کھول دیئے ہیں اور اس اجمال نے تفصیل کے دریا بہا دیئے ہیں، مجھے صرف یہ عرض کرنا ہیکہ محسنِ انسانیت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فتنوں اور پریشانیوں، مصائب وآلام، (ارضیہ وسماویہ) میں اُمت کو نجات کی سبیل اور بچاؤ کی تدبیر کیا دی؟

دیکھئے صاف فرمایا جارہا ہے،اپنی عقلوں اور تجربوں سے اس کا فیصلہ نہ کرو بلکہ کتاب اللہ کواپنا قائدورہبر تسلیم کرتے ہوئے اس کے فیصلے کے آگے سرِاطاعت خم کردواوراس کی راہنمائی میں بلاپس وپیش چلتے رہو۔

آیئے !اس حکم کی تعمیل میں ہم دیکھیں گے کہ قرآن مجید نے مصائب وشدائد کا ذمہ دارکن کوقرار دیا؟ارشادِ ربانی ہے:(۱)''وَمَا اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْ عَنْ کَثِیْرٍ'' تم کوجومصیبت پہونچتی ہے وہ تمہارے دونوں ہاتھوں کی کمائی ہےاور(ویسےتو) بارہامعاف کیا جاتا رہا۔

مطلب یہ ہیکہ اہل اسلام کے اعمال واحوال جب بگڑ جاتے اورنافرمانیوں اورحکم عدولیوں کا سلسلہ طول پکڑ جاتا ہےتو حق تعالیٰ اپنےفضل وعنایت سے ایک عرصہ تک درگذر اورصرف نظر کا معاملہ فرماتے رہنے کے بعد بالآخراپنی بطش شدیدیعنی سخت پکڑ کا اعلان فرمادیتے ہیں، پھرانسانیت پرتنگیوں اورتلخیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ارشادہے: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکاً. یعنی جومیرےاحکامات سےروگردانی کرتا ہےاس کے لئے تلخ زندگی ہے، ظاہر ہے کہ بدعملیوں نے جن مصیبتوں کواتارا ہے طاقت وقوت اور چیخ وپکاراور حکومتوں کے سامنے احتجاج انہیں واپس نہیں کرسکتے، بلکہ ان بداعمالیوں کا خاتمہ اورنیک اعمال کا فروغ ہی ان کا خاتمہ کرسکتے ہیں،اورجن فیصلوں کاتعلق راست عرش معلیٰ سے ہواُنھیں پارلیمنٹ اوراسمبلیوں کے دروازے کھٹ کھٹا کے بدلانہیں جاسکتا، جہاں تک خداوندتعالیٰ کی عنایتوں اور بندہ نوازیوں ذات عالی کاتعلق ہےتو یہ طےشدہ امر ہے کہ عاجزی وفروتنی بندگی ونیازمندی کے ذریعہ توانھیں حاصل کیا جاسکتا ہےلیکن ڈھٹائی، ہٹ دھرمی، لادینی ونافرمانی اور جوش وجذبہ کے مظاہرہ سےاللہ پاک کواس پرمجبورنہیں کیا جاسکتا۔

اسباب کے درجہ میں ہمارےعلماءوزعماءدینی وعلمی راہنمائی اورسیاسی قائدین

ان مصائب وحوادث کے ذریعہ کیلئے متفقہ طور پر کچھ اسبابِ عادیہ ضرور اختیار کریں اور عوام ان کا جمعیت متحدہ بن کر بھر پور تعاون کریں، لیکن سبب اصلی وحقیقی سے آنکھ بند کر لینا اوران کے ازالہ کی فکر سے یکسر غافل ہو جانا سخت نادانی اور بڑی محرومی کی بات ہوگی۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكاً۔اور جوکوئی میری یاداوراحکام کی بجا آوری سے اعراض کرے تو یقیناً اس کے لئے تنگ زندگی ہے۔

"مَعِيْشَةً ضَنْكاً "میں سب طرح کی تنگیاں شامل ہیں،مہلک امراض، اشیاء مایحتاج کی گرانی، ذلت وخواری ،حکومت وخلافت سے بے دخلی، پسپائی وپسماندگی ،خوف و بے چینی ،سراسیمگی وپریشانی ، چھوٹوں کی بغاوت اور نافرمانی، بڑوں کاظلم وزیادتی،ساتھیوں کی بے مروتی وناانصافی،غرض جو کچھ زندگی کی راحت کوگھن لگادینے والے اسباب ہیں وہ سب اس میں شامل اوراللہ کی یاداوراس کے دین سے بے خبر زندگی گذارنے والوں کے لئے مقدر ہیں۔

اسکے معنیٰ تو یہی ہوئے کہ جو حالات ہمارے اُوپر آج ظاہر ہورہے ہیں اور تنگی معیشت کے جو نقشے ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں،سب ذکرِ رب سے اعراض کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اوہام وتخیلات کی بنیادوں پر مذہب کی عمارت کھڑی کرنے والوں، دن کے اُجالوں اور رات کے اندھیروں کو خدا سمجھنے والوں، پتھر کی مورتیوں اورمٹی کے تودوں کے آگے جبینِ نیاز جھکادینے والوں، کیڑے مکوڑوں کی پرستش کرنے والوں، ہرالبیلی اورانوکھی چیز سے امید وبیم کا تعلق رکھنے والوں کواتنی ہمت وجرأت مل جائیگی کہ وہ خدائے واحد وقادر پرایمان وایقان رکھنے والی اورمحمدِ عربی ﷺ کی محبوب وچہیتی امت پرخدا کی زمین کوتنگ کرکے ان کی زندگی کودوبھرکردیں؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی سمجھداراایسا سمجھتا ہو!

تیسری جگہ ارشاد ہے: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ اوراس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کو خدا کی باتیں یاد دلائی جاتی رہیں، پھر بھی وہ اعراض ہی کرتا رہے، ایسا کرنے والے مجرم ہیں) ہم اپنے مجرموں سے بلاشبہ بدلہ لیں گے

کہیے! کیا آج خدا کی باتیں مسجد مسجد، گلی گلی، کوچہ کوچہ، دَر دَر یاد نہیں دلائی جارہی ہیں، کیا علماء کرام تصنیف وتالیف، وعظ ونصیحت، درس وتدریس کے ذریعہ اور داعیانِ اسلام دعوت وتبلیغ کے ذریعہ خدا تعالیٰ کے قوانین، حلال وحرام، جائز و ناجائز احکام، نیکیوں پر چلنے کی بشارتیں اور بُرائیوں میں پڑنے کی وعیدیں عام نہیں کررہے ہیں؟ اوراس کی تبلیغ وتذکیر کا فرض انجام نہیں دے رہے ہیں؟ پھراس کے باوجود بھی ہم دین کے ہر شعبہ میں اس کے احکام سے روگردانی اور پہلو تہی نہیں کر رہے ہیں؟

اس یاددہانی اور تذکیر وموعظت کے باوجود ہم میں کا بڑا طبقہ تارکِ نماز نہیں؟ کیا ہم میں کے اکثر مالدار مانع زکوٰۃ نہیں؟ کیا ہماری اکثر عورتیں بے پردہ نہیں؟ کیا ہماری مجلسیں غیبتوں اور چغلیوں کی گندگی میں ملوث نہیں؟ کیا ہماری صبح وشام احکام کو توڑنے میں مصروف نہیں؟ کیا ہماری تجارتیں مکر وخداع کا شکار نہیں؟ کیا ہماری تہذیب غیروں کی تقلید نہیں؟ کیا ہمارے بچہ بچہ کی زبان پر گانوں اور گمراہیوں کے بول نہیں؟ کیا ہماری صورت وسیرت محمد عربی ﷺ کی حددرجہ ناقدری کا بین ثبوت نہیں؟ کونسی برائی ہے جن کے ہم مرتکب نہوں؟ اور کونسی نیکی وخوبی ہے جس کے ہم (بحیثیتِ مجموعی) تارک نہوں؟ اور پھر کیا یہ سب باتیں بے خبری لاعلمی میں ہورہی ہیں یا شعور واحساسِ جرم کے ساتھ؟ پھر اگر اس عالم گیر بے فکری و ناقدری کے نتیجہ میں خداوند تعالیٰ نے اپنی گرفت کا ادنیٰ سا جھونکا عالمی شدائد

ومصائب کی موجودہ صورت میں ہمیں خوابِ غفلت سے جگانے کیلئے بھیج دیا ہوتو اسے بے ایمانوں اور یہود ونصاریٰ کی عصبیت وعداوت کے سرتھوپ کر اپنی بدعملیوں اور کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کی سعی لا حاصل کا کیا فائدہ؟ اس طرزِ فکر سے سوائے اسکے کہ امت، خدائے واحد وذوالجلال کی بارگاہ میں ندامت وخجالت کے ساتھ عفوو درگذر کی خواہاں ہونے کے بجائے مزید غفلت ولاپرواہی کی شکار ہوجائے اور بعض مرتبہ تو ظلم کا تدارک ظلم سے کرنے کی سنگین غلطی میں مبتلاء ہوجائے، اور کیا ہوسکتا ہے؟ میں نے نمونے کے طور پر تین آیتیں جو بلا تتبع وتلاش ذہن میں آگئیں، انھیں پیش کردیا ہے ورنہ قرآن مجید سارے کا سارا اس قسم کے مضامین سے بھرا ہوا ہے۔

آیات کے بعد ایک حدیث بھی ملاحظہ کر لیجئے، ابونعیمؒ نے حضرت ابو درداءؓ سے یہ حدیثِ قدسی روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں، میرے سواء کوئی عبادت کے لائق نہیں، میں بادشاہ ہوں، بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں، بلاشبہ بندے جب میری اطاعت کرتے ہیں تو ان کے حکمرانوں کے دل رحمت وشفقت کے ساتھ ان کی طرف پھیر دیتا ہوں اور جب وہ میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں تو ان کے دلوں کو قہر وغضب اور ظلم وستم کے ساتھ متوجہ کر دیتا ہوں، پھر وہ حاکم انہیں طرح طرح سے بے چین کئے رکھتے ہیں، پس جب ایسے حالات رونما ہوں تو تم امیروں غیروں اور حکام وسلاطین کو بُرا بھلا کہنے اور بددعا کرنے کے بجائے اپنے افعال واعمال پر شرمندگی وندامت کے ساتھ تضرع وزاری میں مصروف ہوجاؤ، تاکہ میں تمہارے لئے کافی ہوجاؤں اور اس کرب وبے چینی سے تمہاری حفاظت کے لئے تمہارے امراء واعداء کے قلوب کو تمہارے حق میں رافت ورحمت کے ساتھ پھیر دوں“۔

حکیم الاسلام مولانا قاری طیب صاحبؒ اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"بہر حال اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بے رزقی اور بدامنی کے اسباب محض سیاسی اور رسمی ہی نہیں ہیں بلکہ کچھ اور بھی ہیں جو خود ان ظاہری اسباب کے سبب ہیں اور وہ باطنی و معنوی ہیں جنھیں آنکھیں تو نہیں دیکھ سکتیں مگر دل پہچان لیتے ہیں، اور یہی معنوی اسباب ان ظاہری معاملات پر غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کی خوبی وخرابی واقعات پر اچھا اور برا اثر ڈالتی ہیں، چنانچہ ان پریشان کن حالات کا سبب السبب ایک ہی ہے اور وہ ہے معصیتِ خداوندی! اس کے برخلاف اچھے حالات اور چین وسرور کا حقیقی سبب طاعتِ الٰہی ہے، پس یہ ثابت ہو گیا کہ ان تمام نامناسب حالات کی ذمہ داری ہمارے ہی افعال وحرکات پر عائد ہوتی ہے نہ کہ اغیار پر... گو سطحی طور پر اس کا ظاہری سبب اغیار ہی نظر آئیں"۔[۱]

مضمون طوالت اختیار کرتا جا رہا ہے اور بہت سی اہم باتیں ذہن میں منتظر تحریر بھی ہیں اسلئے اب میں اپنے مضمون کو سمیٹتے ہوئے اگلی بات پر آنا چاہتا ہوں کہ جب قرآن وحدیث کی روشنی میں مصائب وشدائد کا حقیقی سبب خدا کی نافرمانی اور ہمارے افعال وحرکات ٹھیرا تو لازم ہیکہ قرآن وحدیث اور اسوۂ نبوی ہی کے ذریعہ ہم اپنے لئے اس صورت حال سے نجات کی راہ تلاش کریں، چنانچہ ملاحظہ کیجئے کہ قرآن مجید ہماری صلاح وفلاح کا آسان اور کامیاب طریقہ کس قدر واضح انداز میں پیش کر رہا ہے۔

**(۱)" تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعاً اَيُّهَا الْمُؤمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ"**
مسلمانو! تم سب کے سب اکھٹے ہو کر اللہ کیطرف لوٹ جاؤ اور اپنے اعمالِ بد سے توبہ واستغفار کرو، امید ہے کہ تم فلاح پا جاؤ گے۔

**(۲)"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّهُمْ**

[۱] اسلام اور فرقہ واریت: ص: ۵۵،

دِیْنَهُمُ الَّذِیْ ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْناً "اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان لاکر اعمالِ صالحہ کرنیوالوں سے وعدہ فرماتا ہے کہ ضرور تم کو زمین پر خلافت عطا فرمائے گا جیسے تم سے پچھلوں کو عطا فرمایا تھا۔اور جس دین کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے پسند فرمایا ہے (یعنی اسلام) اُس کو ان کے (نفعِ آخرت کے) لئے قوت دے گا اور اُن کے اس خوف کے بعد اُس کو امن سے بدل دے گا۔

دیکھئے اس آیتِ مبارکہ میں ایمان اور اعمالِ صالحہ کی شرط پر وعدہ فرمایا جارہا ہے کہ حکومت وغلبہ بھی دیا جائیگا،اور خوف وہراس کے ماحول کو بدل کر امن وآشتی کا دور دورہ کر دے گا۔

(۳)" تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ذَالِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" تم لوگ اللہ پر اور اسکے رسول پر ایمان لے آؤ اور اللہ کے راستے میں جان ومال سے مجاہدہ کرو یہ تمہارے لئے اگر تم سمجھو تو بڑی اچھی بات ہے۔یہ فرمانے کے بعد آخرت میں ملنے والی نعمتوں مغفرت، دخولِ جنت،مساکنِ طیبہ کے حصول کا وعدہ فرما کر آگے پھر ارشاد ہوتا ہے:"وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ "اور دوسری چیز جس کو تم چاہتے بھی ہو یعنی اللہ کی خصوصی نصرت اور بہت جلد فتح وکامیابی تو یہ بھی راہِ خدا میں جان ومال کی قربانی کے ذریعہ ہی نصیب ہوسکتی ہے۔

(۴)"اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُهُمْ شَیْئاً "اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان دشمنوں کی تدبیر تمہیں کچھ نقصان نہ پہونچا ئیگی۔

صبر کی حقیقت ہے نفس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے روکنا،اور اس کی کئی قسمیں ہیں،نفس کو گناہ کے کام میں پڑنے سے روکنا،نفس کو نیکی کے کام سے بھاگنے سے روکنا،نفس کو خلافِ مزاج پر شکوہ وشکایت سے روکنا وغیرہ، اور تقویٰ کی تعریف

اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب ہے، آیت چونکہ جہاد کے سیاق وسباق سے تعلق رکھتی ہے اس لئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر تم حالتِ جنگ میں ثابت قدم اور حدود کی خلاف ورزی سے بچتے رہے تو پھر فریقِ مخالف کی سازشیں تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی۔ الغرض مفہوم عام لیا جائے یا خاص! بہرصورت دنیوی کامیابی کا مدار بھی اسلام اور اسلامی احکامات کی پابندی پر ہونا اس واضح اور ظاہر ہے۔

(۵) "اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اِسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَنْ لَّاتَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیَاءُ کُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ" بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس بات پر ثابت قدم رہے تو ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے) نہ گھبراؤ اور نہ خوف کرو (بلکہ) خوشخبری سنو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم تمہارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں بھی آخرت میں بھی۔

اس آیتِ شریفہ میں بھی دین پر استقامت کے بدلے میں اُخروی خوشخبریوں کے ساتھ ساتھ دنیوی مدد کا بھی وعدہ فرمایا گیا ہے کہ فرشتوں کے ذریعہ خوف و ہراس کو ختم کر کے ان کی معیت اور ولایت کا اطمینان اور خوشی عطا فرمائی جائیگی۔

یہ پانچ آیتیں بطور نمونہ کے پیش کر دی ہیں تا کہ اندازہ ہو کہ دنیوی صلاح و فلاح اور زندگی کے امن وسکون کی تحصیل کا ذریعہ بھی احکام خداوندی کی بجا آوری، اطاعت اوامر و اجتناب نواہی، گناہوں سے استغفار، اور رجوع الی اللہ ہی ہے، نہ کہ تشدد و تخرب اور جنگ وجدل! اسلئے کہ معرکہ آرائی اور جہاد وقتال کی کامیابی کیلئے بھی کم از کم دو چیزیں تو بہرحال لازمی ہیں، ایک مسلمانوں کا باہمی اتحاد و اتفاق اور صفاتِ حسنہ سے متصف ہونا، دوسرے مستوجب غضب اعمال یعنی فواحش و منکرات سے محفوظ ہونا اسلئے کہ تعیش و تنعم بد کرداری و بد اطواری، عبادات

سے بے زاری اور عادات کی بے راہ روی کے ساتھ خدا تعالیٰ کی نصرت نہ کبھی آئی ہے اور نہ کبھی آسکتی ہے، قدیم تاریخِ اسلام کے مطالعے کے لئے تو آپ کو ذہنی بوجھ اٹھانا پڑیگا، لیکن عالمِ اسلام کے قریبی حالات ذہن میں تازہ ہی ہوں گے کہ مسلمانوں کی بد عملی و بے دینی نے اہلِ اسلام کو مٹھی بھر یہودیوں کے مقابلہ میں ماضی قریب میں کس قدر شرمناک شکست وہزیمت کا منہ دکھایا، اور تقویٰ وپرہیزگاری اور اصلاحِ اعمال واخلاق تضرع وزاری، انابت ورجوع الی اللہ نے مٹھی بھر مجاہدینِ افغانی کو روس کی عبقری طاقت کے مقابلہ میں کس طرح حیرت انگیز وتاریخ ساز فتح وظفر سے ہمکنار کیا، پس معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ سے دین کا معاملہ درست کر لینے اور اس کے پیار ومحبت، نصرت ومدد کو متوجہ کرنے والی صفات سے متصف ہوئے بغیر بڑی بڑی باتیں کرنا طفل تسلی کے سامان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لہذا آج کے ایسے حالات میں بھی جبکہ مسلمانانِ ہند چند در چند اور پئے در پئے صبر آزما اور حوصلہ شکن حوادث سے دوچار ہیں، خداوند تعالیٰ کو راضی کرنے اور منانے کیلئے ان کی طرف متوجہ ہونا اور سب سے پہلے اپنے آپ کو پیار ومحبت کے قابل بنانا بہت ضروری ہے، پھر اللہ تعالیٰ خود ہی کافی ہوجائیں گے، یا ضرورت پڑنے پر ہمارا ہر تدبیری اقدام انشاء اللہ مثمر اور بارآور ثابت ہوگا، یہی قرآن کریم کی راہنمائی اور یہی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت وعادت ہے۔

دیکھئے اول الانبیاء ابوالبشر حضرت آدمؑ کو جب اللہ تعالیٰ نے ایک غلطی پر جنت سے نکل کر دنیا میں چلے جانے کا امر فرمایا تو اگرچہ اس غلطی کا قریبی سبب شیطان اور اس کی سازش ہی تھا لیکن انھوں نے اس بد بخت دشمن پر واویلا مچانے کے بجائے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کیا اور بڑی عاجزی اور شرمندگی سے عرض کرتے رہے:

"رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ"

اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے (اور اب صورتِ حال یہ

ہے کہ ) اگر آپ نے ہماری بخشش نہیں فرمائی اور رحم نہیں کیا تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل شدائد ومصائب کے وقت کیا تھا؟ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مصیبتیں تو کجا تیز ہوائیں بھی چلنے لگتیں تو آپؐ مسجد کی طرف دوڑتے اور وہاں جا کر رجوع الی اللہ ہو جاتے تھے، صحابہؓ کے استفسار پر فرماتے کہ عاد وثمود کے لئے بھی ایسی ہی ہوائیں چلائی گئیں تھیں اور بادل بھیجے گئے تھے وہ سمجھے کہ یہ ہوائیں بارش کی خوشخبری لائی ہیں، لیکن اس کو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہلاکت کا سامان بنا دیا تھا، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں پھر ایسا نہ ہو جائے، ایسے موقعوں پر سب سے بڑی فکر تو آپ کو یہ ہو جاتی تھی کہ یہ حالات کہیں اللہ تعالیٰ کی خفگی وغضب کے آثار تو نہیں اور اسی اندیشہ سے آپ بے چین ہو جاتے، طائف کے مشہور واقعہ کا جائزہ لیجئے اور دیکھئے کہ جب دو جہاں کے سردار اور رب العالمین کے محبوب کو بدقسمتوں نے سنگباری کے ذریعہ مجروح وزخمی کر دیا اور آپؐ لہو ولہان ہو گئے تو ذرا اطمینان اور امان ملتے ہی آپ نے پرودگار عالم کے سامنے ہاتھ اٹھا کر کیسی عاجزی اور درمندی کے ساتھ اپنی صورتِ حال کا اپنی زبانِ مبارک سے اظہار فرمایا اور اسی کے ساتھ بڑی ہی بندگی اور نیازمندی سے یہ بھی بارگاہِ رب میں عرض کیا: "اگر یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ ناموافق ونامساعد حالات آپ کی خفگی اور ناراضگی کے نتیجہ کے طور پر نہیں ہیں تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے" یعنی یہ اور ان جیسے حالات سے جو اذیتِ قلبی اور صدمہ روحانی پیش آئے ہیں وہ تو میرے لئے اتنے باعثِ بے چینی نہیں جتنا کہ آپ کے ناراض اور خفا ہو جانے کا اندیشہ! کیونکہ اس کا تصور بھی مرے لئے صدموں کا پہاڑ ثابت ہوتا ہے۔

سبحان اللہ! یہ ہے مزاجِ نبوت اور صحیح اندازِ بندگی وعبودیت!! اس کے

برخلاف آج ہمارا حال یہ ہے کہ آئے دن نئے نئے حالات کھڑے ہورہے ہیں اور ہر صبح نئے مصائب کے ساتھ طلوع ہورہی ہے، اور ہر شام غموں اور مصیبتوں کے اندھیرے لارہی ہے، مگر ہم ہیں کہ نہ تصحیحِ عقائد کی فکر ہے، نہ تحسینِ اعمال کی جستجو نہ گناہوں اور نافرمانیوں کا اقرار ہے، نہ اہتمامِ توبہ واستغفار، نہ خود سدھرنے کی کوشش ہے نہ دوسروں کو دعوت دینے کا جذبہ، اب بھی بے نمازی، بے نمازی ہی ہیں، بے پردہ عورتیں بے پردہ ہی ہیں، حرام خوری کرنے والے حرام خور ہی ہیں، لہو ولعب میں مشغول رہنے والے اسی میں مصروف ہیں، اب بھی مسجدیں اپنی ویرانی پر ماتم کناں ہی ہیں، اب بھی تھیٹروں اور سینما ہالوں میں مسلمانوں کا ہجوم موجود ہے، اب بھی ٹی وی اور ویڈیو کی کیسٹوں کی مسلم گھرانوں میں گرما گرمی ہے، وہ کونسی نافرمانی ہے جسے ہم نے یہ کہہ کر ترک کردیا ہو کہ حالات خراب ہوگئے خدا کا غضب پوری قوم پر ٹوٹنے والا ہے، چلو توبہ کرو اور حالات درست کرو، اگر ایک گناہ سے بھی ہم اپنے کو اور اپنے معاشرہ کو پاک نہیں کرسکتے تو بھلا بتلایئے کہ ہماری نجات کی سبیل کیا ہوسکتی ہے؟

یہ چند باتیں ہیں جن کی طرف گذشتہ دنوں سے ہر مجلس اور ہر وعظ میں اپنے تمام مسلمان بھائیوں کو توجہ دلانے کی توفیق ہورہی ہے، اس امید پر کہ کبھی نہ کبھی جب نقارخانے کا شور کم ہوگا تو طوطی کی آواز سن لی جائے گی اور مراد براری کا سبب ہوجائے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے شرفِ قبول اور توفیقِ عمل ہم سب کو عطا فرمائے۔ آمین

# معمولاتِ رمضان

☆ قرآن مجید کی بکثرت تلاوت ☆ فرائض کے ساتھ نوافل کا بھی اہتمام ☆ حاجت مند مسلمانوں سے ہمدردی وغم خواری ☆ صبر وتحمل کا مظاہرہ کرنا، چڑ چڑے پن سے بچنا ☆ لڑائی جھگڑوں اور بحث ومباحثہ سے اجتناب ☆ جھوٹ اور غیبت سے زبان کی حفاظت ☆ نوکروں اور ماتحتوں کے کاموں میں کمی کر دینا ☆ شب قدر کی تلاش کے واسطے دس روزہ اعتکاف کی کوشش ☆ بصورتِ دیگر عشرۂ اخیرہ کی راتوں میں حسب طاقت وسہولت عبادت اور دعا کا اہتمام ☆ دعاؤں کا اہتمام بالخصوص افطار کے وقت ☆ روزہ اور تراویح کی پابندی ☆ عشرۂ اخیرہ میں اور دنوں سے زیادہ اعمال کا اہتمام کرنا۔[1]

## مخصوص دعائیں:

☆ افطار سے قبل: اللّٰھمَّ لَکَ صُمۡتُ وَعَلیَ رِزۡقِکَ اَفۡطَرۡتُ

☆ افطار کے بعد: ذَھَبَ الظَّمَأُ وَابۡتَلَّتِ الۡعُرُوۡقُ وَثَبَتَ الۡاَجۡرُ . اِنۡشَاءَ اللّٰهُ

☆ سحری کے وقت: یَا وَاسِعَ الۡفَضۡلِ اِغۡفِرۡلِیۡ

☆ شب قدر میں: اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عفُوٌّ تُحِبُّ الۡعَفۡوَ فَاعۡفُ عَنِّیۡ .

☆ بہتر ہے کہ پہلے عشرہ میں: اَللّٰھُمَّ ارۡحَمۡنِیۡ فَاِنَّکَ خَیۡرُ الرَّاحِمِیۡنَ

☆ دوسرے عشرہ میں: اَللّٰھُمَّ اِغۡفِرۡلِیۡ فَاِنَّکَ خَیۡرُ الۡغَافِرِیۡنَ

[1] سب باتیں معتبر احادیث سے اخذ کی گئی ہیں،

☆ تیسرے عشرہ میں: اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ، یَامُجِیْرُ کثرت سے پڑھا کریں

# صبح وشام کی دعائیں

۱۔ بِسْمِ اللّٰہِ الَّذِیْ لاَ یَضُرُّ مَعَ اسْمِہٖ شَیْئٌ فِی الْاَرْضِ وَلاَ فِی السَّمَاءِ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۳۔مرتبہ)

۲۔ سورۂ اخلاص، سورۂ فلق، سورۂ ناس (۳۔۳ مرتبہ)

۳۔ رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبّاً وَبِالاِسْلاَمِ دِیْناً وَبِمُحَمَّدٍ نَّبِیّاً (۱۔مرتبہ)

۴۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی أَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِی الدُّنْیَا وَالاٰخِرَۃِ، اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ وَاَھْلِیْ وَمَالِیْ، اَللّٰھُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ وَاٰمِنْ رَوْعَاتِیْ (۱۔مرتبہ)

۵۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنِیْ مِنْ بَیْنَ یَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ وَعَنْ یَمِیْنِیْ وَعَنْ شِمَالِیْ وَمِنْ فَوْقِیْ وَاَعُوْذُ بِکَ بِعَظْمَتِکَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ (۱۔مرتبہ)

۶۔ اَللّٰھُمَّ بِکَ اَصْبَحْنَا وَبِکَ اَمْسَیْنَا وَبِکَ نَحْییٰ وَبِکَ نَمُوْتُ وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ (۱۔مرتبہ)

۷۔ اَللّٰھُمَّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمِ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ رَبَّ کُلِّ شَیْئٍ وَمَلِیْکَہٗ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَشَرِّ الشَّیْطَانِ وَشِرْکِہٖ (۱۔مرتبہ)[۱]

---

[۱] سب دعائیں صحاح ستہ سے منقول ہیں اور موت کے علاوہ سب حادثات سے حفاظت کی بشارت ہے

# نمازوں کے بعد کے اذکار

۱۔اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ (۳۔مرتبہ)

۲۔ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلاَمُ وَمِنْکَ السَّلاَمُ تَبَارَکْتَ یَا ذَا الْجَلاَلِ وَالْاِکْرَامِ (۱۔مرتبہ)

۳۔ لاَاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لاَ شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ، لاَحَوْلَ وَلاَ قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ، اَاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ لاَنَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ لَہُ النِّعْمَۃُ وَلَہُ الْفَضْلُ وَلَہُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لاَاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنُ وَلَوْکَرِہَ الْکَافِرُوْنَ (۱۔مرتبہ)

۵۔اَللّٰھُمَّ لاَمَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلاَ مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلاَ یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ (۱۔مرتبہ)

۶۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْجُبْنِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ الْبُخْلِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الدُّنْیَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ (۱۔مرتبہ)

۷۔سُبْحَانَ اللّٰہِ (۳۳رمرتبہ) اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (۳۳رمرتبہ) اَللّٰہُ اَکْبَرُ (۳۴رمرتبہ)

۸۔آیۃ الکرسی (۱۔مرتبہ)

## ہوسکے تو ان دعاؤں کا بھی اہتمام کیجئے:

(۱) اے اللہ! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دیئے۔ (۲) اے اللہ! مجھے اپنا فضل خاص عطا فرمائے (۳) اے اللہ! مجھے اپنی جنت عطا فرمایئے اور دوزخ سے محفوظ رکھئے (۴) اے اللہ! مجھے شیاطین و جنات اور تمام بُرے اثرات سے محفوظ رکھئے (۵) اے اللہ! مجھ سے ہر قسم کی اذیت اور تکلیف کو دور فرما دیجئے

[۱] سب اذکار صحاح ستہ سے منقول ہیں، نیز فرض نمازوں کے بعد دعا قبول ہوتی ہے، دعا کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔

(۶) اے اللہ! مجھ کو اپنے دین پر ثابت رکھئے (۷) اے اللہ! میرے تمام کاموں کو سہل اور آسان بنا دیجئے (۸) اے اللہ! مجھے ہر قسم کی جہالت و بے دینی سے محفوظ رکھئے (۱۰) اے اللہ! مجھے اچھے اخلاق نصیب فرمایئے اور بد خلقی سے میری حفاظت فرمایئے (۱۱) اے اللہ! مجھے حلال روزی نصیب فرمایئے اور حرام سے بچا لیجئے۔ (۱۲) اے اللہ! مجھے اپنے علاوہ تمام مخلوق سے بے نیاز کر دیجئے (۱۳) اے اللہ! مجھے حاسدوں اور دشمنوں کی دشمنی سے محفوظ و مامون فرما دیجئے (۱۴) اے اللہ! مجھے اپنے غصے اور عذاب سے ہر طرح محفوظ رکھئے (۱۵) اے اللہ! مجھے اپنے ذکر و شکر اور حسنِ عبادت کی توفیق عطا فرمایئے (۱۶) اے اللہ! مجھے توبہ کرنے والوں میں سے بنا دیجئے (۱۷) اے اللہ! مجھے آپ کی ہر چھوٹی بڑی نافرمانی سے بچنے کی توفیق عطا فرمایئے (۱۸) اے اللہ! میرے عیوب کو چھپا دیجئے، اور میرے اندیشوں سے مجھے بچا لیجئے (۱۹) اے اللہ! مجھے امن وامان اور عافیت وسلامتی نصیب فرمایئے (۲۰) اے اللہ! مجھے بخل سے قرضوں کے بوجھ سے، حزن وغم سے اور مخلوق کے ظلم سے محفوظ فرما دیجئے (۲۱) اے اللہ! مجھے جنت الفردوس عطا فرمایئے (۲۲) اے اللہ! مجھے اتباعِ سنت کا ذوق وشوق نصیب فرمایئے (۲۳) اے اللہ! مجھے تقویٰ وطہارت کی دولت عطا فرمایئے (۲۴) اے اللہ! میرے دل میں اپنی اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال محبت عطا فرما دیجئے (۲۵) اے اللہ! روزِ محشر مجھے اپنے عرش کا سایہ نصیب فرمایئے (۲۶) اے اللہ! مجھے اور میرے ماں باپ کو حج وزیارت کی دولت نصیب فرمایئے (۲۷) اے اللہ! بقدرِ ضرورت بارش نازل فرمائے (۲۸) اے اللہ! مجھے قبر کے عذاب، دجال کے فتنے سے محفوظ فرمایئے (۲۹) اے اللہ! قیامت کے دن میرا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں عطا فرمایئے (۳۰) اے اللہ! مجھے اپنے دین کی سچی قدر کرنے والا بنا دیجئے (۳۱) اے اللہ! مجھے

رمضان المبارک کی تمام برکتوں میں کامل حصہ دار بنا دیجئے (۳۲) اے اللہ! مجھے قیامت کے دن اپنے نبیؐ کے ہاتھوں جام کوثر اور جنت میں ان کی رفاقت عطا فرمایئے (۳۳) اے اللہ! قبر کی آزمائش میرے لئے آسان فرما دیجئے اور اس کے عذاب سے بچا لیجئے (۳۴) اے اللہ! مجھے وہ تمام بھلائیاں عطا فرمایئے جن کا حضورؐ نے آپ سے سوال فرمایا ہے اور ان تمام برائیوں سے بچایئے جن سے آپؐ نے پناہ مانگی ہے (۳۵) اے اللہ! یہ تمام دعائیں میری طرف سے تمام مسلمانوں کے حق میں بھی قبول فرمایئے۔ آمین برحمتک یا ارحم الراحمین۔ (تمام دعائیں اذکارِ مسنونہ و ماثورہ کا ترجمہ ہیں)

# رمضان میں ان دو اعمال کا خاص اہتمام کیجئے!

رمضان المبارک نہایت ہی مبارک ومقدس موسم ہے، حق تعالیٰ شانہ نہ صرف یہ کہ اپنے بندوں پر رحم وکرم اور مغفرت کے انعامات کے ساتھ خصوصی توجہ فرماتے ہیں بلکہ بندوں کے اعمال کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ فرما دیتے ہیں۔ اگر ہم نے اس مبارک مہینے کے احترام میں کمی کی تو حق تعالیٰ کی کمالِ رحمت کی بڑی ناقدری ہوگی، اس لئے اعمالِ صالحہ میں کثرت اور معاصی سے سختی سے اجتناب کا اہتمام ضروری ہے۔

دو اعمال کا بطور خاص خیال رکھئے۔ ایک تو "تلاوتِ قرآن" کا کہ اس مہینے کا تعارف ہی اللہ تعالیٰ نے " الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ " کہہ کر فرمایا ہے، پھر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی رمضان میں اس کا اہتمام فرماتے تھے، صحابہ کرامؓ اور ہر زمانہ کے اہل اللہ کے معمولات میں بھی یہی بات ملتی ہے کہ ماہِ رمضان میں سب سے زیادہ اہتمام تلاوتِ قرآن کا کیا کرتے تھے، تراویح، تہجد اور نوافل میں بھی اور خارجِ نماز بھی۔

دوسرے "خیر خیرات" کا کہ یہ غمگساری کا مہینہ ہے، ارشادِ نبویؐ ہے: "شھر المواساۃ" عام طور سے جن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے وہ خیر خیرات سے بھی محروم رہتے ہیں، یاد رکھئے زکوٰۃ ایک علاحدہ حکم ہے اور انفاق ایک مستقل حکم ہے، اس کیلئے صاحبِ نصاب ہونے، سال گذرنے اور مخصوص مقدار کے واجب ہونے کی کوئی شرط نہیں ہے، بس حسبِ حیثیت، خلوص وللّٰہیت کے ساتھ کچھ نہ کچھ راہِ خدا

میں خرچ کرتے ہی رہنا چاہیے، اللہ تعالیٰ مقدار کو نہیں دیکھتا، معیارِ نیت کو دیکھتا ہے، اس کے لئے تھوڑا، تھوڑا نہیں ہے، بہت، بہت نہیں ہے، وہ جذبہ عبودیت کی قدر فرماتا ہے، اس لئے ہر مسلمان کو چاہیے کہ ہمیشہ اپنی آمدنی میں سے کچھ حصہ خواہ کتنا ہی قلیل کیوں نہ ہو ضرور خیرات کے مد میں صرف کرے بالخصوص رمضان المبارک میں، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی رمضان میں خیر خیرات میں اضافہ فرما دیتے تھے، حالانکہ وہ اور دنوں میں بھی اجود الناس یعنی سب سے زیادہ سخی تھے۔

بہر حال دیگر اعمالِ صالحہ کیساتھ ان دو اعمال کی طرف خصوصی توجہ کی گذارش ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو توفیق عمل نصیب فرمائے۔ آمین

# اسلامی معاشرہ، امتیازات اور ہماری کوتاہیاں

سماج، معاشرہ، مجتمع، السلوک الاجتماعی یہ سب عنوانات چند افراد کی اجتماعی زندگی، رہن سہن، چال چلن، باہمی تعلقات اوران کے نباہ سے تعبیر ہیں، ہر قوم کی ایک امتیازی تہذیب اوراجتماعی زندگی کے مخصوص آداب ہوتے ہیں۔ضرورتیں اگر چہ سب کی مشترک ہوتی ہیں مگران کی تکمیل کے طریقے علاحدہ علاحدہ ہوتے ہیں، چنانچہ قومیں تہذیب کی انہی امتیازات وخصوصیات سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔

اسلام ایک عالمگیرابدی اور لافانی دین ہے،اس نے اپنے ماننے والوں کے لئے زندگی کا جو دستورالعمل دیا ہےاور جن اخلاق وکردار کی تعلیم کی ہے وہ بے نظیر وبے مثال ہے، یہ دعویٰ اپنے مذہب سے محض حسن ظن اور فطری عقیدت وتعلق کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ وہ ناقابل تردید حقیقت ہے جس کا اعتراف بلا لحاظ مذہب وملت ہر ذی علم اور صاحبِ فہم نے کھلے دل سے کیا ہے، حتیٰ کہ اسلام اوراہلِ اسلام کی جانب سے اپنے دلوں میں نفرت وبغض کا موقف رکھنے والوں کے زبان وقلم بھی کسی نہ کسی طرح کُھل کر یا دبے لفظوں میں اسلام کے حسن معاشرت اور تہذیبی تفوق کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

**شهد الانام بفضله حتى العدا**
**والفضل ما شهدت به الاعداء**

تفصیل کا یہ موقع نہیں بطور نمونہ کے ایسے چند تاثرات حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں۔انہوں نے اپنی کتاب ”تہذیب وتمدن پر اسلام

کے اثرات واحسانات" میں مستشرقین، مؤرخین اور فلاسفہ کے اعترافات کو ان کی کتب سے جمع فرمایا ہے۔

مشہور مستشرق پرفیسر گب کا کہنا ہے:

" اسلام کو ابھی انسانیت کی ایک اور خدمت انجام دینی ہے، لوگوں کے مراتب موقع اور عمل کے لحاظ سے مختلف نسلوں کے درمیان مساوات قائم کرنے میں کسی سوسائٹی نے اسلام کی جیسی کامیابی نہیں حاصل کی ہے، افریقہ ہندوستان، اور انڈونیشیا کے عظیم اور جاپان کے محدود مسلم معاشرہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ کس طرح اسلام مختلف نسلوں اور روایات، نہ مٹنے والے اختلافات کو تحلیل کردیتا ہے، اگر مشرق ومغرب کی عظیم سوسائٹیوں میں مخالفت کے بجائے باہمی تعاون پیدا ہونا ہے تو اس کے لئے اسلام کی خدمات حاصل کرنا لازمی ہوگا"۔

مشہور برطانوی فلسفی ٹائن بی کا ماننا ہے:

" مسلمانوں کے درمیان نسلی امتیاز کا خاتمہ اسلام کے عظیم کارناموں میں سے ایک ہے، اور موجودہ دور میں تو اسلام کی یہ سعادت وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے"۔

افریقہ کے معروف عالم لیڈر" مالکم ایکس" کی سوانح حیات سے یہ کھلا اعتراف نقل فرمایا ہے:

" ان اسلامی ملکوں میں پچھلے گیارہ دنوں سے میں نے ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھایا اور ایک ہی گلاس میں پانی پیا ہے، اور انہیں کے ساتھ ایک ہی قالین پر سویا ہوں، میں نے ان میں وہی خلوص پایا ہے جس کا احساس مجھ کو نائجیریا، سوڈان اور گھانا کے کالے افریقی مسلمانوں میں ہوا تھا، ہم سب بھائی بھائی تھے۔ کیونکہ اللہ پر ایمان نے ہمارے ذہن رویے اور برتاؤ سے "گوری رنگت" کو حذف کردیا تھا،

میری سمجھ میں آ گیا کہ اگر امریکہ کے لوگ توحید پر ایمان لے آویں تو شاید وہ بھی انسانی وحدت کو قبول کر لیں"۔

ان انگریزی لیڈروں کے علاوہ خود ہندوستان کی ایک معروف اور سماجی خاتون "سروجنی نائیڈو" کے جذبات و احساسات خود اسی کے قلم سے ملاحظہ ہوں:

"یہ پہلا مذہب تھا جس نے جمہوریت کی تبلیغ کی اور اس پر عمل کیا مسجد میں اذان کے ساتھ عبادت کرنے والے جمع ہو جاتے ہیں، اور دن میں پانچ بار اللہ اکبر کے اعلان پر ایک ساتھ جھکتے ہیں۔ اسلامی جمہوریت پر عمل کرتے ہیں، میں نے بار بار محسوس کیا ہے کہ اسلام اتحاد عمل سے ایک انسان کو دوسرے انسان کا بھائی بنا دیتا ہے"۔

غرض اسلام نے اپنے ماننے والوں کو انسانی شرافت و کرامت، ہمدردی و غمخواری، اخوت و بھائی چارگی اور باہمی تعلقات کی استواری سے متعلق جن اونچی قدروں سے روشناس اور ان کا پابند کیا ہے، اس کی عملی شکل دیکھنے کے بعد کوئی وجہ نہیں ہے کہ آدمی اسلامی معاشرہ کے اس کمال و امتیاز کا اعتراف نہ کرے۔

اس سب کے باوجود یہ بھی ایک واقعی امر ہے کہ اب مسلم معاشرہ کے یہ امتیازات تیزی کے ساتھ رو بہ زوال ہیں۔ مسلمانوں نے دیکھا دیکھی اور نقالی کی روش جب سے اختیار کی ہے ان میں سے خود اعتمادی ختم ہوگئی ہے، ان کا ذہن مرعوب اور قلب کمزور ہو گیا، دوسروں کے قلب و ذہن کے سہارے چلنے کی عادت نے اپنی فکری قوتِ رفتار سے محروم کر دیا ہے، آج مسلمان اہل دنیا کو للچائی نظروں سے تکتے اور اپنے تئیں شرمندگی و خفت محسوس کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، حالانکہ جو تعلیم و تہذیب ان کے نبی ﷺ نے انہیں عطا فرمائی تھی اور خلق عظیم و سلوک کریم کی عالی بنیادوں پر جو سماج تشکیل دیا تھا وہ فخر انسانیت ہی نہیں رشکِ ملائک تھا، اس معاشرہ کے افراد اتنے عالی تھے کہ فرشتوں کو ان کی مدد کے لئے بھیجا جاتا تھا اور عرشِ

رحمٰن سے ان کے لئے پروانہ رضا مندی وخوشنودی عطا کیا جاتا تھا، دنیا کی قومیں نہ صرف ان کے مثالی وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی تھیں، بلکہ انہیں انسانیت سے بھی آگے کی کوئی چیز سمجھنے لگی تھیں، وہ جہاں جاتے سب پر چھا جاتے تھے، مذہبی شدید اختلاف کے باوجود وہ لوگ اپنی خصومات میں انہیں بلا اختلاف حکم بنا لیتے تھے، اپنے خزائن کے امین اپنی بہو بیٹیوں کے محافظ ونگہبان اور انسانیت کے نجات دہندہ تصور کرتے تھے۔

مگر افسوس! کہ آج مسلمانوں نے ترقی وروشن خیالی کے نام نہاد جال میں پھنس کر ان عظیم تعلیمات کو فراموش کر دیا اور نہایت بلند اخلاقی وعالی قدری کے مقابلہ میں دنی اور بیہودہ رسموں کو اختیار کر لیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنا امتیاز، تشخص اور شناخت تک کھو بیٹھے ہیں، اس حماقت وناقدری کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنی قدر ومنزلت اور معاشرہ کی شہرۂ آفاق ومنفرد خصوصیات سے بجا طور پر ہاتھ تو دھونا ہی پڑا، دنیا بھی چاہت کے مطابق نہ مل سکی، گویا مسلمان اپنی تہذیب کو چھوڑ کر۔

**نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم**

کی جیتی جاگتی تصویر ہوگئے، اور اگر بہ فرضِ محال دنیا کی خوشیاں حسبِ منشاء مل بھی رہی ہیں تو وہ سعدیؒ کے اس شعر کے مصداق ہیں۔

**بئس المطاعم حین الذل تکسبها**

**القِدر منصوب والقَدر مخفوض**

جو کسی سمجھ دار اور عزت کی طلب گار قوم کے لئے ہر گز قابلِ قبول نہیں ہوسکتیں۔

بہرحال اس طرح معاشرۂ اسلامی کے بگاڑ کا سلسلہ بہت طویل ہو چکا ہے اور اخلاقی گراوٹ وانحطاط میں روز بروز اضافہ ہی ہے، ایسے حالات میں اگر فوری طور

پر خبر گیری نہ کی جائے اور معاشرتی فساد کے خاتمہ کے لئے انتھک اور مسلسل کوششیں نہ کی جاویں تو پھر ہمارا کیا حشر ہوگا؟ اس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، نبی کریم علیہ السلام تو کھلے الفاظ میں خبردار فرما رہے ہیں:

**والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر او لیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عذابا من عندہ**[۱]

اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم لوگ اچھی باتوں کا حکم کرتے رہو اور بری باتوں سے روکتے رہو، ورنہ پھر اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب مسلط فرما دیں گے۔

ایک اور موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

**مثل المدھن فی حدود اللّٰہ والواقع فیھا کمثل قوم استھموا سفینۃ فصار بعضھم فی اسفلھا و صار بعضھم فی اعلاھا الخ**[۲]

حدود اللہ کے معاملہ میں مداہنت واستخفاف برتنے والے اور ان کی خلاف ورزی کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جماعت کشتی پر سوار ہو جائے، پھر ان میں سے بعض لوگ نچلے طبقہ میں ہوں اور کچھ لوگ اوپر کی منزل میں، نیچے والے لوگوں کو پانی حاصل کرنے کے لئے اوپر والوں کے پاس سے بار بار گذرنا پڑ رہا ہو، تو ان لوگوں کو یہ بات ناگوار ہو رہی ہو، یہ دیکھ کر نیچے والوں نے سوچا کہ لاؤ کشتی ہی میں سوراخ کر کے یہیں سے پانی لے لیں گے تا کہ اوپر والوں کو زحمت نہ ہو، چنانچہ کلہاڑی لے کر کشتی کا تختہ توڑنے لگے ایسے وقت اگر اوپر والے لوگ سمجھداری سے کام لیتے ہوئے انہیں اس بے تکی حرکت سے باز رکھیں گے تب تو خود بھی بچیں گے اور کشتی کو بھی بچا لیں گے، اور اگر یہ سوچیں کہ وہ جانیں ان کا کام! ہم تو محفوظ ہیں، تو

---

۱ صحیح سنن ترمذی:۲/۲۳۳، ۲ بخاری:۳/۱۵۰

یہ لوگ اپنی اس بے جا حرکت کے نتیجہ میں انہیں بھی ڈوبائیں گے خود بھی ڈوبیں گے۔

ایک اور موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

| | |
|---|---|
| مامن رجل یکون فی قوم یعمل فیھم بالمعاصی یقدرون علی ان یغیروا علیہ ولا یغیرون الا اصابھم اللہ منہ بعقاب قبل ان یموتوا [1] | جو شخص کسی ایسی قوم میں رہتا ہے جو معاصی و مناہی کے ارتکاب میں مبتلا ہے، اور وہ شخص انہیں اس حرکت سے روکنے پر قادر بھی ہو مگر باوجود اس قدرت کے انھیں اس سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ ضرور اسی دنیا میں اس قوم پر عذاب نازل فرمادینگے۔ |

مذکورہ تین احادیث اصلاحِ معاشرہ کی اہمیت وضرورت اور بصورت دیگر پیش آنے والے حوادث وخطرات کو سمجھنے اور اس سلسلہ میں اپنی مسئولیت و ذمہ داری کو محسوس کرنے کیلئے بہت کافی ہیں اگر چہ ذخیرۂ احادیث میں اس طرح کی بے شمار روایات موجود ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قوم کی اس گرتی ہوئی حالت کا احساس —— گو دیر سے سہی —— اس وقت بہت سے علماء کرام ودانشمندانِ قوم کو ہو چکا ہے، اہل دل واہلِ نظر بزرگ تو بہت عرصہ سے متفکر و بے چین تھے، چنانچہ آج ان سب حضرات کی فکریں اور کوششیں معاشرہ کے ناسوروں کے علاج اور فواحش ومنکرات کے سدباب پر مرکوز ہو چکی ہیں، چنانچہ ان دونوں اس عنوان پر مقالات ومضامین مواعظ ومحاضرات کا سلسلہ ملک گیر سطح پر چل رہا ہے، علماء کرام ملک کے طول وعرض میں جارہے ہیں اور قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے کیلئے صورتحال کی نزاکت

[1] ابوداؤد: ۲/۵۹۶،

وخطرنا کی سے باخبر کررہے ہیں، اور بفضلہٖ تعالیٰ اس کے اثرات وثمرات بھی مشاہدہ میں آرہے ہیں تاہم ان کوششوں کے اعتراف کے باوصف یہ بات بھی قابلِ غور وفکر ہے کہ معاشرہ کے بگاڑ کی موجودہ کیفیت وکمیت کے مقابلہ میں ان مساعی کی قوت اصلاح کس قدر ہے؟ اسلئے کہ تیز رفتار سیلاب کی رَوکو مٹی کے متفرق ومختصر تودوں کے ذریعہ روکا نہیں جا سکتا، بلکہ اس کے لئے مربوط ومضبوط سنگین پشتے کی ضرورت ہوتی ہے، اگر آپ حکمت وتدبر کے ساتھ جائزہ لیں گے تو ماننا پڑے گا کہ موجودہ کوششیں نقصان کا احساس تو پیدا کرسکتی ہیں —— اگرچہ یہ بھی بڑا کام ہے —— لیکن اس کی تلافی کے لئے ہرگز کافی نہیں ہوسکتیں، اس کے لئے تو ایک مسلسل اور ہنگامی محنت کی ضرورت ہوتی ہے، بقول محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب مدظلہم کے کہ:

"عام دنوں میں بیماریوں کے علاج کیلئے ہسپتال جگہ جگہ موجود ہوتے ہیں ان میں ادویہ کا بھی اہتمام رہتا ہے لیکن جن دنوں طاعون، ہیضہ، یا کوئی اور وبائی بیماری پھیلی ہوتی ہے تو حکومت ان ہسپتالوں کو کافی نہیں سمجھتی بلکہ یہ ہنگامی انتظام کرتی ہے کہ گشتی ہسپتال گھر گھر پہونچ کر ٹیکہ اندازی، ادویہ کے چھڑکاؤ اور دیگر صیانتی انتظامات میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح جب روحانی امراض وبائی شکل اختیار کرجاویں تو ان کے مقابلہ کیلئے مدارس، خانقاہوں، اور علماء کے دروس کافی نہیں ہوتے، پوری ملت کو اس کام میں وقتی اور ہنگامی ضرورت کے مدنظر اس وقت تک کیلئے جڑ جانا ہوتا ہے، جب تک کہ یہ فتنِ دینیہ دفع نہ ہوجائیں، اور مسلمان اس آزمائش سے نکل نہ آئیں"۔

اور آج یہی صورت حال ہے کہ رسوم ورواج کی پابندی، احکامِ دین سے غفلت ولاپرواہی خدا فراموشی ومذہب بیزاری ایک عام وبائی شکل اختیار کرگئی ہے،

اور ہر کہہ ومہ کو اپنی لپیٹ میں لیتی جارہی ہے، بلکہ مقدار کی کمی وبیشی کے ساتھ سب کو لے بھی چکی ہے، بقول حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے

"وباء عام جو ہوتی ہے اس سے کوئی خالی نہیں ہوتا، وہ زہریلا مادہ کم وبیش ہر ایک میں ہوتا ہے"

چنانچہ اس وقت جبکہ ہمارا معاشرہ " ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ "اور "شُد مشرق ومغرب خراب" کا مصداق ہے اس کی اصلاح اب نہ کی گئی تو آگے معاملہ اندیشہ ہے کہ قابو سے باہر ہو جائے، سخت اور اولین ضرورت ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کی اس وقتی اہم اور سنگین صورتحال پر قابو پانے کیلئے پوری امت کا ایک ایک فرد فوری اثر کے ساتھ متوجہ ہو جائے، اسی کے ساتھ مستقل طور پر ایک جماعت کا دیگر کاموں کی طرح اسی کام کیلئے وقف ہو جانا بھی لازم ہے۔

قرآن مجید میں اس کا واضح حکم موجود ہے، بلکہ اسی حکم کی تکمیل پر کامیابی موعود ہے، ارشاد باری ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [1]

اور تم میں ضرور ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلی باتوں کا حکم دے اور بری باتوں سے روکے، اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

حضرت مولانا عاشق الٰہی بلند شہری مدظلہ فرماتے ہیں:

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کا تمغہ امتیاز ہے، اس کا خصوصی طریقہ پر اہتمام رکھنا ضروری ہے یعنی اس کو مستقل کام سمجھ کر دین کے دوسرے کاموں کی طرح انجام دینا امت کی اہم ذمہ داری ہے"۔[2]

آخر میں ایک اہم امر کی طرف توجہ دلا کر بات ختم کر رہا ہوں کہ اصلاح

[1] آل عمران: ۱۰۸، [2] شرح اربعین نووی: ص: ۲۸۱

معاشرہ کے سلسلہ میں غور کرنے سے معاشرہ کے اس عمومی بگاڑ کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آئی کہ اب مسلمان علم دین اور علماء کرام سے کافی دور ہوتے جارہے ہیں، بلکہ ایک بڑا طبقہ اب ایسا وجود میں آگیا ہے جو علماءِ دین کو غیر معتبر قرار دے کر ان کی بجائے نام نہاد واسلامک اسکالرز اور غیر معتبر داعیوں سے استفادہ کی باقاعدہ مہم چلا رہا ہے، اور جیسے جیسے ان کے اور علمِ دین اور علماءِ دین کے درمیان کی یہ خلیج بڑھتی جارہی ہے، معاشرہ کی تباہ کاریاں بھی بڑھتی جارہی ہیں، اور اب حد یہ ہے کہ زندگی کے تمام مرحلوں میں خاندانی روایات اور رائج الوقت رسومات کے علاوہ ان کا کوئی رہبر بھی نہیں ہے، معاشرتی مسائل میں اسلام کی کیا تعلیم ہے؟ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول واسوہ کیا تھا؟ اس سے کلیۃً بے خبر و جاہل ہیں، چنانچہ اچھے اچھے تعلیم یافتہ سنجیدہ اور منصف مزاج اصحاب بھی معاشرتی امور میں رسم ورواج کی لکیر پیٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس سببِ فساد کی جڑ کاٹے بغیر اور امت کو علماءِ دین سے جوڑے بغیر اصلاحِ معاشرہ کی تمام کوششیں سماجی پھوڑوں کا مرہم تو ہوسکتی ہیں، خون کی صفائی اور روگ کے ازالہ کا سامان نہیں ہوسکتیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سب مسلمانوں کو یہ حقیقت سمجھا دے، اور اس اہم ناسور کی طرف خصوصیت سے توجہ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

# کامیابی تو کام سے ہوگی[1]

آپ حضرات نے اطلاع حالات میں تسلسل اور اصلاحِ حال کی سعی جاری رکھنے کا عہد کیا ہوا ہے، مگر اس کی پابندی بالکل نہیں ہے، سب مصائب و مسائل اسی کا نتیجہ ہیں۔ دینداری محض وضع و قطع درست کر لینے کا نام نہیں بلکہ ظاہر و باطن، خلوت و جلوت میں حق تعالیٰ کی عظمت کے استحضار اور اس کی اطاعت پر دوام واستمرار حاصل ہونے کو حقیقی دینداری کہا جاتا ہے۔

آپ کے حالات ماشاء اللہ پہلے سے بہت تبدیل ہو گئے، اب رذائل کے ازالہ اور صفات حمیدہ کے پیدا کرنیکی سعی کرنی ہے اور اسی سے راہِ خدا میں ترقی ہوتی اور مقاماتِ قرب وانس حاصل ہوتے ہیں اور یہ کام کسی بڑے کی نگرانی ورہبری میں ممکن ہے نہ کہ ذاتی مطالعوں، شخصی تجربوں اور آپسی مباحثوں سے۔

یاد رکھئے! کسی نعمت و دولت کا حاصل ہو جانا جتنا دشوار گذار ہے اس سے کہیں زیادہ اس کا محفوظ و باقی رکھنا جاں گداز ہے۔ اگر آپ موجودہ دینی کیفیت پر قانع ومطمئن ہیں تو ـــــ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے ـــــ یہ خطرہ کی علامت ہے اور زوال کی نشانی ہے، اس کے برخلاف مسلسل کام کرنا اور مسلسل ڈرنا اور فکر کرتے رہنا آثار کمال میں سے ہے، جب یہ آیت نازل ہوئی: وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ اُولٰئِكَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُوْنَ ”وہ لوگ جو اپنے اعمال کے بعد اللہ تعالیٰ سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں کہ انہیں ایک دن اللہ کے سامنے جانا ہے وہ اللہ کی

[1] سعودی عرب میں مقیم ایک ذی استعداد مسترشد کو ایک خط کے جواب میں لکھا گیا مضمون۔

رحمت کے مستحق ہیں''، تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی نافرمانیاں کرتے پھر اس سے ڈرتے بھی رہتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں! بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو مسلسل بندگی وفرمانبرداری کرتے رہتے ہیں، پھر بھی عظمتِ الٰہی کا حق ادا نہ ہو سکنے کے احساس سے ان کے قلوب کانپ اٹھتے ہیں کہ کل حشر میں اپنے محسن ومہربان کو کیا منہ دکھائیں گے۔ **اللّٰھم اجعلنا منھم بمنک و کرمک**

افسوس! کہ طریقت وسلوک اور تصوف وتزکیہ —— جو کبھی ایمان کی ترقی، یقین کی پختگی، یادِالٰہی پر دوام وہمیشگی اور سید المحبوبین امام المعشوقین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کی والہانہ پاسداری کا ضامن تھا —— اب دل کی تسلی، کاروبار کی ترقی اور سکونِ ذہنی کا بہانہ بن کے رہ گیا ہے۔ بیعت مادی ترقیوں کے لئے اور ذکر وشغل، لذتِ نفسانی کیلئے رہ گئی ہے۔ اور پیر ومرشد —— جو کبھی قربِ خداوندی کے مراتب طئے کرنے اور لطائف روحانیہ کے مدارج سے گذرنے کے لئے راہنمائی ودستگیری کیا کرتا تھا —— اب اس کی ضرورت مادی ودنیوی مسائل ومصائب میں تسلی دینے اور مرادوں، ارمانوں کی تکمیل کیلئے دعاؤں کی درخواست کرنے سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے، لوگ اولاً تو شیخ کی طرف جا نہیں رہے ہیں اور اگر جا رہے ہیں تو مصائب سے گھبرا کر اور مسائل سے عاجز آکر جا رہے ہیں، نہ تصوف کی حقیقت سے واقف نہ سلوک کی غرض وغایت سے آشنا! نہ اخلاق کی اصلاح کی فکر نہ اخلاص کے حصول کی تمنا!! جدھر دیکھو غرض ہی غرض ہے، اسی کا سکہ چل رہا ہے اور اسی کا طوطی بول رہا ہے۔ **فیا للعجب!**

بات دراصل یہ ہے کہ ہر دور کا ایک فتنہ ہوتا ہے اس دور کا فتنہ ہر شخص کا اپنی فہم ورائے پر عجب، اپنی مفہومات ومزعومات کے اظہار کا شوق اور قیل وقال کی کثرت

ہے۔ کیونکہ جو شخص زیادہ بولتا ہے وہ کم سوچتا ہے اور جو کم سوچتا ہے وہ کم سمجھتا ہے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ اپنی اسی کم سمجھی کو معراج علم وعقل قرار دیکر خود بھی اختیار کرتا ہے اور دوسروں پر بھی مسلط کرتا ہے۔

دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ آپ قلیل الکلام اور طویل الصمت تھے، حالانکہ اس دنیا میں ان سے زیادہ کسی کو بولنے کی ضرورت نہیں تھی، دنیا ان سے زیادہ کسی کو سننے کی محتاج نہ تھی مگر آپ کی عادتِ شریفہ زیادہ تدبر کرنے اور مختصر بولنے کی تھی، پس میں آپ کو اور آپ کے ذریعہ وہاں کے تمام متعلقین کو سختی کے ساتھ تاکید کرتا ہوں کہ اگر اپنی اصلاح وفلاح چاہتے ہیں تو

۱۔ سب سے پہلے اپنی نیت کی تصحیح کریں، رضائے الٰہی اور خوشنودئ رب کے علاوہ کسی عمل کا کوئی مقصود نہو۔ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ صحابہ کرام کی تعریف میں ہے، اسی سے اپنی فکروں کا رُخ صحیح اور ارادوں کا قبلہ درست کرلیں۔

۲۔ ایک دوسرے کو تذکیر و یاددہانی میں تو خیر کوئی حرج نہیں لیکن بحث ومباحثہ کا سلسلہ فوراً بند کردیں، ہر شخص عزم وہمت سے کام لے کر یک طرفہ احتیاط شروع کردے۔

۳۔ جو لوگ بڑوں کے نقشِ قدم پر نہیں ہیں، ان پر اعتماد نہیں کرتے یا اعراض کرتے ہیں ان کی صحبت میں رہنے اور ان کی باتیں سننے سے اپنے کو محفوظ رکھیں، دیکھتے نہیں کہ اپنے آپ پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کر کے لوگ آج دربدر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

۴۔ روزمرہ کی زندگی میں اپنے مشاغل ومصروفیات میں اور وضع وقطع میں حتی المقدور اتباع سنت کا اہتمام کریں، نیز ادعیہ مسنونہ وماثورہ —— جو ہر تغیر حال پر کچھ نہ کچھ منقول ہیں —— یاد کر کے پڑھنے کا اہتمام رکھیں کہ یہ ایک محفوظ قلعہ اور

ترقی کا زینہ ہیں۔

۵۔ ہر قسم کے گناہوں سے خصوصاً انٹرنیٹ کے نامناسب استعمال سے سختی کے ساتھ اجتناب کریں۔آج کل اچھے اچھے شریف وسنجیدہ نوجوان —— بے دین واہل دین سبھی —— اس کے ذریعہ تباہ وبرباد ہورہے ہیں، الا ماشاء اللہ

۶۔ اخلاق واعمال کی درستگی کے لئے پوری دیانت کے ساتھ حالات کی اطلاع اور ہدایات کی اتباع کا سلسلہ مضبوط رکھیں، بلکہ وقت نکال کر سال میں کچھ دن اپنے شیخ کی صحبت کو لازم سمجھیں، ہمارے اکابر اپنی خالص دینی وعلمی مشغولیتوں میں سے بھی وقت کو فارغ کر کے اس کا اہتمام کرتے تھے،ہمیں اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔

۷۔ تلاوتِ قرآن پاک، مجوزہ ذکر اور مناجاتِ مقبول کی ایک منزل کا بھی روزانہ اہتمام خود بھی کریں، اور اپنے گھر والوں کو بھی سمجھا کر پابند کریں۔ نیز گھر میں کتاب کی تعلیم حیاۃ الصحابہؓ، خواتین کے شرعی احکام، اور ملفوظاتِ اکابر کے ذریعہ جاری رکھیں۔

۸۔ اپنے اور اپنے گھر والوں کیلئے شرعی لباس اور شرعی پردہ کا خاص خیال رکھیں، گھر والوں اور بچیوں کو بغیر آستین، کم آستین، بڑے گلے اور چست وتنگ نیز جسم کو چھلکانے والے باریک کپڑوں کے استعمال سے سختی سے بچائیں، اسی طرح اپنے لئے اور لڑکوں کیلئے ٹائٹ قسم کے جنس پینٹ اور بے ڈھب قسم کے جرکین یا معروف کمپنیوں کی تشہیر کرنے والے، عبارات لکھے ہوئے لوگوز چھپے ہوئے کپڑوں کے استعمال اور بلا ضرورت برہنہ سر رہنے کو ہرگز پسند نہ کریں بلکہ بہتر ہے کہ ہمت کر کے اپنے اکابر کے اختیار کردہ وضع میں رہا کریں۔

امید کہ اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر شیخ کے غائبانہ بھی دیانت کے ساتھ عمل کرتے رہیں گے۔کام کرو کام سے ہی کامیابی ہوتی ہے۔

# یہ نعمت برتو اور بانٹو![1]

**نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم اما بعد**

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بندوں کی ہدایت ورہنمائی کیلئے اپنا سب سے آخری پیغام اور پسندیدہ طریقۂ حیات دیکر مبعوث فرمایا۔

جب آپ دنیا میں تشریف لائے تو انسانیت خواہشاتِ نفسانیہ اور اغوائے شیطانی کے دلدل میں اس قدر پھنسی ہوئی تھی کہ حیوانیت بھی اس بے راہ روی اور آزادی پر شرمندہ تھی، اُولٰئِکَ کَا لْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَل: ایسے حالات میں آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنا وہ اسوۂ حسنہ اور زندگی کا عملی نمونہ پیش فرمایا جس نے ننگِ انسانیت قوم کو رشکِ ملائک بنادیا، جس نے خون کے پیاسوں کو جانثاری سکھائی اور جس کی بدولت حجاز کے بادیہ نشین ربع مسکون کے حکمران بن گئے، یہی نہیں کہ صرف زندگی کے ڈھنگ درست ہوئے بلکہ ان لوگوں کے قلب وروح نے اس اسوۂ حسنہ سے وہ جلا پائی کہ ان کے رب نے ان کو پیار ومحبت، رضوان و مغفرت کا پروانہ جیتے جی عطا فرمادیا، پھر جب تک یہ دنیا اس اسوۂ حسنہ کی قدردان اور اس پر کاربند رہی تو دارین کی سرخروئی کا پھل پاتی رہی اور جب جب اس نے اس مبارک طریقہ سے سرموانحراف کیا نقصان ہی اُٹھایا اور پچھتاوے کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا، ملتِ اسلامیہ کی پوری تاریخ اس حقیقت کی ناطق اور اس پر شاہد ہے۔

اس حقیقت ——— جس کی سچائی میں دورائیں نہیں ہوسکتیں ——— کے باوجود

[1] مخدومی ومرشدی حضرت مفتی سعید احمد صاحب پرنام بٹی مدظلہ العالی کے ایک فکر انگیز مضمون پر لکھا گیا ابتدائیہ!۔

آج امت اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے انحراف اور نفسانی وشیطانی خواہشات کی اتباع کا جرم دہرا رہی ہے، بالخصوص شادی بیاہ کے مواقع پر تو خدا جانے ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ انتہائی نا معقول و نا مانوس حرکات اور ننگِ انسانیت وشرافت بلکہ ہندوانہ رسوم ورواج میں پڑے ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں علاقائی فرقِ رسوم سے صرفِ نظر مشرق سے مغرب تک آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ چھوٹے بڑے، امیر وغریب، پڑھے لکھے اور جاہل، شہری ودیہاتی، دیندار کہلائے جانے والے اور بے دین —— الا ماشاء اللہ —— سب کے سب اس دھارے میں بہہ رہے ہیں، اس کے برے نتائج بھگت رہے ہیں، شکایات کر رہے ہیں، پریشان ہو رہے ہیں، ان میں سے بعض لوگ تو ان حرکتوں کے جائز اور برا ہونے کو بھی مان رہے ہیں مگر ہمت کر کے چھوڑنے کے لئے بہت کم تیار ہو رہے ہیں، ستم بالائے ستم یہ کہ دن بہ دن ان روایات ورسوم میں نت نئے اور فحش وبیہودہ رسوم کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

حالانکہ ایک ایسے وقت جب کہ ملک کی تمام اقوام شادی بیاہ کے مسئلہ کو لے کر چیخ وپکار کر رہی ہیں، اس کی زیر باری اور گرانی سے کراہ رہی ہیں —— کاش کہ —— مسلمان اپنے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی سراپا رحمت تعلیمات کی عملی تصویر دُنیائے انسانیت کے سامنے پیش کرتے تو تنہا یہی عمل کتنے ہی نفوس کے اسلام سے مانوس ہونے اور اس کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہو جانے کا سبب بن جاتا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اتباعِ ہوا وہوس سے نکل کر اتباعِ حق میں لگنے کی توفیق عطا فرماویں۔ آمین

# معارف الحدیث[1]

## نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

حدیث، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے صادر شدہ احکاماتِ الٰہیہ کا نام ہے، یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف قرآن کریم بندوں تک پہونچا دینے کے لئے بحیثیت سفیر وقاصد متعین نہیں فرمایا تھا، بلکہ اپنی خداداد خصوصی صلاحیتوں کے ذریعہ قرآن کریم کی روشنی میں ہدایتِ انسانی کے نظام کی تکمیل اور اس کی تعمیل کے واسطے مبعوث فرمایا تھا۔

ارشادِ باری ہے: وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب وحکمت نازل فرمائی، اس میں بالاتفاق ''الْكِتَابَ'' سے قرآن حکیم اور ''الْحِكْمَة'' سے حدیث وسنتِ رسول مراد ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''دینِ اسلام'' قرآن وحدیث کے مجموعہ کا نام ہے، نہ صرف قرآن کریم کا اور نہ صرف حدیث شریف کا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اپنی اطاعت کیساتھ رسول کی اطاعت کا بھی پابند فرمایا ہے ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ'' اللہ تعالیٰ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو، بلکہ مزید وضاحت کیلئے فرمایا: مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ کہ جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کی، پس جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت نام ہے قرآن کریم کی اطاعت کا، اسی طرح رسول کی اطاعت نام ہے احادیثِ مبارکہ اور

---

[1] کرسٹل ایجوکیشنل ٹرسٹ آندھراپردیش کی جانب سے ''معارف الحدیث'' کے مقامی زبان '' تلگو '' میں ترجمہ ہونے پر ذمہ داران ٹرسٹ کی خواہش پر لکھا گیا مقدمہ جس کے ذریعہ کتاب اور صاحبِ کتاب کا جامع تعارف بھی سامنے آجاتا ہے۔

سنتِ نبویہ کی پیروی کا، حاصل کلام یہ ہے کہ دینِ اسلام کا سمجھنا اوراس پر صحیح طور پر عمل پیرا ہونا احادیثِ مبارکہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے، اسلئے علماء امت نے ہر زمانہ میں "قرآن کریم" ہی کی طرح "احادیثِ رسول" کی حفاظت واشاعت میں جان توڑ کوششیں اور والہانہ محنتیں کی ہیں، جو بجائے خود ایک معجزہ اسلام ہے۔ پھر چونکہ کتاب وحکمت یعنی قرآن وحدیث کی زبان "عربی" ہے اور تمام دنیا کے مسلمان نہ عربی زبان سے واقف ہیں اور نہ سب کے لئے ممکن ہے کہ وہ عربی زبان سیکھ کر ان کا مطالعہ کریں، اس لئے علماءِ اسلام نے ہر دور میں اس بات کی فکر بھی فرمائی ہے کہ قرآن وحدیث کا زمانہ میں رائج تمام زبانوں میں ترجمہ کر کے ہر علاقہ کے رہنے والے اور ہر زبان کے جاننے والے تک ان کے پیغام کو پہونچائیں۔

ہندوستان رنگ ونسل ہی نہیں، زبان وتہذیب کے اعتبار سے بھی متنوع اور رنگارنگ ملک ہے، یہاں ایک ہی ملک کے حدود میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں، یہ فطرت ہے کہ ہر شخص کو اپنی زبان سے محبت ہوتی ہے اور وہ اپنی زبان میں بات کو جس طرح سمجھ سکتا ہے، اجنبی زبانوں کو اگر جانتا بھی ہے تو اس طرح سمجھ نہیں پاتا جس طرح مادری زبان میں سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے ہمارے ملک کے علماء کرام نے دینِ اسلام کی تعلیمات کو ملک میں رائج تمام زبانوں میں منتقل کرنے کا کام اہتمام سے کیا اور کر رہے ہیں۔ **جزاهم الله تعالیٰ**

ہماری ریاست آندھراپردیش میں غیر مسلم بھائیوں کی زبان تو "تیلگو" ہے ہی، مسلمان بھی بعض شہروں کو چھوڑ کر تقریباً علاقوں میں تلگو زبان ہی سے واقف ہیں، ان کے دین سے استفادہ اور ان تک دین کو پہونچانے کا ذریعہ تیلگو زبان ہی ہے، اس لئے تیلگو میں اسلامک لٹریچر تیار کرنے کی مساعی بھی مختلف افراد اور اداروں کی جانب سے کسی نہ کسی درجہ میں جاری ہے، اور اس سے نفع بھی ہو رہا ہے، تاہم

ضرورت تھی کہ علمی کتابوں اور شروحِ حدیث وغیرہ کا ترجمہ بھی تلگو زبان میں کیا جائے۔ چنانچہ آج کل اس کی جانب بھی توجہ کی جارہی ہے۔

یہ کتاب "معارف الحدیث" جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، اردو زبان میں لکھی جانے والی علمی کتابوں میں بہت بلند مقام رکھتی ہے، مصنف نے کتبِ حدیث کے تقریباً تمام ابواب کا اس میں استقصاء کیا، اور ان میں ذخیرۂ احادیث کو کھنگال کر اس کا گویا عطر نچوڑ دیا ہے اور کمال یہ ہے کہ احادیثِ مبارکہ کے انتخاب میں استناد واحتیاط، تشریح میں علماءِ متقدمین اور سلفِ صالحین پر اعتماد، زبان و بیان میں عوام الناس کی صلاحیت واستعداد کی رعایت، اندازِ تفہیم میں قارئین کے اندر عظمت ومحبتِ رسول اور اتباعِ دین کا ذوق پیدا کرنے کی خصوصیت اور اختلافی موضوعات سے بچنے کی حتی المقدور مخلصانہ کوشش کا اہتمام فرمایا، یہی وجہ ہے کہ علمائے امت نے اس کتاب کو مصنف کا اردو دانوں پر احسانِ عظیم ودینِ اسلام کی نہایت وقیع خدمت قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا شمار ان چند کتابوں میں ہوتا ہے جنہیں عوام وعلماء دونوں میں یکساں قبولیت و پذیرائی حاصل ہوئی۔

جہاں تک خود مصنف کے تعارف کا تعلق ہے، تو وہ ہندوستانی مسلمانوں بالخصوص پڑھے لکھے لوگوں کے لئے چنداں محتاجِ تعارف نہیں ہیں، ان کی خدماتِ جلیلہ خود ان کا تعارف ہیں، وہ یوپی کے مردم خیز قصبہ سنبھل کے متوطن، دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز سپوت، علامہ کشمیریؒ کے قابل فخر تلمیذ، معارفِ ولی اللٰہی اور علومِ انوری کے پاسبان وامین، توحید وسنت کے انتہائی غیور محافظ، عقائدِ اہل السنّت کے پرزور حامی وداعی، فرق باطلہ کے لئے شمشیرِ بے نیام، جہد وعمل کی اچھوتی تصویر، علم وتحقیق کے کوہ فلک بوس تھے۔ ان کے اندر حق کی حمایت وحفاظت اور امتِ مسلمہ کی اصلاح وہدایت کا جذبۂ فراواں ہر وقت موجزن رہتا تھا، ان کی

غیرتِ ایمانی دینِ اسلام اور عقائدِ اہل سنت پر ادنیٰ داغ یا ضعف کو برداشت نہیں کرسکتی تھی، اسی کے ساتھ وہ مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے رکنِ شوریٰ، رابطہ عالم اسلامی کے ممبر، ماہنامہ الفرقان کے مدیر، بیسیوں کتابوں کے مصنف بھی تھے، اس سب کے باوصف ان کی ہستی نہایت متواضع، خوش خصال، زاہد و مرتاض، عاجز وقانع، شب زندہ دار و تہجد گذار، پرہیز گار خودنمائی واظہار سے دستبردار تھی۔غرض وہ ـــــ اللہ غریقِ رحمت کرے ـــــ سلفِ صالحین کا اس دور میں ایک عملی نمونہ تھے۔

# اسلام، رمضانی مذہب نہیں!

ناظرین کرام کی خدمت میں عید کی پرخلوص مبارکباد پیش ہے۔خدا کرے کہ آپ نے ماہِ مبارک کی کما حقہ قدر کی ہو۔اوراب اس موسمِ بہار کے اثرات وثمرات، انمٹ نقوش وتاثرات اورقلب ودماغ میں سرایت شدہ انوار وبرکات کولیکر سال بھر روحانی ونورانی زندگی گزارنے کے عزم کے ساتھ عیدگاہ سے لوٹے ہوں۔میں اپنے لئے بھی اورآپ سب کے لئے بھی حق تعالیٰ سے دعاء گوہوں کہ وہ ربِ قدیر وکریم اپنے کرم سے ہم سبھوں کے لئے زندگی بھرراہِ مستقیم پر چلنا سہل فرمائے۔اور اپنی مرضیات کے اتباع کی توفیق نصیب فرمائے آمین۔

قابلِ احترام قارئین! ماہِ مبارک ۳۰ دنوں تک رحمت ،مغفرت اورجہنم سے نجات کی سوغات تقسیم کرنے کے بعد چلا گیا۔گویا پورے آب وتاب اور بھر پور شباب کے ساتھ آیا اورامتِ مسلمہ کے فرزندوں کے دامنِ مراد کوبھر کے رخصت ہوگیا۔لیکن ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ جیسے ہی شوال المکرّم کا چاند نظرآیا مسجدیں ویران ہوگئیں اور اعمال واذکار کی باغ وبہار ختم ہوگئی، قرآن حسین جزدانوں میں ایک سال کے لئے پھرمحفوظ کر دیئے گئے ،مصلے المباریوں اورصندوقوں میں لپیٹ کر رکھ دیئے گئے ،عوام وہی ہفتہ واری نماز کی عادت پر واپس ہوگئے ، اور خواص کے جذبہ ہائے ایثاراورشوقِ طاعت ماند پڑ گئے ۔گویا مسلمانوں نے ابناءِ وطن اور اقوامِ زمن کے سامنے بالاتفاق ثابت کردیا کہ اسلام کوئی آفاقی وابدی

مذہب کا نام نہیں بلکہ سال میں ایک ماہ کے جوش وخروش کا نام ہے۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ۔

حالانکہ اسلام نے اپنے کو دیگر ادیان ومذاہب سے اس قدر ممتاز ومنفرد خصوصیات کا حامل بنا کر پیش کیا ہے کہ کسی مذہب، کسی تہذیب کے ساتھ کسی قسم کے تشبہ کو پسند نہیں کرتا، حتیٰ کہ یہ وارننگ بھی اس نے اپنے پرستاروں کو دے دی ہے کہ جو کسی اور قوم سے مشابہت اختیار کرے گا تو وہ اُسی قوم کا فرد سمجھا جائے گا۔ فرزندانِ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مثلاً یوم عاشورہ کے بارے میں آیا ہے کہ یہودی اُس دن روزہ رکھتے تھے، نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس دن روزہ رکھنے کی واقعیت اور نبوی نسبت کی وجہ سے پسند تھاہ روزہ رکھا جائے، اسلئے آپ ﷺ نے بھی روزہ رکھا، اور اس عمل کو اسلام میں برقرار رکھنے کی تعلیم دی، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ ”اگلے سال میں رہا تو دو روزے رکھوں گا“ تا کہ یہودیوں سے مشابہت نہ رہے۔ اسی طرح سحری کو بابرکت قرار دیکر اس کی ترغیب دی تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ہمارے اور یہودیوں کے روزے میں سحری ہی سے فرق ہوتا ہے۔ سوچنے سے اس کی سینکڑوں مثالیں اسلامی تعلیمات میں ملیں گی۔

اب ذرا ٹھنڈے کلیجے سے غور کیجئے کہ ملتِ اسلامیہ کی اکثریت ہفتہ میں ایک دن یعنی صرف جمعہ کی نماز کا اہتمام اور ہفتے کے بقیہ دنوں میں اس سے بالکل قطع تعلق کر کے کہیں یہودیوں، عیسائیوں، اور ہندوؤں کے ہفتہ وار ”پریر“ سے مشابہت تو نہیں اختیار کر رہی ہے؟ اور برس کے بارہ مہینوں کے مقابلہ میں صرف رمضان کو ماہِ عبادت واطاعت قرار دینے میں کہیں شیعوں کی اربعین اور ایپّا سوامی والوں کے ساٹھ دن سے عملی مشابہت تو نہیں ہو رہی ہے۔؟؟؟

یاد رہے کہ مذکورہ تشبیہ میں میرا اشارہ اس طبقہ کی طرف نہیں ہے جو سال بھر

بھی طاعت وفرمانبرداری والی زندگی گذارتے ہیں اوراس قسم کے مبارک مواقع و مبارک اوقات میں اسکے اہتمام کواور بڑھادیتے ہیں، اس لئے کہ یہ تو عین مطلوب اور شارع کے نزدیک محبوب عمل ہے۔ بلکہ میری گفتگو اُن بھائیوں سے ہے جو خاص مواقع پر اپنی صلاحیت وزندہ ضمیری کا ثبوت دینے کے بعد اچانک اس طرح ماحول میں کھوجاتے ہیں گویا اسلام ان کے حق میں صرف ایک ماہ کیلئے ہی آیا تھا اور اب وہ آزادی ومن پرستی کے مختار ہیں، اسلام اور اسلامی احکامات کے پابند نہیں!

میرے پیارو، دوستو، بزرگو! دنیا کی اس سب سے برحق اور برتر قوم کیلئے کیا یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی مسلسل اطاعت اور شب وروز کی فرمابرداری کے ذریعہ اقوامِ عالم پر عملاً یہ واضح کردے کہ اسلام، تمہاری طرح چند رسم ورواج اور چند تخیلات وتصورات کے مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا زندہ وتابندہ مذہب ہے کہ صرف اسی کو مکمل دین اور مستقل تہذیب ہونے کا شرف حاصل ہے کسی اور مذہب کو نہیں۔ یا یوں کہیے کہ اسلام سمندر کی طرح ایک اٹل وجود، اور ناقابلِ تسخیر حقیقت ہے اور دنیا کے تمام مذاہب ندی نالوں اور چشموں کے مانند ہیں کہ اگر انھیں اپنا وجود ہمیشہ کیلئے برقرار رکھنے کی تمنا ہے تو اپنی اپنی جگہ سرکشی کرتے رہنے کے بجائے اس سمندر میں اپنے آپ کو ضم کرلیں اور اپنے وجود کو مٹادیں ، ورنہ سمندر سے اٹھنے والے طوفان اور بادوباران خود ہی انھیں گھسیٹ کے اپنے اندر ضم کرلیں گے۔

مسلمانو! ایک ایسے وقت میں کہ دنیا نفسانیت وشہوانیت کے تقاضوں کو اپنا معبود بنا کر اسکی پرستش میں حیوانیت ودرندگی کی سطح سے بھی نیچے گر جانے کے بعد کچھ نہ پا کر اور مایوس اور نامراد ہو کر واپس آرہی ہے اور کسی "روحانی زندگی" کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اسلام کو کیا یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے فرزندوں سے اس کی

توقع رکھے کہ وہ اپنے مسنون سراپا اور اسلامی شب وروز کے ذریعہ اس ہراساں وپریشاں انسانیت کے قلوب کو جیت لیں اور انکی درد کی دوا ثابت ہوجائیں؟ اور اگر ہے تو پھر آپ اپنے کو اسکا کس قدر اہل ثابت کرسکتے ہیں اور اس بجا توقع کی تکمیل میں کتنا حصہ لے سکتے ہیں؟! آج یہ سوال ہر باضمیر اور اسلام پسندی کے دعویدار فرد یا جماعت کے سامنے موجود ہے۔

یاد رکھئے! اسلام نے جب بھی اپنے کو منوایا ہے تو عمل سے منوایا ہے تحریر وتقریر، حجج ودلائل اسلام فہمی میں محض مددگار کی حیثیت رکھتے ہیں، ان سے اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرنا ممکن نہیں۔ اسلام کی توسیع واشاعت اور اسکی دعوت کا مؤثر ذریعہ "اجتماعی عملی زندگی" ہے، نہ کہ صرف عقلی وعلمی اثبات، بحث ومباحثہ اور محض مجادلہ ومناظرہ۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اسلام اصلاً ایک "عملی زندگی" ہے نہ کہ کوئی "نظریاتی بحث"!

پس عملی نمونے کے بغیر اسلامی دعوت کی باتیں کرنا، اور یکّا دکّا قبولیتِ اسلام کے واقعات پر فخر کرنا "طفل تسلی کے سامان" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا!

اسی لئے قرآن کا اعلانِ عام ہے: "اے ایمان والو! پورے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ اور شیطان کی چال نہ چلو وہ تمہارا کھلا دُشمن ہے"۔

آیئے ارادہ کریں گے کہ ابھی رمضان المبارک کے بابرکت اثرات اور انوار ہماری زندگیوں میں موجود ہے عملی زندگی تقویٰ وطہارت کا ماحول بہت دور نہیں چلا گیا ہے۔ ان اثرات وبرکات کو باقی رکھنے، جمے رہنے اور اسے پھیلانے کیلئے کمرِ ہمت کس لیں گے اور نفس وشیطان کے حملوں سے محفوظ رہنے کی مسلسل جد وجہد کرتے رہیں گے۔

یاد رکھئے! اس کا نسخہ، خود ہمت کرنا، ہمت کرنے والوں کی صحبت میں رہنا اور اللہ تعالیٰ سے ہمت وتوفیق طلب کرتے رہنا ہے۔

# ماہِ ربیع الاول اور ہمارا طرزِ عمل

ہر سال کی طرح اس سال بھی ربیع الاول شروع ہوتے ہی "میلا د النبیؐ" اور "سیرۃ النبیؐ" کے چھوٹے بڑے جلسوں اور جشنوں کا سلسلہ شروع ہو جائیگا، ہمارے ہاں حیدرآباد میں بھی بعض جلسے بہت برسوں سے بڑے اہتمام سے پابندی کے ساتھ ہوتے آرہے ہیں، چنانچہ کوئی پروگرام چھتیسواں ہے تو کوئی اڑتالیسواں وغیرہ، اسی طرح ایام بھی منائے جاتے رہے، مثلاً دورِ آصفی میں "یوم افضل الانبیاءؐ" بڑے اہتمام اور تزک واحتشام سے منایا جاتا تھا، اس کی صدارت خود فرمانروائے دکن آصف جاہِ سابع نواب میر عثمان علی خان کیا کرتے تھے، جس میں بڑے بڑے قابلِ فخر اور لائقِ روزگار علماء مقررین حصّہ لیا کرتے تھے، آج کل بھی بعض مذہبی وسیاسی تنظیمیں بڑے جوش وخروش کے ساتھ نہایت کثیر مصارف سے اوراونچے پیمانہ پر ۱۲/ربیع الاول اوراس سے متصل جلسے کرتی ہیں، نعتیہ مشاعرے، تحریری وتقریری مقابلے وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان سب پروگراموں سے برادرانِ اسلام کا مقصد سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے قلب میں موجود وموجزن اس تعلق ومحبت کا اظہار کریں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی کے ساتھ جزوِ ایمان بلکہ ایک حیثیت سے عین ایمان بن کر پائی جاتی ہے۔ یا پھر پڑھے لکھے طبقہ میں اسے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے تعارف کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے، اوران کا یہی عنوان بھی ہوتا ہے، مگر غور طلب امر یہ ہے کہ آیا تعارف اسلام یا اظہارِ عقیدت ومحبت کے لئے بھی

پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمیں کسی ضابطے اور حدود و قیود کا پابند کیا ہے؟ یا ہر شخص کو اس بات کی آزادی دیدی ہے کہ اس کی سمجھ میں جس طرح آئے عقیدت وارادت کا اظہار کرتا پھرے، اور اسلام کے تعارف کے لئے من مانے انداز واطوار اختراع کرتا رہے؟ میرے خیال میں کوئی عقل منداور مزاج شناس شریعت ایسا نہ ہوگا جو پہلی بات کی واجبیت اور دوسری بات کی نامعقولیت کو تسلیم نہ کرے، یعنی جس طرح آپ نے ہر کام کا نہایت جامع وپُر وقار طریقہ عمل امت کو دیا ہے وہیں پر اپنی محبت کے اظہار اور اپنی شان ومقام کے اعلام کا بھی طریقہ امت کو سکھلایا ہے، جو صحابہ کرامؓ اور مابعد کے عاشقانِ رسول علماء، فقہاء اور اولیاءِ امت کی زندگی وتعلیم میں موجود ہے۔

پھر جب حقیقت یہ ہے تو ہمیں "میلاد النبیؐ" کے ان رائج پروگراموں اور جشنوں کو میزانِ عقل ودانش اور پیمانۂ علم وشرع پر رکھ کر دیکھنا ہوگا کہ وہ شریعتِ اسلامی کے مخصوص مزاج سے کس قدر میل کھاتے ہیں؟ اور اس میں کتنا نفع واثر ہے؟ ان کے ذریعہ سے کتنے لوگوں کی زندگیوں میں عملی تبدیلی اور اخلاقی انقلاب رونما ہورہا ہے؟ کتنی قوموں نے ان جشنوں سے متاثر ہوکر صداقت اسلام کو تسلیم کرلیا۔

یہ ایک تلخ مگر تحقیقی بات ہے کہ اس کے جواب میں کوئی مثبت نظیر پیش نہیں کی جاسکتی ایک آدھ واقعہ اگر ہوگا بھی تو وہ نادر ہے اور "النادر کالمعدوم" معروف ومسلم قاعدہ ہے۔ اس کی وجہ غور کرنے سے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس قسم کے کام نیت وعمل دونوں ہی میں بگاڑ کے شکار ہوتے ہیں، اور یہ بگاڑ کچھ ضروری نہیں کہ قصداً ہی ہو اس لئے ہم کسی پر بدنیتی کا الزام تو ہرگز نہیں رکھتے تاہم اپنی فہم کے مطابق قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کی نشاندہی کو ضروری سمجھتے ہیں۔

نیت کے متعلق جو کوتاہیاں تجربوں اور تبادلۂ خیال کے دوران محسوس ہوئی

ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ عموماً اس قسم کے جشن تقلید مسیحیت اور غیروں سے مرعوبیت کا نتیجہ ہیں، یعنی چونکہ مسیحیوں کے ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یومِ ولادت عالمگیر پیمانہ پر بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا ہے اوراسے نہ صرف مذہبی فرض سمجھا جاتا ہے بلکہ بارگاہِ عیسوی میں تقرب وخصوصیت کا وسیلہ بھی گردانا جاتا ہے، اسی طرح دیگر اقوامِ ہند بھی اپنے پیشواؤں کے یومِ ولادت ووفات منانے کا اہتمام کرتے ہیں، بس مسلمانوں نے ان کی دیکھا دیکھی اپنے ہاں بھی اس عمل کو شروع کرلیا کہ ۱۲؍ربیع الاول کو عظیم الشان پیمانے پر جلسے جلوس کرلیے جائیں۔ مخصوص پکوان کرکے بارھویں شریف کی فاتحہ دے دی جائے تو ہم بھی مقربینِ بارگاہِ محمدیؐ میں شمار ہوجائیں گے، خواہ پوری عملی زندگی حبِّ رسولؐ کے تقاضوں سے یکسر خالی ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ عوام الناس عملاً واعتقاداً اسے ایک عید اور جشن سے زیادہ کچھ نہیں جانتے، اسی لئے محض اس میں شرکت اور عید والے اہتمام کو کافی سمجھتے ہیں۔

نیت کی ایک کوتاہی یہ کہ عام طور سے اب یہ جشن سیاسی طور پر بھی منائے جارہے ہیں، کشتیٔ سیاست کے بہت سے ناخداؤں کا حال یہ ہے کہ عوام الناس کو اپنی پارٹی سے مرعوب اور وابستہ کرنے کے لئے ان کے دینی ومذہبی جذبات کا استحصال کررہے ہیں، کیوں کہ عوام الناس اپنے لیڈروں سے خالص سیاسی امور میں کسی مؤثر ومخلص نمائندگی سے یکسر مایوس ہوچکے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک پارٹی کوئی پروگرام بناتی ہے تو دوسری ضرور اس کے بالمقابل کچھ کر دکھاتی ہے، پھر ان جلسوں اور جشنوں میں عموماً "سیرت النبی" صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق گفتگو کم اور دیگر چیزیں زیادہ بیان ہوتی ہیں، چنانچہ بعض مقامات پر یہاں تک معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی مبارک خلق کا حوالہ دیکر اپنی مخالف پارٹی پر جی

بھر کیچڑ اُچھالا گیا، گویا نبی کی ذات وصفات کے تذکرہ کو بھی اب اپنے نفس کے جذبۂ انتقام کی تسکین کا سامان بنایا جارہا ہے۔ والعیاذ باللہ

کہیں یہ ہورہا ہے کہ جماعتی ومسلکی ضدا ضدی میں جلسے منعقد ہورہے ہیں، مثلاً کسی جگہ ایک مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والوں نے اپنے ممدوح علماء کو بلا کر جشن منایا، فوراً اسی جگہ ایک دوسرے مکتبِ فکر کے لوگوں نے اپنے علماء وقائدین کو مدعو کرکے ایک جلسہ کردیا، ایسی جگہوں پر معلوم ہوا کہ ایک دوسرے کو چھیڑ کر خفیہ فتنوں کو جگانے اور انتشار کی آگ بھڑکانے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا، ذرا سوچئے کہ اس طرح اسلام کا کیا خاک تعارف ہوگا؟ اور کیا اہلِ اسلام کے قلوب میں سیرتِ مصطفوی کی عظمت پیدا ہوگی؟

یہ تین مثالیں نیت کی خرابی کے سلسلے میں عرض کی گئیں، غور کرنے سے بہت سی اور باتیں سمجھ میں آئیں گی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نیت ایسی نہیں ہے جو عمل میں جان ڈال کر اسے مؤثر ومُفید بنا سکے۔

جہاں تک عملی خرابیوں کا تعلق ہے وہ اس قدر ہیں کہ ان کا احاطہ مشکل ہے تاہم بطور مثال کے چند ایک ان میں سے بھی ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۔ سڑکوں کو بند کرکے جلسہ گاہ تیار کرنا، سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا، ایمان کے ستر یا ستہتر شعبے ہیں ان میں سے ایک "راستہ سے ایذا دہندہ چیز کا ہٹا دینا ہے" اگر سڑک سے رکاوٹوں وتکلیفوں کا ہٹانا ایمان ہے تو آپ خود سمجھ لیں کہ روکاوٹیں کھڑی کرنا کیا ہوسکتا ہے؟ خصوصاً ایسے راستے جن کے بند ہونے سے متعدد علاقے والوں کو تکلیف پیش آتی ہے، کسی کو وعظ ونصیحت کے لئے اگر مسجد جیسی جگہ پسند نہ ہو یا تنگ ہو تو کم ازکم کسی گراؤنڈ پر کرلیں، اس معاملہ میں جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ ایک جگہ کے نوجوانوں کا اصرار تھا کہ یہاں چونکہ گنیش کی مورتی بٹھائی گئی تھی اس لئے ہم

اسی جگہ پر سیرت النبیؐ کا جلسہ کریں گے، یعنی بے ایمان اور اہلِ ایمان کے اخلاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ع

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مُرا

۲۔ بلا ضرورت لاؤڈ اسپیکر کا استعمال، خصوصاً جب کہ بستی کی جگہ ہو اور اپنے پرائے سب ہی رہتے بستے ہوں، ضعفاء، خواتین بچے اور مریضوں کی کوئی رعایت کئے بغیر اس قدر شور و ہنگامہ کہ رُوح کانپ اُٹھے، یہ غیر اخلاقی حرکت اسی نبیؐ کی سیرت نگاری کے نام پر کی جاتی ہے جس نے اپنے ماننے والوں کا تعارف" جن کی زبان اور ہاتھ (یعنی ان کے وجود) سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں" کے ذریعہ کرایا ہے، اور خود جس کے اخلاق یہ تھے کہ "صُفّہ" پر تشریف لاتے تو وہاں موجود اپنے علاقوں کی اس قدر رعایت فرمائی جاتی کہ "سلام بھی اتنی ہلکی آواز میں کرتے کہ سونے والے جاگ نہ جائیں اور جاگنے والے سُن لیں"

۳۔ جلسہ گاہ اور راستوں میں بجلی کے قمقموں کا اہتمام درانحالیکہ فقہاء کرام نے اسے ہندوؤں کے چراغاں اور دیپاولی کی خالص ہندوانی رسم سے مشابہت کی وجہ سے ممنوع قرار دیا ہے۔ اگرچہ کہ اب استعمالِ عام کی وجہ سے کسی کی مشابہت تو نہیں رہی تاہم اسراف وفضول خرچی تب بھی ہے، نیز اسلام کی سادگیٔ مزاج کے خلاف بھی۔

۴۔ بعض جگہ اسٹیج کیلئے منڈپ بھی نہایت زرق برق اور شاہانہ تیار کیا جاتا ہے جو اسراف وتبذیر میں داخل ہو کر خالص شیطانی حرکت اور فضول عمل ہے، کیوں کہ مقررین کو نمایاں کرنے کیلئے تو صرف عوام کی نشست سے ذرا بلند جگہ کا انتظام بھی کافی ہو جاتا ہے۔

۵۔ اسٹیج پر بعض مرتبہ علاقے کے بڑے بڑے ظالم وفاسق بڑے اعزاز سے

جمع کیئے جاتے ہیں اور وقفہ وقفہ سے ان کی مبالغہ آمیز اور خلافِ واقعہ تعریف وتوصیف صرف ان کا جی خوش کرنے کے لئے کی جاتی ہے جب کہ حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ "فاسق و بدعتی کی تعظیم سے خدا تعالیٰ کا عرش بھی کانپ اٹھتا ہے"۔

۶۔ پھر بعض دفعہ اسٹیج پر سیاسی وعوامی لیڈروں کو بھی خطاب کی دعوت دی جاتی ہے وہ علومِ اسلامیہ اور سیرتِ نبویہؐ سے اپنی ناواقفیت کی بناء پر بہت سی من گھڑت اور لغو باتیں کہہ گذرتے ہیں، نیز بعض ایسی باتوں کی نسبت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات والا صفات کی جانب کردیتے ہیں کہ جو اسلامی نقطہ نظر سے سنگین جرم اور قابلِ مواخذہ گناہ ہے، مگر ان حضرات کی حیثیت عرفی اور رسوخ کی بناء پر یا فتنے کے خوف سے کسی دوسرے کو یا انتظامیہ کو ان باتوں کی تردید کی ہمت بھی نہیں ہوتی، نتیجۃً شخصیتوں کے مقام سے دین کا مقام فروتر ہوجاتا ہے۔

۷۔ منتظمینِ جلسہ خصوصاً نوجوان اس کے انتظامات میں کئی کئی وقت کی نمازیں غائب کردیتے ہیں اور رات دیر گئے تک انتظامات سے فارغ نہ ہوسکنے کی بناء صبح کی نماز کے وقت وہیں پڑے سوتے رہتے ہیں، نماز نہیں پڑھتے، جب نماز جیسا فریضہ داؤ پر لگ گیا تو اس جلسے کا مقصد اور فائدہ کیا ہوا؟ حضرت پیرانِ پیرؒ کا یہ جملہ نہایت جامع اور توجہ طلب ہے "نماز کے بغیر کوئی نیکی مقبول نہیں"۔

۸۔ انتظامات کے لئے جو چندہ جمع کیا جاتا ہے اسکا طریقہ بھی بے ڈھب ہوتا ہے، بعض جگہ تو ڈبے لیکر سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور جبراً وصول کرتے ہیں، بعض لوگ گھروں دوکانوں پر جاتے ہیں، اور خواہی نہ خواہی چندہ دینے پر مجبور کرتے ہیں اگر کسی نے ان کی مرضی سے کم دیا تو اس کی حیثیت یاد دلا کر شرمسار کرتے ہیں، اور مشخص ومتعین رقم وصول لیتے ہیں، چندہ کی یہ سب صورتیں اسلام میں ناجائز ہیں۔ چنانچہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا ہے: "مومن کا مال اس کی جی کی خوشی کے بغیر حلال نہیں"۔

۹۔عموماً مجمع کے جمع ہونے تک کلام اللہ کی تلاوت یا قرأت کی کیسٹوں کا سلسلہ چلتا ہے جس کی جانب کوئی دھیان نہیں دیتا، پھر جب لوگ جمع ہوتے ہیں تو باقاعدہ جلسے کا آغاز ہوتا ہے گویا کلامِ الٰہی کو وقت گذاری کا ذریعہ بنایا جاتا ہے یہ کس قدر حماقت اور خیانت ہے اور احکم الحاکمین کے کلام کی کتنی بڑی ناقدری اور توہین ہے، جب کہ ارشاد ربانی ہے''جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور چُپ رہو، امید ہے کہ تم پر (اس کی برکت سے) رحم کیا جائے''۔

۱۰۔ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ جلسوں کو عامیانہ شکل دیدینے کے نتیجہ میں ہر طرح کے لوگ جمع ہوجاتے ہیں بعض ادب سے آکے بیٹھتے ہیں تو بعض ہاتھ باندھ کر یا دوستوں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر جلسہ گاہ کے اطراف کھڑے رہتے ہیں، کوئی دور سائیکلوں موٹر سائیکلوں پر ٹانگ پے ٹانگ ڈالے بیٹھے رہتے ہیں، جیسے یہ اپنے نبیؐ کا ذکر مُبارک سُننے نہیں بلکہ کسی شعبدہ باز کا تماشہ دیکھنے آئے ہیں، اور حد یہ ہے کہ اِدھر مقرر کی تقریر ہوتی رہتی ہے اور اُدھر چلنا پھرنا آوازیں اشارے اور آپس کی باتیں پوری بے نیازی سے چلتے رہتے ہیں، حالانکہ ذکرِ رسولؐ کے آداب کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی ہمہ تن گوش اور مست وفدا ہوکر ایک ایک بات غور سے سنے اور عمل کا عزم کرکے سنے۔ افسوس! اب اس قسم کے جلسوں میں بھی اسلامی اجتماعات کا پررونق ماحول اور نورانی منظر ڈھونڈھنے سے دکھائی نہیں دیتا۔

آپ غور فرمایئے کہ ان مبارک جلسوں اور مقدس محفلوں کی روح کو ختم اور تاثیر کو سلب کر لینے کیلئے ان میں سے ایک کوتاہی بھی کافی تھی چہ جائیکہ چند در چند مُنکرات پائی جاویں، بس ہمارے نزدیک یہ اور ان جیسے امور ہی ہیں جنھوں نے ان پروگراموں کو بے جان اور غیر اسلامی اور محض رسم وفیشن بنا کر بے فائدہ بلکہ مُضر بنا دیا ہے، جن کی اصلاح نہایت ضروری ہے، شکوہ بس اسی کا ہے ورنہ ذکرِ

میلادِ محمدیؐ اور تذکرۂ اخلاقِ نبویؐ کی ضرورت و اہمیت کا کون مسلمان انکار کر سکتا ہے؟

آخر میں ہم حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ کی ایک تقریر سے دو اقتباس نقل کرتے ہیں جو مولانا نے "حیدرآباد" ہی میں آج سے اڑتیس سال قبل ایک "جلسۂ سیرت" سے خطاب کرتے ہوئے فرمائی تھی۔

"اس وقت ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ زندگی گذارنے کے بارے میں جو احکام اور تعلیمات ہمارے لئے لائے تھے، جو قرآن و حدیث میں آج بھی جوں کا توں محفوظ ہیں، ان کی پیروی اور پابندی تو ہم نہیں کرتے یعنی آپ کی بات ماننے اور آپ کی ہدایت پر چلنے کے لئے تو ہم تیار نہیں لیکن آپ کے ساتھ جو جذباتی اور اعتقادی تعلق باقی ہے اس کے مظاہرے کے لئے یہ جلسے اور جلوس ہم نے ایجاد کر لئے ہیں۔ اس میں تفریح بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلق کا ایک سستا اور دل خُوش کن مظاہرہ بھی ہے۔ گویا اس وقت ہم مسلمانوں کی پوزیشن یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی محفوظ تعلیم اور اور آپ کی مقدس روح ہم کو پکار رہی ہے کہ اے میرا نام لینے والو! مجھ سے تعلق اور محبت کا دعویٰ کرنے والو! ایمان دار بنو. اللہ کے عبادات گذار بنو، معاملات میں سچّے اور دیانتدار بنو۔ ہر قسم کے فواحش اور منکرات سے بچکر پرہیز گار بنو——اور ہم مسلمانوں کا جواب اپنے طرزِ عمل اور اپنے حال سے یہ ہے کہ حضور! یہ سب تو مشکل ہے۔ ہاں ہم آپ کے یومِ ولادت کا جشن منائیں گے، شاندار جلسے کریں گے، کئی کئی میل لمبے جلوس نکالیں گے اور آپ کے مبارک نام کے زور زور سے نعرے لگائیں گے——میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ میری اس بات سے آپ میں بہت سے بھائیوں کو سخت غصّہ آیا ہوگا۔ لیکن خدا کے لئے سوچئے کہ ہماری موجودہ (بدعملی کی) زندگی کے ساتھ ہمارے یہ جلسے اور مظاہرے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح ایمانی تعلق کی نشانی ہیں یا ان

کے ذریعہ ہم دنیا کو اور خود اپنے نفسوں کو دھوکہ دے رہے ہیں؟"

آگے چل کر مولاناؒ فرماتے ہیں: "بھائیو! میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ پوری صفائی سے یہ بات آپ کے سامنے کہہ دوں کہ اللہ کے نزدیک اور دنیا والوں کے نزدیک بھی اصل چیز عمل اور زندگی ہے۔ اگر عمل نہیں ہے تو ہمارا آپ کا یہ زبانی جمع خرچ، یہ جلسے جلوس، اپنے اندر کوئی قیمت اور کوئی تاثیر وافادیت نہیں رکھتے۔ اور یہ کسی طرح ہماری گنہگارانہ زندگی کا کفارہ نہیں بن سکتے۔ اور یہ خیال بھی سراسر دھوکہ ہے کہ اس طرح ہم دنیا کو رسول اللہ ﷺ کا تعارف کرا رہے ہیں۔ آپ کے صحیح تعارف کی صورت یہ ہے کہ آپ کے "نام لیوا" آپؐ کے طریقہ پر چل کر اور آپ کی تعلیم و ہدایت کے مطابق ایمانداری اور راست بازی، عبادت گذاری اور پاکبازی کی زندگی کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آئیں اور دکھائیں کہ ہمارے ہادی برحق ﷺ ایسی پاک اور حسین زندگی کا پیغام لے کر آئے تھے"۔[1]

اس پوری تفصیل کے بعد گذارش ہے کہ ہمارے ناظرین اختلاف کے نکتہ کو سمجھ کر صرف اس پہلو سے غور فرمائیں تاکہ آپ خود بھی کسی نتیجہ پر پہونچ سکیں۔ راقم السطور کو کوئی بیس سال سے وقتاً فوقتاً مختلف علاقوں اور ماحولوں میں دینی مذاکرات اور جلسوں میں شرکت کا موقع ملتا رہا۔ اور ان منکرات کو جو اوپر مذکور ہوئیں دیکھ دیکھ کر دل کڑھتا رہا اور بڑی تکلیف ہوتی ہے، بحمد اللہ تعالیٰ اُن مواقع پر بھی بقدرِ ضرورت نکیر کی توفیق ہو جاتی ہے، اسوقت جی چاہا کہ ان امور کی طرف قارئینِ اشرف العلوم کی توجہ بھی مبذول کرائی جائے، تاکہ ان باتوں کے منکرات ہونے سے جن بھائیوں کو اتفاق ہو وہ حتی المقدور اصلاح وازالہ کی سعی فرماویں۔ خدا شاہد ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں۔

ان ارید الا اصلاح مااستطعت وما توفیقی الاباللّٰہ

[1] منتخب تقریریں: ص: ۱۲/۱۳

# فحش لٹریچر کے اثرات بد

**یہ مضمون سعودی عرب کے مشہور عالم الشیخ محمد بن صالح حفظہ اللہ کے ایک خطبہ جمعہ کا اقتباس وترجمہ ہے، شیخ کا یہ خطبہ اس وقت کا ہے جبکہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا شیوع نہیں ہوا تھا۔ بعد میں انٹرنیٹ اور سائبر کیفیز نے جو اخلاقی وتہذیبی قیامت برپا کی ہے اس کے بیان سے قلم عاجز اور زبان قاصر ہے، اور یہ سلسلہ روز افزوں ہے۔ فالی اللہ المشتکی**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الانبیاء

وافضل المرسلین .امابعد

لوگو! اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو! تمام ظاہری و باطنی فتنوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھو۔ ہر اس چیز سے اپنے آپ کو بچاؤ جو تمہیں اس حقیقی مقصد سے غافل کردے جسکے لئے تم پیدا کئے گئے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "میں نے جن اور انس کو محض اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے" ۔عبادت کیا ہے؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ ظاہری و باطنی اقوال واعمال سے متعلق تمام ایسی چیزوں کو عبادت کہا جاتا ہے جو اللہ کی مرضی و پسند کے موافق ہوں۔

ایک شاعر کہتا ہے: بلا شبہ قومیں اسوقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک ان میں اخلاق باقی ہوں اور اخلاق ندارد تو قوم ندارد۔

اس لئے اس زمانے کے اخلاقی فتنوں سے بچو! اس لئے کہ جب یہ قلوب

میں سرایت کر جاتے ہیں تو آدمی کو اللہ کے ذکر اور نمازوں سے غافل کر دیتے ہیں۔ وہ قلوب جو کبھی اللہ کے ذکر اور اس کی خشیت سے معمور رہتے تھے یہ فتنے انھیں سخت اور متکبر بنا دیتے ہیں اور دلوں میں پیوست ہوکر پورے جسم میں زہر کی طرح پھیل جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ جب زہر کسی کے جسم میں پھیل جاتا ہے تو اس کی جان لے کر ہی چھوڑتا ہے۔

لوگو! (تمام ظاہری و باطنی) فتنوں سے بچو! ان کے اسباب و وسائل سے بچو! کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ میں مومن ہوں، میں پختہ کار ہوں، مجھ پر ان اسباب فتن کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ ایسا ہرگز نہ سمجھے ورنہ اسی دھوکہ میں رہ جاؤ گے اور ان سے قریب تر ہو جاؤ گے۔ کیونکہ ابلیس اپنا مشن چالو رکھا ہوا ہے اور شیطان آدمی کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہا ہے. جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے دجال کے فتنہ سے ڈرتے رہنے اور اس سے اپنے کو بچاتے رہنے کا حکم فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

**من سمع من فتنة الدجال فلينأ منه فوا لله ان الرجل لياتيه وهو يحسب انه مومن فيتبعه مما يبعث به من الشبهات**[1]

"جو شخص دجال (کے خروج اور اس کے) فتنہ کے بارے میں سنے تو اس کو چاہیے کہ اپنے آپ کو اس سے دور رکھے، اللہ کی قسم! آدمی اس کے پاس اس حال میں آئیں گے کہ اپنے آپ کو مومن سمجھتے ہوں گے مگر (وہاں پہنچ کر) اس کے پیدا کیے ہوئے شکوک و شبہات کے شکار ہو کر ایمان سے نکل جائیں گے۔

ائے مسلمانو! اے اللہ و رسول پر ایمان لانے والو! (غور کرو!) اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ فتنوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی ہم کو ہدایت و تعلیم یہ ہے کہ ہم اپنے کو ان سے بہت دُور رکھیں باوجود یہ کہ ہمیں ان سے بچ نکلنے اور محفوظ

[1] مسند احمد وابوداؤد ومستدرک حاکم

رہنے کا یقین بھی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی آدمی فتنوں کے مقابلہ میں اپنے نفس کی عصمت وحفاظت کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا اور اگر اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد نہ ہوتو ان کے شرور و مضرات سے مامون بھی نہیں رہ سکتا۔

بھائیو! ہم ایک ایسے دور سے گذر رہے ہیں جس میں فتنوں اور گمراہیوں کے وسائل بکثرت پھیل گئے ہیں اور ان کے ذرائع عام ہوتے جارہے ہیں اور اس کی طرف طرح طرح سے دعوتیں دی جارہی ہیں۔ گویا ہر جہت اور ہر سمت سے فتنوں کے دروازے کھل گئے ہیں۔ مثلاً ہمارے لئے دولت وعشرتِ دنیا کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں اور لوگ ایک دوسرے پر سبقت اور فوقیت حاصل کرنے کے شوق میں احکامِ خدا اور رسول سے غافل ہو گئے اس طرح ہم دینی و مذہبی ہی نہیں بلکہ ہر اعتبار سے دن بدن ہلاک ہوتے جارہے ہیں! اسی طرح لوگوں کے دلوں میں اسلام واحکام سے متعلق نئے نئے شبہات وشکوک پیدا ہوتے جارہے ہیں اور ان شکوک وشبہات نے انہیں دینی بے راہ روی میں مبتلاء کردیا ہے۔ اسی طرح غیر محقق اور غیر ذمہ دارانہ لٹریچر اور فتاویٰ کی کثرت بھی اس زمانے میں بہت ہوگئی ہے۔ جس کے نتیجہ میں عوام الناس احکام اسلام اور اس کی معقولیت اور صداقت کے سلسلہ میں تذبذب اور بے اطمینانی کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ اور بے ہودہ مضامین، عریاں تصاویر اور آزادافکار پر مشتمل ان ماہناموں اور رسالوں نے تو قیامت ہی برپا کردی ہے۔ یہ فحش وعریاں رسائل فسق وفجور اور کھلی گمراہی کے داعی اور علمبردار ہیں۔ یاد رکھئے! یہ ایک ایسا زمانہ ہے جس میں عوام کو فکری اور جسمانی اعتبار سے فارغ البالی وسیری میسر ہے اور قوتِ بہیمیہ نے بیشتر لوگوں کی عقل وفہم پر اپنا قبضہ جمالیا ہے، اس بے فکری کے نتیجہ میں وہ اس قسم کے لٹریچر کی طرف راغب ہوکر اپنی دنیا ودین دونوں ہی تباہ کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سلامتی وعافیت نصیب فرمائے آمین

لوگو! بڑے افسوس، حزن وملال کی بات ہے خصوصاً ہم شہر توحید وایمان کے باسیوں کیلئے نہایت ہی غم والم کا مسئلہ ہے کہ آج ہمارے بچوں، جوانوں، بڑوں، بوڑھوں اور مردوں کے ہاتھوں میں ایسے رسائل وجرائد موجود ہیں جو اپنی کتابت وطباعت اور ظاہری وباطنی کشش کے ذریعہ اپنی جانب مائل کرنے اور (اپنے قارئین کو) بدترین اخلاق واعمال کے دلدل میں پھنسانے والے ہیں۔

میں نے بہت سے ایسے جرائد اور مجلّات کے بارے میں بارہا سنا تھا مگر کبھی دیکھا نہ تھا، لیکن اب بعض دوستوں نے ایسے چند رسائل لاکر مجھے دکھلائے ہیں، میں ان رسائل کا نام اس لئے ذکر نہیں کروں گا کہ لوگ ان ہی کے ساتھ ان مضرات کو مخصوص کر کے بقیہ رسائل کو اچھا سمجھنے لگیں گے۔ البتہ میں ان رسائل وجرائد کی صفات وکیفیات کا ذکر ضرور کروں گا۔ یہ وہ رسائل ہیں جو بے حیائی کی باتوں، انسانیت سے گری ہوئی حرکتوں اور غیر شریفانہ عادتوں کو (معاشرہ میں) پھیلا رہے ہیں۔ میں تو اپنے قیمتی وقت کا ایک لمحہ بھی ان رسائل کو دیکھنے میں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا مگر بعض مخلص اور نیک لوگوں نے میرے پاس ایسے بعض رسائل بھیجے اور انھوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں سرسری اور عبوری ہی صحیح ایک نظر اس میں ڈال کر اس کے بارے میں واضح کروں۔ (کہ شرعاً) اس کا حکم کیا ہے؟ اس لئے کہ بغیر اس کے جانے ہوئے اس کے شر سے بچنا اور اس کے بارے میں (شرعی) فیصلہ وحکم کا صادر کرنا مشکل تھا۔

جب میں نے ایک نظر ان رسائل پر اور ان کے مضامین پر ڈالی تو اللہ کی قسم! میں نے ان رسائل کو ایسا مخربِ اخلاق ومفسدِ معاشرہ پایا جس میں کسی صاحبِ عقل کو شبہ نہیں ہوسکتا. میں نے ان کے مناظر اس سے زیادہ برے پائے، جتنا اس کے بارے میں لوگوں سے سن رکھا تھا اور ایسی باتیں اس میں پائیں جن کو اخلاق

مند اور دیندار آدمی سننا بھی پسند نہیں کریگا۔

میں نے اس کے ٹائٹل پر اور اس کے اندر بھی عورتوں کی ایسی تصویریں دیکھیں جو فتنہ میں ڈالنے والی اور شرم وحیا کو مٹانے والی ہیں۔حتیٰ کہ ایسی برہنہ اور پرادا کہ نامرد میں بھی حرکت وشہوت پیدا کردیں۔ان میں ایسی باتیں اور مضامین ہوتے ہیں جو گانے بجانے، میوزک فحش اور حرام حرکتوں کی طرف مائل کرتے ہیں، ان میں سگریٹ کے پاکٹس کی تصاویر اسکے استعمال کی ترغیب کے ساتھ جگہ جگہ پائی جاتی ہیں اور بھی ناجائز چیزوں کے اشتہارات ہوتے ہیں،اسی طرح بہت سے فواحش ومنکرات ہیں، جن کا ذکر اور تعارف کراکے انکی طرف دعوت دی جاتی ہے۔

لوگو! میں یا میری طرح جو بھی اصلاحِ امت کا آرزومند ہے وہ کیا کہے؟ کس سے کہے؟ کس طرح کہے؟ جہاں تک حکمرانوں کا تعلق ہے تو انھیں اس ممبر سے خطاب کرنا نامعقول وغیر موزوں معلوم ہوتا ہے اور شرعاً بھی مناسب نہیں ہے،اس لئے کہ انھیں اس طرح مخاطب کرنا بےسود و بے فائدہ ہے ،اور نبی ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ" **من حسن اسلام المرء ترکه مالایعنیه**"[1] مسلمان آدمی کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی کو ترک کردے۔

اور یہ بھی ارشادِ گرامی ہے کہ "**من کان یومن باللّٰه والیوم الآخر فلیقل خیراًاو لیصمت**"[2] اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والے کو چاہیے کہ کوئی خیر کی بات ہوتو کرے ورنہ خاموش رہے۔ممبر سے حکمرانوں کو خطاب کرنا نفع کے اعتبار سے جب بے محل اور فضول ہے،اور فضول کا ترک لازم ہے تو میں ان سے تو اس وقت کچھ نہ کہوں گا۔البتہ میں ان جرائد ورسائل کے ایڈیٹرز سے کچھ کہنا چاہوں گا۔اگر چہ وہ میرے سامنے نہیں ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری بات کو ان تک پہونچا دے،اور انھیں توفیقِ عمل دے، میں ان رسائل اور

[1] ترمذی، [2] بخاری

جرائد کے نکالنے والوں سے کہتا ہوں کہ جس دن آپ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے تو آپ سے معاشرہ کی اس تباہی و بربادی کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اور آپ اس کے سامنے جوابدہ رہیں گے اور وہ ایسا دن ہوگا جس میں قلبِ سلیم کے علاوہ اور کوئی چیز کام نہ دے گی نہ مال نہ اولاد! اور قلبِ سلیم کی تعریف علامہ ابنِ قیمؒ نے اس طرح کی ہے کہ وہ ایسے دل کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کے خلاف پڑنے والی خواہشات اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے ٹکرانے والے شبہات سے محفوظ ہو۔

آپ لوگ جو اس قسم کے لٹریچر کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار ہیں ان تمام نتائج وعواقب کے بارے میں عند اللہ جوابدہ ہیں۔ اسلئے کہ آپ لوگوں کی وجہ سے سوسائٹی انسانیت کے بلند مقام سے گر کر بہیمیت کی سطح اسفل پر آ چکی ہے۔ سوسائٹی جب بہیمیت کی سطحِ اسفل پر اتر آتی ہے تو اس کے لئے حق کا احقاق اور باطل کا ابطال، اور بندوں کی اطاعت وفرمانبرداری سے نکل کر احکامِ الٰہی و پیغامِ خداوندی کی پابجائی مشکل ہو جاتی ہے۔

اب چاہے یہ میری باتیں اور میرا یہ دردمندانہ پیغام نہ حاکموں کو پہونچ سکے اور نہ مدیرانِ جرائد کو پہونچ سکے، مگر آپ برادرانِ اسلام تو میرے سامنے ہیں ہی، میں آپ لوگوں کو آپ کی صفتِ ایمان، صفتِ شرافت، صفتِ غیرت کو آواز دیتے ہوئے اس بات کی دعوت دینا چاہتا ہوں کہ اپنے دین وایمان کی حفاظت کریں اور تمام ظاہری و باطنی فتنوں سے اپنے آپ کو بچائیں۔ اور اس بات سے ڈراتا ہوں کہ کہیں ایسے رسائل و جرائد جو ہیجان انگیز تصاویر، گمراہ کن تقاریر، اور بے دینی کی دعوتوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ آپ کے گھروں تک پہونچ کر آپ کی اور آپ کے اہل وعیال کی دینی واخلاقی ہلاکت کا سبب نہ بنجائیں۔

مسلمانو! ان رسائل کا گھروں میں موجود ہونا ملائکۃ کے داخل ہونے میں رکاوٹ کا سبب ہے۔ اسلئے کہ فرشتے ایسے گھروں میں نہیں داخل ہوتے جن میں تصویریں ہوں[۱] اور جس گھر میں فرشتے نہ داخل ہوں اسمیں کوئی خیر و برکت نہیں ہوتی۔ یہ تو اس کے برے اثرات کی بات تھی اور شرعی حکم کا جہاں تک تعلق ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس قسم کے رسائل کا اشاعت کرنا حرام ہے اس کا بیچنا اور خریدنا حرام ہے، اس کی کمائی حرام ہے، یہاں تک کہ اس کا ہدیہ دینا اور لینا بھی حرام ہے۔ اسی طرح ہر وہ کام جوان رسائل کے مسلم معاشرہ میں پھیلانے کی مذموم سازش میں تعاون کا سبب بنے وہ بھی ناجائز وحرام ہے۔ اسلئے کہ وہ سب کام "ظلم وعدوان" یعنی برائیوں کے پھیلنے میں تعاون کہلائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے صاف ارشادفرمادیا ہے: **تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ** نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کرو اور برائی اور گناہ کے کام میں تعاون نہ کرو۔

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو۔ اور دیکھو! اب اس تفصیل ووضاحت کے سامنے آجانے کے بعد کسی کے پاس اس قسم کا کوئی رسالہ نہ رہے اور اگر پہلے سے ہے تو انھیں جلاڈالو۔ اور یاد رکھو! جب کوئی بات کسی کو پہونچ جاتی ہے اور اسے اس بارے میں شرع کا حکم معلوم ہوجاتا ہے تو پھر اس پر حجت قائم ہوجاتی ہے۔ آپ پر حجت قائم ہوگئی اور حکم ان رسائل کا پہونچ گیا۔ اسلئے انھیں جلاڈالیے اور تلف کردیجئے اور اپنے بچوں، بچیوں اور گھر والوں کے ہاتھوں تک بھی انھیں نہ پہونچنے دیجئے۔ اور طئے کر لیجئے کہ آئندہ اس قسم کے رسائل یا کوئی بھی مخربِ اخلاق وایمان شئی خریدنے میں اپنا پیسہ صرف کرنے سے بچیں گے کیونکہ ایسا کرنے میں بہت سے مفاسد اور نقصانات ہیں۔ مثلاً

(۱) اضاعتِ مال: حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مال کو لوگوں کے مصالح وحاجات کی

---
[۱] بخاری ومسلم

تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے (نہ کہ مضرات ونقصانات کی تحصیل کا) اس مال کے ذریعہ ہی سے دینی ودنیوی مصالح تکمیل پاتی ہیں۔ اوراضاعت مال کا مطلب یہ ہے کہ اسے ایسی جگہ خرچ کیا جائے جس میں نفع نہ ہو یا یہ کہ اس میں ضرر ہو، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اضاعتِ مال سے امت کو منع فرمایا ہے۔[1]

(۲) اضاعتِ وقت: وقت تمام عقلاء کے نزدیک مال سے بھی زیادہ قیمتی سرمایہ ہے، کیونکہ زندگی ہی وقت ہے اور وقت کا ضائع کرنا زندگی کا خسران ہے۔ حالانکہ زندگی کے بارے میں انسان سے قیامت کے دن اسی طرح سوال ہوگا جس طرح کہ مال کے بارے میں سوال ہوگا۔ اسی لئے اگر انسان اپنی زندگی کو ایسی چیزوں کے پڑھنے میں صَرف کرے جس میں اس کا نفع ہے جیسے قرآن مجید اور احادیثِ شریفہ اور وہ کتابیں جو قرآن وحدیث کے سمجھنے میں مددگار ہیں مثلاً تفسیر، سیرت الرسولؐ، سیرت خلفاء راشدین، اوراہل اللہ کے احوال وغیرہ تو اس کے ذریعہ سے اس کو خیر کثیر حاصل ہوسکتا ہے۔

(۳) ذہنی انتشار: ایک نقصان یہ ہے کہ آدمی ان تصاویر کے ذریعہ کسی کی محبت میں قلبی بے چینی اور خیالی معاشقہ میں (جسکی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ہے) پھنس جاتا ہے اور اس آدمی کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً ط حَتىَ اِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئاً وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ '' جیسے میدان میں چمکتا ہوا ریت کہ پیاسا آدمی دور سے اسے پانی سمجھے یہاں تک کہ جب اس کے قریب پہونچے تو وہاں کچھ بھی نہ پائے اور اللہ ہی کو اپنے پاس پائے تو وہ اس کا حساب پورا پورا چکا دیگا اور اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔[2]

ان خیالات کے ذریعہ اس کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ قلبی

---

[1] بخاری ومسلم　[2] سورۃ النور:۲۹

کوفت اور ذہنی انتشار کا شکار ہو کر بہت سی دینی و دنیاوی مصالح سے محروم اور بھول ونسیان کا مریض ہو جاتا ہے۔

(۴) ایک نقصان یہ ہے کہ اسکی تصاویر ومضامین لوگوں کے خصوصاً نوجوانوں کے اخلاق وآداب اور عادات پر اتنا بُرا اثر ڈالتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ اسکے اثر کی وجہ سے دھیرے دھیرے اس گندے معاشرہ کے مماثل ہو جاتا ہے جسکی طرف اس میں دعوت دی گئی ہے۔

بس اے مسلمانو! ان رسائل وجرائد کا بائیکاٹ کرو۔ اور اس کے ناشرین کی گناہوں کے پھیلانے میں مذمت کرو۔ کیوں کہ تمہارا ان رسالوں کا خریدنا ان کی مالی تقویت، اور اس کی اشاعت میں مزید جرأت کا سبب ہے۔ اس لئے ان کے ممبرس خریدار اور ایجنٹس سب گناہ وزیادتی پر مدد کرنے کے مجرم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو بار بار یاد کرتے اور اس میں غور کرتے رہو!

**"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَاراً وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَیْهَا مَلآئِكَةٌ غِلاَظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ"**[1]

"اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ! جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہونگے۔ اس پر تندخو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہرگز نہیں کرتے اور جس کام کا حکم دیا جاتا ہے کر گزرتے ہیں"

مسلمانو! تم پر لازم ہے، اور مکرر کہتا ہوں کہ تم پر لازم ہے کہ ان رسائل وجرائد کا مکمل بائیکاٹ کردو۔ اور جو موجود ہیں (انھیں جلا ڈالو، تا کہ تم اس کی بُرائی سے محفوظ رہ سکو۔ **"فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ اَجْمَعِیْنَ"**[2]

اے اللہ! ہم کو اچھے اخلاق اچھے اعمال کی توفیق دیجئے اور اس کی توفیق کوئی

---
[1] سورہ تحریم:۶　[2] سورہ انعام:۱۵۰

نہیں دے سکتا سوائے آپ کے ،اور بُرے اعمال اور بُرے اخلاق سے ہماری حفاظت فرمایئے اور اس سے کوئی محفوظ نہیں رکھ سکتا سوائے آپ کے ۔اے تمام جہانوں کے پروردگار! فساد برپا کرنے والوں کی کمر توڑ دے اور فاسقوں کی اور دین سے پھر جانے والوں کی سازشوں کو ناکام بنادے ۔اے اللہ! انہیں خائب وخاسر فرما۔اے اللہ! انھیں ذلیل ورسوا کردے ۔اے اللہ! انہیں مالی خسارہ میں مبتلاءفرما یہاں تک کہ وہ اپنے اعمال سے توبہ کرلیں اور آپ کے دین اور امت کی اصلاح کی طرف لوٹ آویں ۔اے اللہ! ان پر ہمارے ایسے حکمرانوں کو مسلط فرما جو انھیں ان مفسدانہ حرکات سے باز رکھیں جو پوری اُمت میں اخلاقی انحطاط کا سبب بن رہی ہیں ۔ بیشک آپ ہر چیز پر قادر ہیں ۔

# عراق جل رہا ہے!

## نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

برادرانِ اسلام! آج اس میدان میں ہم سب اپنے عراقی مسلم بھائی، بہنوں، بوڑھوں، بچوں اور معصوموں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی اور عالمی صیہونی وصلیبی سنگ دل وسفاک، خودغرض وجلاد امریکی وبرطانوی جنگجوؤں کے تئیں نفرت وناپسندیدگی کے اپنے دلی جذبات وذہنی احساسات پیش کرنے کے لئے جمع ہیں۔

پوری دنیائے انسانیت کی مخالفت کونظرانداز کرتے ہوئے پوری بے حیائی اور انتہائی بے غیرتی کے ساتھ عراقی تیل کے چشموں پر رال ٹپکانے والی ان دو بڑی طاقتوں کی جانب سے دس سال تک اقوامِ متحدہ کی ظالمانہ تحدیدات سے متاثر ہلاکت وافلاس زدہ عراقی مسلمانوں کے جان ومال کو جس طرح پامال کیا جارہا ہے، اس کے بیان کرنے اور سننے کا یارا تو کیا ہوسکتا ہے تصور سے بھی ہر اُس شخص کا کلیجہ منہ کو آتا ہے جس کے سینے میں دل ہے۔

بلاشبہ "بش" اور "بلیر" کی یہ خطرناک ومنحوس جوڑی توسیع پسندی اور مفت خوری کے اپنے حقیر جذبات کے تحت پوری دنیا کی انسانیت کے لئے خونخوار درندوں کی شکل اختیار کرگئی ہے، اور انسانی تاریخ کے پیش رو جابر طاقتوں کے ظلم واستبداد کا ریکارڈ توڑ رہی ہے۔ ان کو نہ دنیا کی "تھوتھو" کی پرواہ ہے نہ انسانیت کی "ہائے ہائے" کا کچھ احساس ہے، وہ "بے حیا باش ہر چہ خواہی کن" کے مصداق ہوگئے ہیں۔ انھیں صدام حسین کے جرائم تو دکھائی دیتے ہیں، اپنے مظالم نظر نہیں آتے، انھیں

عراق کی سرزمین پر چند اُچھلتے،کودتے من چلے نوجوان تو دکھائی دیتے ہیں،مگر تڑپتی لاشیں، اُجڑتی مانگیں، سسکتے بچے، اُبلتے آنسو اور دہکتی بستیاں نظر نہیں آرہی ہیں۔ اپنی فوجوں کی اندھا دھند بمباری اور فضاء میں مزائلوں سے لیس اپنے طیاروں کا دیوانہ وار رقص،عراقی محلات پر قبضہ اور عراقی لیڈروں کی شخصی وقومی املاک کی لوٹ مار کی خبریں ان کے دلوں میں مسرت کی لہریں دوڑا رہی ہیں مگر زخمیوں کی کراہیں، اور معذوروں کی آہیں،اور معصوموں کی بددعائیں ان کے کانوں سے نیچے نہیں اُتر پارہی ہے۔عربی کا مقولہ ہے ''**حبک الشئی یعمی ویصم**'' کسی چیز کی دیوانگی آدمی کو اندھا اور بہرہ بنادیتی ہے۔

برادرانِ اسلام! عراقی طاقت کے اضمحلال،عراقی حکومت کے زوال اور عراقی تیل کے چشموں پر قبضہ کے بعد اپنی فتح کے نشہ میں چور اور اخلاق واقدار سے نفور''یورپی جنگل کے یہ خونخوار درندے'' ہمیں نہیں معلوم کہ اب کس طرف پلٹنے اور کس ملک کا خون چوسنے والے ہیں۔عربوں کی تو لٹیا ڈوب گئی اور اب وہ اپنے آپ کو جیسا کہ خبروں سے ظاہر ہورہا ہے، بےبس ولاچار، بےکس وحیران محسوس کررہے ہیں۔عراق لٹ رہا ہے،عراقی، بدامنی وخانہ جنگی کی طرف جارہے ہیں، اور مابعد جنگ عراق میں امن وآشتی اور تعمیرِ نو کے دعویدار تیل کے چشموں پر کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں،اور زبانِ حال سے اعلان کررہے ہیں''ہمارا مقصد ہمیں مل گیا'' اب عراق آباد ہوتا ہے یا برباد ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

برادرانِ اسلام! آپ مکرودجل،فریب وفراڈ،کی اسی ایک تازہ مثال سے یورپ کی خودغرض،مکار اور یکطرفہ خارجہ پالیسیوں کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

بہرحال جو ہونا تھا سو ہوچکا اور جو کچھ ہوا کتبِ حدیث کے''ابواب الفتن'' اور علاماتِ قیامت پر کچھ نظر رکھنے والوں کے لئے نہ حیرت انگیز ہے نہ خلافِ توقع۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اس سلسلہ میں ظالم ومظلوم کے علاقوں کی نشاندہی اور جنگی حکمتِ عملی کے سلسلہ میں نتائج کی تعیین کے ساتھ اپنے حینِ حیات ہی صاف اشارے امت کو دے دیئے ہیں، جواحادیثِ صحیحہ میں محفوظ و موجود ہیں، مسلمان اگرچہ اس سے بے خبر ہیں مگر یہودی ونصرانی یونیورسٹیز اور ریسرچ سنٹرز میں ان کی تحقیق اوران کی روشنی میں اپنے مستقبل کے منصوبہ سازی کا کام برابر جاری ہے۔

امام نوویؒ نے "صحیح مسلم" کی شرح میں ان احادیث پر تبصرہ کرتے ہوئے سچ فرمایا ہے کہ اس سلسلہ کی ایک ایک خبر جوعلی الترتیب رونما ہوتی جارہی ہے آپ کی نبوت کا کھلا معجزہ ہے۔

برادرانِ اسلام ! حالات سے مایوس ہونے، حوصلہ توڑ لینے اور تدبیر چھوڑ دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مومن کا معاملہ عجیب ہے وہ مصیبت وراحت ہر حال میں کامیاب ہے، شکست وہزیمت اس کے پائے استقلال کو اکھاڑ سکتی ہے نہ فتح وغلبہ اس کے کام وکاز کو روک سکتے ہیں۔ "کام کرنا ہی کامیابی ہے" سمجھنے والی قوم ہر حال میں انشاءاللہ کام میں لگی رہے گی اور ایک دن انشاءاللہ نصرتِ الٰہی آئے گی، اورضرور آئیگی۔ لاتھنوا ولا تحزنوا

البتہ اس موقعہ پر قرآن کریم (جو ہدایتِ انسانی کا عظیم آسمانی تحفہ ہے) کی ایک آیت کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں. جس میں اللہ تعالیٰ علیم وخبیر نے منافقین کی ایک بہت بُری عادت پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے: اَفَلاَ یَرَوْنَ فِیْ کُلِّ عَامٍ مَّرَّۃً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لاَ یَتُوْبُوْنَ وَلاَ ھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ "کیا وہ لوگ نہیں دیکھتے کہ وہ لوگ سال میں ایک یا دو دفعہ (ہوش ربا) آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں (مگران کی بے حسی کا حال یہ ہے کہ)

نہ ہی اپنی سابقہ حرکات سے توبہ کرتے ہیں اور نہ آئندہ کے لئے کوئی عبرت و نصیحت حاصل کرتے ہیں۔"

اس آیتِ شریفہ معلوم ہوا کہ اس کارخانۂ عالم میں پیش آمدہ حوادث و مصائب کے پیچھے بھی یہ تکوینی مصلحت کارفرما ہوتی ہے کہ ان سے گھبرا کر غفلت کی ماری قومیں بیدار ہوجائیں اور بے حسی کے متوالے ہوش وخرد سے کام لیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہدایت کی ناقدری سے توبہ کرکے آئندہ دین وایمان کی قدردانی اور ہدایت کے تحفظ واشاعت، اختیار وابلاغ کا عہد کرلیں، تازہ دم ہوکر اپنی ڈیوٹی پر چڑھ جائیں اور اُس وقت تک مطمئن نہ ہوں جب تک خدا کا دین ہر کچے، پکے مکان داخل نہ ہوجائے یعنی یہ انقلابات اور عالمی تغیرات میں خود ہمارے لئے یہ سامانِ عبرت وموعظت موجود ہے کہ ہم خود احتسابی کا فریضہ ادا کریں، اور دیکھیں کہ پس پردہ خود ہماری بدعملی، بےفکری اور خدافراموشی کے اسباب کارفرما تو نہیں ہیں؟ کیا ہمیں بھی کچھ سنبھلنے اور بدلنے کی ضرورت ہے؟ کیونکہ ؎

انقلاباتِ جہاں واعظِ رب ہیں دیکھ !
ہر تغیر سے آتی ہے صدا فافھم فافھم !

پس جب ہم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں سمجھ میں آتا ہے کہ آج ہم مسلمانوں کی اکثریت تحفظ ودعوتِ دین "امرالمعروف ونہی عن المنکر" کے فریضہ کو بھول کر راحت وآرام، خوش عیشی بلکہ لہو ولعب کی خوگر ودلدادہ ہوگئی ہے۔ جبکہ یہ زندہ اقوام کی حالت نہیں ہوتی۔ یہ امت جب بھی اتباعِ حق اور فریضۂ دعوت سے غافل ہوتی ہے۔ انہی حالات کا شکار ہوتی ہے اسلئے مسلمانانِ عراق سے ہمدردی، اور ظالمانِ امریکہ واسرائیل پر غم وغصہ کے اظہار پر اکتفاء ہرگز کافی نہیں ہے، خود اپنی بدعملی اور بڑھتی ہوئی دین بیزاری کا جائزہ اور اس کے ازالہ کی فکر بھی از حد

ضروری ہے اور امت میں بالخصوص اس کے نوجوانوں میں جہد ومحنت، ذوقِ عبادت، علومِ عصریہ اور فنونِ حربیہ میں مہارت، خدمتِ خلق میں سبقت، اخلاق واطوار میں اتباعِ سنت اور ان سب کے ساتھ اخلاص وللٰہیت کی اہمیت کو اجاگر کرنے اور پیدا کرنے کی کوشش کرنا حالات کا اہم تقاضہ ہے۔

یہ مصرعہ کاش نقش ہر در و دیوار ہوجائے
جسے جینا ہے وہ مرنے کے لئے تیار ہوجائے

اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو اور ہمارے حکمرانوں کو توفیقِ ہدایت کی صحیح معنوں میں قدر کرنے اور خوش آئند اور اُمید افزاء قدم اُٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور سارے عالم کے مظلوم انسانوں کی حمایت وحفاظت کا انتظام فرمائے۔ (آمین)

**وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین**

# اسراف واقتصاد

ہمارے معاشرہ میں شادی بیاہ کا مسئلہ سب سے زیادہ بھیانک صورت اختیار کر گیا ہے، اسلام کی تعلیمات میں سہولت وآرام، وقار تمام، اور نفع عام کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے، اس قدر جامع ومانع اور سہل احکام دئے گئے ہیں کہ کسی علاقہ، کسی زمانہ اور کسی مذہب میں تو کجا خود سابقہ آسمانی احکام میں بھی ان کی مثال نہیں مل سکتی ،اسی وجہ سے کسی مسلمان کو اس کے کسی حکم سے مفر نہیں ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان احکامات کی پابجائی اور عمل آوری میں آخرت کا نفع تو ہے ہی دنیا میں بھی کامیابی کا اس سے زیادہ بہتر ونافع کوئی دوسرا دستور العمل نہیں ہے۔

شادی بیاہ اور دیگر مواقع پر مالی مصارف کے سلسلہ میں اسلام نے کفایت شعاری اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے، قرآن کریم میں کھانے پینے ہی کے سلسلہ میں ایک جگہ فرمایا ہے ”كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا “ کھاؤ پیو، مگر فضول خرچی مت کرو۔ اسی طرح رشتہ داروں، غریبوں اور مسافروں کی خدمت کرنے ان کے حقوق ادا کرنے کا حکم دینے کے بعد فرمایا”وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْراً اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ “اور دیکھو تبذیر سے بچتے رہو! اس لئے کہ جو لوگ (اپنی دولت) بے موقع یا موقع پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہیں، وہ شیطان کے بھائی ہیں، اور (معلوم ہونا چاہیے کہ) شیطان اپنے رب کا ناشکرا ونافرمان ہے۔ اپنے نیک بندوں کے تذکرہ میں فرمایا”وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذَالِكَ قَوَاماً “ اور رحمٰن کے خاص بندے جب خرچ

کرتے ہیں تو نہ ہی اسراف کرتے ہیں نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان اقتصاد واعتدال کی راہ پر قائم رہتے ہیں ۔ یہ اور اس جیسی بہت سی آیات ہیں جو مال کو سوچ سمجھ کر ضرورت کے بقدر خرچ کرنے کی رہبری کرتی ہیں ، کیونکہ مال اللہ کی امانت ہے اس کے استعمال میں اللہ کی مرضی کا لحاظ از حد ضروری ہے ، پھر یہ کہ جو کچھ ہم خرچ کرتے ہیں ایسا نہیں کہ اس کا کوئی حساب لینے والا نہیں ہے ، کیونکہ خود قرآن مجید میں ارشاد ہے ”**ثُمَّ لَتُسْـئَلُنَّ يَوْمَئِذٍعَنِ النَّعِيْمِ**“ پھر تم لوگ اس دن نعمتوں کے بارے میں ضرور پوچھے جاؤ گے ۔ اور وہ حدیث بہت مشہور ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ پانچ سوالات سے قبل حشر کے میدان سے بنی آدم کے قدم ہٹ نہیں سکتے ، ان پانچ میں دو سوال مال ہی سے متعلق ہیں ۔ ”**عن مالہ من این اکتسبہ وفی ما انفقہ**“ کہاں سے کمایا اور کہاں صرف کیا ؟

یہ ساری تعلیمات اسی وجہ سے دی گئی ہیں کہ بندے خصوصاً ایمان والے بندے اپنے مصارف میں اعتدال واقتصاد یعنی میانہ روی وکفایت شعاری کو اختیار کر کے معاشی بحران سے محفوظ رہیں ، آج عالمی سطح پر جو معاشی بحران چل رہا ہے اور دنیا قرض کے بوجھ تلے دبی جارہی ہے ، گرانی ومہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے ، زندگی گذارنا عام لوگوں کے لئے مشکل ہوتا جارہا ہے ، ان سب کا واحد سبب **الاسراف فی النفقۃ** کا رواج ہے ، ہمارے ہندوستانی مسلمانوں کو بھی اس مسئلہ پر بہت غور کرنے کی ضرورت ہے ، حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہر شخص اپنی آمدنی وخرچ میں خود مختار ہے اس میں دوسرے کا کوئی دخل نہیں ہے ، اگر ہم اپنی اپنی حد تک بھی ان ہدایات پر عمل پیرا ہو جائیں تو ہمارے سماج میں بڑی خوشگوار تبدیلی آسکتی ہے اور معیشت درست ہو سکتی ہے ، روایات میں آتا ہے ” **الاقتصاد فی النفقۃ نصف المعیشۃ** “ خرچ میں میانہ روی اختیار کرنا آدھی آمدنی ہے ۔ برخلاف اس

کے ہمارے معاشرہ کی اس وقت جوصورتحال ہے وہ افراط وتفریط کی شکار ہے کتنے ہی مسلمان ہیں جو آج کے دورِ ترقی وتمول میں بھی نان جویں کے محتاج اور حالات وحوادث کے شکار ہیں اور دوسری طرف کتنے مسلمان ہیں جن کے شاہانہ ٹھاٹ باٹ شاہ خرچیاں اور حماقت کی حدتک اسراف وتبذیر روز روز کا مشغلہ بن گیا ہے، دوایک روز قبل ہی ایک معتبر دوست سے معلوم ہوا کہ ان کے پڑوس میں ایک لڑکی کو شادی کے دن پینسٹھ ہزار روپیہ کا جوڑا پہنایا گیا، کپڑوں کے ایک جوڑے کی یہ قیمت ہے تو اس سے بقیہ اخراجات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ایک دوست اپنے ایک دوست کی شادی میں پہنانے کیلئے دیڑھ کنٹل کا ہار جسے چار چار آدمی بمشکل اٹھا پارہے تھے بارات کی شکل میں لے کر آیا، جسے تھوڑی ہی دیر کے بعد سڑک کے کنارے پھینک دیا گیا، ایک ہفتہ قبل ایک صاحب نے اپنی بچی کے خِطبہ یعنی منگنی کے روز نوے ہزار روپیہ کی دعوت کی، اب شادی میں کیا کچھ کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ایک وکیل صاحب کے دولڑکوں کے نکاح میں صرف شادی خانے کی سجاوٹ کا خرچ (جو ایک رات کے لئے کیا گیا تھا) دولاکھ سے متجاوز ہوگیا، ایک تاجر نے چند دنوں قبل مجھ سے بتلایا کہ انکی مارکیٹ میں ایک اور تاجر نے اپنے نکاح کے جو دعوت نامے طبع کرائے تو فی رقعہ ۲۵ر روپیہ ہوئے، اور کم ازکم ایک ہزار رقعہ تو تقسیم کئے ہوں گے۔ یہ چند مثالیں ہیں جو اسی ہفتہ کے دوران مختلف لوگوں سے معتبر طور پر سننے میں آئیں، ورنہ کوئی آدمی کسی شب باہر نکل کر شہر میں رچنے والی تقریبات کا ایک سرسری اندازہ بھی کرلے تو روزانہ محض ”مسرفانہ رسوم اوراحمقانہ فضول خرچیوں“ میں کروڑوں روپیہ بہتا ہوا نظر آئے گا، جب کہ اس کے نتیجہ میں مسلمان ایک طرف خدا کی نظر سے گر کر شیطان کے بھائی بن رہے ہیں تو دوسری طرف حاسدابنائے وطن اور حکمرانوں کی نظر میں کھٹک کر معیشت وروزگار کی تباہی کا نشانہ بن رہے ہیں،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا "**ان من الاسراف ان تاکل کلما اشتھیت**" یہ بھی اسراف میں ہیکہ جو جی چاہے فوراً کھالے۔ نیز فرمایا "**من فقه الرجل رفقه فی معیشته**" آدمی کی سوجھ بوجھ اور پختگی عقل کی علامت یہ ہیکہ وہ خرچ میں میانہ روی اور اعتدال کی راہ کو اختیار کرے۔

غرض یہ اس زمانہ کا اہم ترین مسئلہ ہے جس پر مسلمانوں کو علی الفور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

# سادگی اپنوں کی دیکھ!

تہذیب وتمدن کے معاملہ میں ہر دور میں قوموں کے درمیان اپنا اپنا امتیاز رہاہے، اس سلسلہ میں عالمی آبادی دوعبوری نظریات میں منقسم ہے،ایک مشرقی تہذیب، دوسرے مغربی تہذیب،مشرقی تہذیب شرم وحیاء، نیک نفسی وپاکبازی کی حفاظت میں معروف اور مغربی تہذیب بے حیائی وبے حجابی،آزادی وبے باکی کی عادتوں سے ممتاز سمجھی جاتی ہے۔لیکن گذشتہ صدی میں یورپ سے جوسیلاب امنڈ کے مشرقی ملکوں میں آیا تھا اس نے اس تفریق کومٹا کر سب قوموں کو اپنا ہم نوا وہم ادا بنانے کی جان توڑ کوشش کی،اور حق یہ ہے کہ اس میں دیگر اقوام کی حد تک پورا کامیاب بھی ہوگیا، تاہم اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کا جو اصل نشانہ تھا یعنی ”مسلم قوم“ اس نشانہ کو اپنی زد میں لانے اور اس کے تشخص وامتیاز کو تحلیل کر کے اس کو اپنے کلچر کے تابع کرنے کی سعی میں وہ اگر چہ بہت کچھ اثر دیکھا یا لیکن پوری طرح بامراد نہ ہوسکا۔

باوجود یہ کہ مسلم قوم اب دھیرے دھیرے اپنے بہت سے امتیازات کو کھوتی جا رہی ہے، اور دن بدن معاشرتی ابتری کی شکار ہورہی ہے، پھر بھی وہ اپنی بہت سی تہذیبی خصوصیات وامتیازات کو سختی سے تھامے ہوئے ہے اور اس پر مغربی تہذیب کی ملمع سازی کو غالب ہونے نہیں دیتی، (جس کی تفصیل کے لئے مستقل مضمون درکار ہے۔) اس صورتحال کو دیکھ کر ایک ایسے زمانے میں جبکہ دنیا کی سب قومیں ایک قومی دھارے میں دانستہ یا نادانستہ جس طرح بھی سہی شامل ہوگئی ہیں، صرف ”مسلم قوم“

اس سے پہلو تہی وعلا حدگی کی راہ اختیار کی ہوئی ہے، اس لئے اقوام عالم کا غیض وغضب مسلمانوں پر بے پناہ نازل ہورہا ہے، اورانہیں من حیث القوم مٹانے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کی جارہی ہے، کیونکہ تہذیبوں کا یہ تصادم کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا، بلکہ گلوبلائزشن کے عنوان سے یہودی منصوبہ بندی کا ایک حصہ تھا، جس کے نتیجہ کو حاصل کرنا یعنی دنیا سے تہذیبوں کی رنگارنگی کو مٹا کر صرف اورصرف یہودی تہذیب کو باقی رکھنا انہیں مسلم قوم کی وجہ سے دشوار نظر آرہا ہے، یہ اور بات ہیکہ مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ سپر ڈال چکا ہے لیکن مذہبی تعلیم یافتہ اوران سے متاثر طبقہ ہنوز اپنی ضد پر قائم ہے، بس یہی دوسرا طبقہ اسرائیل وامریکہ کی آنکھوں کا کانٹا اور پاؤں کا پھپولا بنا ہوا ہے۔

چنانچہ ایک طرف دین کا نام لینے اوراس کی اشاعت وحفاظت کا کام کرنے والوں کو پہلے "بنیاد پرست" اور "انتہاء پسند" کا لقب دیکر اوراب دہشت گرد قرار دیکر انہیں معاشرہ کے لئے خطرہ اورامنِ عالم کیلئے ناسور ثابت کرنے کی ناپاک و نامسعود سعی کی جارہی ہے، تو دوسری جانب مذہبی مسلمانوں پر محض ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے زمین تنگ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، تیسری جانب "زن اور زر" کے قدیم جال کے ذریعہ مسلم قوم کو شکار کرنے کا سلسلہ بھی تیزی سے بڑھایا جارہا ہے۔

اور یہ تیسرا حربہ وہ حربہ ہے کہ جس کی زد سے بچ کر نکلنا آسان نہیں ہے۔ اس کے ذریعہ شیطانوں نے خواہ وہ جنات میں سے ہوں یا انسانوں میں سے جس پر وار کیا ہے اسے برباد کرکے چھوڑا ہے۔ بنی نوع انسان میں سب سے پہلا قتل اسی فتنہ کی وجہ سے ہوا۔ بنی اسرائیل کا سب سے پہلا فتنہ یہی حربہ بنا، بڑے بڑے عابدوں وزاہدوں کو اسی فتنہ نے اوج تقوی سے قعر فسق میں گرایا اور آج "یہودیوں

اور صلیبیوں کا گٹھ جوڑ" اسی جال کو جگہ جگہ ڈال کر مسلمانوں کی شکست وذلت کا سامان کرتا جارہا ہے۔

ماضی کی تاریخ کو غور کی نگاہ سے دیکھئے تو بہت سے حقائق سامنے آئینگے۔ سردست آپ یا سر عرفات، عمران خان اور اظہر الدین وغیرہ کے تازہ واقعات ہی پر نظر ڈال لیجئے کہ جن پر یہودی عورتوں کے جال پھینکے جانے کے واقعات جو ابھی کل تک پریس اور میڈیا کی شاہ سرخیاں بنی ہوئی تھیں، اور سوچئے کہ کہیں یہ سب مسلم قوم کے بادشاہوں، مجاہدوں، حکمرانوں اور نوجوانوں یعنی تمام طبقات کو اقوام عالم کے سامنے ناقابل اعتماد، بے بھروسہ، ہوس پرست، اور بدکردار ثابت کرنے کی سوچی سمجھی سازش تو نہیں؟

اگر ہے تو مجھے کہنے دیجئے کہ اس صورت میں یہ صرف شخص واحد کا انفرادی معاملہ نہیں بلکہ پوری قوم کا اجتماعی مسئلہ ہے، اور اس کا حل کسی شخص کی حرکت پر بے سود لفظی تبصرے اور تھوتھو کر کے خاموش بیٹھ رہنا نہیں ہے بلکہ پوری ملت کو بیدار، دشمن کی سازشوں سے ہوشیار اور مقابلہ کے لئے تیار کرنا اس کا حل ہے اور نہایت ضروری ہے۔ اور یہ کام اسی وقت کامیاب اور موثر ہوسکتا ہے جبکہ مسلم جماعتیں باہم نزاع وخلاف کی راہ چھوڑ کر نہایت حلم وتدبر کے ساتھ ٹھوس ومضبوط اور عالمگیر پیمانہ پر انتھک اور مسلسل جد وجہد کیلئے تیار ہوجائیں، تب جا کے ان سازشوں کا سدباب ہوسکے گا، اس کے بغیر یہ تجویز ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

اور اگر ہم کام اور اقدام نہ کر سکے تو آئندہ ان سازشوں کے نتیجہ میں جو کچھ نقصان ہوگا وہ یہودیوں اور صلیبیوں کی عیاری کے بالمقابل ہماری سادگی بلکہ حماقت سمجھا جائیگا۔ اور یہ اپنے آپ پر ایسا ظلم عظیم ہوگا جسکے نتائج بد سے بچنے کی کوئی

شکل نہیں ہوگی، نیز حق تعالیٰ ہماری اس مجرمانہ غفلت کی سخت پکڑ فرمائے گا جس کا تحمل کسی کے بس میں نہیں! اعاذنا اللہ منہ

اللہ پاک ہم میں سے ہر ایک کو ناموس ملت کے بساط بھر تحفظ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

# اسلامی معاشرہ پر مغرب کا اثر

آج کل ہم مسلمانوں کے سماج میں غیر اسلامی بلکہ مغربی تہذیب کے اختلاط کی وجہ سے ملی تشخص و مذہبی امتیاز کا معاملہ دن بہ دن کمزور و بے حیثیت ہوتا جارہا ہے، یعنی معاملات ومعاشرت بالخصوص لباس اور وضع وقطع میں عرف ورواج بلکہ دیگر اقوام کے طورطریقے اسلامی طورطریقوں پر غالب ہوتے جارہے ہیں، اس کے برخلاف نبوی تہذیب اور اسلامک کلچر تہذیبوں کے اس تصادم واختلاط کے نتیجے میں مغلوب بلکہ تہذیبوں کے منظر سے غائب ہوتا جارہا ہے، حد یہ ہے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ تو اسلامی تہذیب کی خوبیوں سے بھی ناواقف و بے خبر ہوگیا ہے، کہیں واقفیت ہے بھی تو اسے از کار رفتہ اور عصر حاضر کے تقاضوں سے میل نہ کھانے والا تصور کیا جارہا ہے، ایک چھوٹی سی جماعت ایسی بھی ہے جو اسلامی تہذیب کے تحفظ اور اس کی ضرورت واہمیت کی بزبان قال معترف ہے مگر بزبان حال وہ بھی یہی کہتی ہے کہ ضروری ہونے کے باوجود اب اس پر عمل مشکل ہے، یا دین کے دوسرے امور کے مقابلہ میں یہ دوسرے نمبر کی چیز ہے، بلکہ ان میں سے بعض کا تو خیال یہ ہے کہ اس کا زیادہ اہتمام والتزام غلو ہے، حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک اسلام ہی کیا؟ ہر مذہب میں مذہبی وتہذیبی ثقافت کو عالی حیثیت اور نمایاں اہمیت دی گئی ہے، نیز یہ بھی ایک مسلّم امر ہے کہ تہذیبی شناخت وامتیاز کے معاملہ میں مذاہب عالم میں سب سے زیادہ توجہ اسلام ہی نے دی ہے، اس نے اپنے ماننے والوں کو اس سلسلہ کی سخت ترین ہدایات کا پابند کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ

اسلام ایک مکمل دین اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے آخری دستور حیات ہے، اس میں کسی قسم کی کجی کمی یا جھول نہیں ہے، اس کی تعلیمات اور اس کے احکامات میں زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کیا گیا، اور ہر پہلو سے راہنمائی کی گئی ہے، عبادت ہی نہیں معاملت ومعاشرت بلکہ بشری تقاضوں اور عادتوں تک کے رخ درست اور انداز صحیح کیے گئے ہیں، انہیں اپنے رنگ میں رنگ کر امتیاز وانفرادیت عطا کی گئی ہے، اسلام کو ہرگز یہ گوارا نہیں ہے کہ اس کے پرستار وفرمانبردار کسی بھی معاملہ میں خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو کسی اور قوم یا تہذیب کے خوشہ چیں وکاسہ لیس بننے پر مجبور ہو جائیں، یا محض دیکھا دیکھی کوئی کام کرنے لگیں، مختصر یہ کہ اسلام میں تہذیبی تحفظ اور غیروں کی مشابہت سے بچنے کا مسئلہ دوسرے نمبر کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ نہایت اہم اور بنیادی مسئلہ ہے، کیونکہ اسلامی تعلیمات اس بارے میں کوئی سودا اور کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے تیار نظر نہیں آتیں، انتہائی حیا وغیرت کا مظاہرہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ دیکھئے! نبی کریم انے کس طرح دوٹوک انداز میں متنبہ کر دیا کہ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی تو وہ اسی میں سے ہے، اسی طرح آپ نے کبھی "خَالِفُوا الْمَجُوسَ" اور کبھی "خَالِفُوا الْيَهُودَ" اور کبھی "خَالِفُوا الْمُشْرِكِينَ" کہہ کر تہذیبی انفرادیت وامتیاز کی اہمیت کی طرف متوجہ فرمایا، اسی طرح عملی طور پر بھی اپنی بالغ نظری اور دوررسی سے اذان میں، نماز میں، روزہ میں، سحری وافطار میں، لباس میں دیگر ملبوسات میں، کھانے پینے میں، بول چال میں، اشیاء وظروف کے استعمال میں غرض ہر ہر چیز میں غیروں کے ساتھ مشابہت پر سخت گرفت کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس سے بچنے کی تلقین فرمائی، قرآن وحدیث میں وارد اس سلسلہ کی تعلیمات کو اگر آپ ملاحظہ کریں گے تو اس مسئلہ کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

دراصل جو لوگ اس مسئلہ سے خود بے اعتنائی برتتے ہیں بلکہ اس کا اہتمام کرنے والوں کو غالی، تنگ نظر اور دقیانوس قرار دیتے ہیں، وہ بیچارے یا تو اسلام کے مزاج اور اس کی حقیقی دعوت سے بالکل ناواقف و بے خبر ہوں گے یا پھر اسلام دشمن طاقتوں کے آلۂ کار ہو کر تہذیبِ اسلامی کو مٹانے کی مذموم سازشوں میں شریک ہوں گے، تیسری کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ دوسری قسم کے لوگوں کے لیے تو ان کی ضمیر فروشی و مردہ دلی کی وجہ سے کوئی تذکیر ونصیحت بظاہر بے اثر ہے، یہ لوگ کسی آسمانی گرفت اور قدرتی پکڑ کے بغیر چونکیں گے نہیں، ہاں! پہلی قسم کے لوگوں کے نفع واصلاح کی بھرپور امید ہے، بشرطیکہ ان پر علم وحکمت کے ذریعہ ان کی غلط فہمی دور کرنے اور اسلام کی حقیقی دعوت سے روشناس کرنے کی مخلصانہ جدوجہد کی جائے۔

ہماری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کی کوششوں میں اس عنوان سے بہت ہی مؤثر مدد لی جاسکتی ہے، ہمارے علماء صلحاء اور داعیانِ قوم اگر اس مسئلہ کی اہمیت کو حکیمانہ انداز میں قرآن وحدیث اور سلف صالحین کے طرزِ عمل سے مؤید و موکد کر کے پیش کرتے رہیں گے، نجی مجلسوں میں بھی اور عمومی وعظوں میں بھی! تو انشاء اللہ بہت نفع ہوگا، اور بڑھتی ہوئی تہذیبی انارکی پر بہت حد تک قابو پایا جاسکے گا، یہ کام نہایت ضروری اور وقت کا اہم تقاضہ ہے، اس لیے کہ دیگر اقوام اگر اپنی تہذیبوں کا نام نہاد ترقی کے دام پر سودا کر لیتی ہیں تو وہ جانیں، وہ کیا انکی تہذیب کیا؟ مگر اہلِ اسلام تو ایسا کسی قیمت پر بھی نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ اپنی تہذیب کے مالک نہیں محافظ وامین ہیں، اس سلسلہ میں مزید تفصیل جاننے کے لیے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی معرکۃ الآراء تصنیف ”حیوۃ المسلمین“ کی روح (۲۶) اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی اقتضاء الصراط المستقیم مخالفۃ اصحاب الجحیم اور شروحات حدیث میں تشبہ بالکفار سے متعلق ابواب کا مطالعہ اہل علم کے لیے بے حد مفید ہوگا۔

# کیا اسی کا نام آزادی وحریت ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد پیش آنے والے جن دینی فتنوں کی خبر صحابہ کرامؓ کو دی تھی ان میں ایک بے پردگی کا فتنہ بھی ہے نیز آپؐ نے اسے علاماتِ قیامت میں بھی شمار فرمایا ہے۔

آج کل عالمی سطح پر جس بے پردگی و بے حجابی کا رواج عام ہورہا ہے اور دن بہ دن ترقی پاتا جارہا ہے، —— گوکہ اس کی انتہاء کو پہنچنے والے مجبور و مقہور ہوکر پیچھے ہٹ رہے ہیں —— وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہے، نئے نئے قسم کے لباس ایجاد ہو رہے ہیں، پہلے اہلِ حیا و باشرم لوگ سر کے کھلے رہنے اور چہروں پر نقاب نہ ڈالنے ہی کا رونا روتے تھے، اب پیٹ کمر اور سینہ اسی طرح پنڈلیوں اور بغلوں کا کھلا رکھنا بھی معمولی بات سمجھا جارہا ہے، اچھے اچھے شریف گھرانوں اور سیدھے سادے ماحولوں سے تعلق رکھنے والی عورتیں بھی ذرا دو حرف کیا پڑھ لے رہی ہیں کہ بس تمام اصول و قواعد، احکام و مسائل سے بے نیاز ہوتی جارہی ہیں، بقول کسے ؎

لڑکیاں پڑھ لکھ کے جاہل بن گئیں
گھر کی لالٹینیں شمع محفل بن گئیں

یا بقول اکبرالہ آبادی ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسمان نکلیں
میاں مسجد سے نکلے حرم سے بیبیاں نکلیں

بالکل سچ فرمایا تھا اقبال مرحوم نے، اقبالِ جہاں دیدہ وتعلیم یافتہ نے، کسی

ملّائے کم بیں و گوشہ نشیں نے نہیں ؂

**ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم**
**کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ**

مگراس کا کیا علاج ہے کہ ہمارا دنیوی تعلیم یافتہ طبقہ ــــ خواتین ومرد ــــ اگران کے سامنے مذہبی ودینی گفتگو کی جاتی ہےتو اسے انتہا پسندی اور بنیاد پرستی کا نام دے کر کان بند کرلیتا ہے اوراگر دانشوروں کے تجربات اور جہاندیدوں کے اعترافات وبیانات پیش کئے جاتے ہیں تواس کی تردید کرنے اور بحث ومباحثہ بلکہ کج بحثی پرآمادہ ہوجاتا ہے، بات سننے سمجھنے اوراس پرغوروفکر کرکے کامیابی کی راہ اورنجات کا راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا،عوام تو خیر کالانعام ہی رہے، ہماری غفلت ولاپرواہی کی انتہاء یہ ہیکہ دینداروں،مولویوں اور ہزار افسوس کہ پیروں کے گھروں سے تک عموماً پردہ رخصت ہوگیا ہے۔الا ماشاءاللہ

اوراس عالمگیر بے پردگی وبے حیائی کے مہلک جراثیم سے جو اخلاقی برائیاں اور جسمانی وروحانی بیماریاں جنم لے رہی ہیں اور پھیل رہی ہیں اس سے کسی صاحب عقل کو انکارنہیں ہوسکتا ، بلکہ آج وہی لوگ سب سے زیادہ اس کے نقصانات پرواویلا مچارہے ہیں جوکل ''حریتِ نسواں'' کے خوشنما پرچم تلے اس بےحیائی وبے باکی کے گرمجوش داعی بنے ہوئے تھے۔

ہمیں آزادمنش لوگوں ، دہریوں اوراسلام کے دشمنوں سے کوئی بحث نہیں کرنی ہے،عرض صرف ان دین کی قدرداں ماؤں اور باحیا بہنوں سے کرنا ہے جن کے سینےنورِاسلام سے منوراورجن کے قلوب حبِ خدااوررسولؐ سے معمور ہیں۔

پیاری ماؤ!اورعزیز بہنو! خدا آپ کی مدد کرے، ذرا کسی وقت ٹھنڈے کلیجے سے اس بات پرغورفرمایئے کہ زندگی کی اس تگ ودواورحیات کے اس جہد مسلسل

میں زمانے کی نیرنگیوں اوراہلِ زمانہ کی ہوس پرستیوں نے جب بھی آپ کے دامنِ عفت کو داغدار اور لباس عزت کو تار تار کرنا چاہا تو کس نے آپ کی عزت وعصمت کی حفاظت کی؟ جب آپ کو جانور کہا گیا تو کس نے آپ کی انسانیت کی حمایت کی؟ جب آپ پر بدی کا الزام لگایا گیا تو کس نے آپ کی نیکی کی اشاعت کی؟ جب آپ کو ہوس نفسانی کی غذا سمجھا گیا تو کس نے آپ کی خود داری کی صیانت کی؟ جب آپ کو زندہ درگور کیا جاتا تھا تو کس نے آپ کی جان بخشی کروائی؟ جب آپ کو ناپاک قرار دیا گیا تو کس نے آپ کی پاکبازی کا اعلان کیا؟ کس نے آپ کو ذلت کے قعر سے نکال کر عزت کے عروج تک پہونچایا؟ کس نے آپ کے قدموں تلے جنت ہونے کی بشارت دی؟ کس نے آپ کی پرورش کرنے والوں کو جنت کی خوشخبری سنائی؟ اورکس نے آپ کے ساتھ نرمی ومہربانی، شفقت ورفق کا پوری انسانیت کو پابند کیا؟ کس نے مردوں کوآپ کی حق تلفی پر اپنے غضب سے ڈرایا؟ ان سوالوں کے جواب میں "اسلام" اور صاحبِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک نام کےاورکون نام لیا جاسکتا ہے؟ پھرتم اس محسن مذہب اورمہربان نبی کے احکام کوچھوڑ کر یہود ونصاریٰ کی راہ پر کیوں چلر ہی ہو ؟

پیاری ماؤ! اورعزیز بہنو! اصل میں بات یہ ہیکہ انسان نما شیطانوں کا ایک طبقہ ہے جوآپ کوعزت وعصمت کا مجسمہ، متانت وسنجیدگی کا پیکراور وقارِشرافت کا نمونہ دیکھنانہیں چاہتا، وہ چاہتا ہے کہ وہ آپ کو گوشۂ عصمت سے نکال کر منصۂ شہود پر لائے، اوراپنی ہواہوس کی تسکین کا سامان بنائے، اسلئے اس طبقہ نے آپ کے جذبات کوحریت ومساوات کا جھانسہ دیکراپنی ہوس حیوانی کا شکارکرلیا۔

ہائے! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی عفیف بیٹیاں ـــــ جن کا وجودکل دنیائے انسانیت کیلئے نمونۂ عفت وپیغامِ عزت تھا، اور جن کا سراپا اقوامِ

عالم کیلئے غیرت وحیا کا سامان تھا اور جن کی شرم وحیاء پوری امت کی حریت وآزادی کی پاسبان ونگہبان تھی —— آج اُن کی عزت وعصمت کو سرِ راہ نیلام کیا جارہا ہے، آج ہوٹلوں اور بازاروں میں دواؤں اور غذاؤں کی اشتہارات پر، معمولی معمولی مصنوعات کے لیبلوں پر، دیواروں اور سڑکوں پر، سینما کے پردوں اور ٹی وی کے اسکرینوں پر، ریلوے اسٹیشنوں اور ہوائی اڈوں پر، اخبار ورسائل پر، چوراہوں ہوڈنگس پر اور نہ جانے کہاں کہاں انہیں بے پردہ بلکہ بے لباس کرکے پیش کیا جارہا ہے حتی کہ ان کے مخفی جسم اور مستور اعضاء کی تک نمائش کی جارہی ہے۔ **فیا اسفا علی امهاتنا و اخواتنا!**

کیا دھرتی کے سینہ پر ایک خاتون بھی ایسی زندہ نہیں ہے، ان مظالم وشدائد کو دیکھ کر جس کی رگِ حمیت پھڑک اٹھے اور وہ اپنی دولتِ غیرت کے لٹیروں اور سرمایۂ عفت کے ڈاکوؤں کے خلاف آواز اُٹھائے جو صنفِ نازک پرڈھائے جانے والے اس ظلم وستم کے جواز کو انسانیت کی عدالت میں چیلنج کرے اور جوان سے پوچھے کہ کیا عورت کو بے غیرتی کے نقطۂ عروج پر پہونچانے اور اسے بے حجاب اور برہنہ کردینے کا نام ہی حریت ومساوات ہے؟

اگر یہی بات ہے تو ہزاروں آزادیاں اس قید وپابندی پر قربان اور لاکھوں ترقیاں اس حجاب وپردہ پر نثار جس کے ذریعہ اسلام عورت کو ذلت کی پستیوں سے نکال کر عزت کی بلندیوں تک پہونچاتا ہے اور حیوانیت وبہیمیت کے دلدل سے بچاکر شاہ راہِ انسانیت پر لگاتا ہے۔

کاش کہ کوئی محمد عربی ﷺ کی روحانی بیٹی فطری آزادی اور حقیقی وقار وبڑائی کی بازیابی اور لٹی ہوئی متاعِ حیا کو واپس لانے کیلئے پھر سے کھڑی ہوجائے اور پوری صنفِ نازک کو بے حیائی اور ننگے پن کے اس خطرناک طوفان سے بچالائے، کاش! کاش!!

# خدارا غفلت کا مرض دور کیجئے!

آج کل جہد وعمل کے اعتبار سے مسلم معاشرہ عجیب وغریب صورتحال سے دو چار ہے، دن بہ دن جہاں ایک طرف علمی شعور بیدار ہورہا ہے تو دوسری جانب عملی تعطل وجمود بھی بڑھتا جارہا ہے۔سماج کے تمام افراد ـــــــ الا ماشاء اللہ ـــــــ اپنی مذہبی واخلاقی ذمہ داریوں سے مجرمانہ غفلت کے شکار ہیں،آپ اگر ضعیف العمر بزرگ حضرات کو دیکھیں تو وہ مساجد، چوراہے،بیٹھکوں اور دیوان خانوں میں کسی غیر ضروری مباحثہ میں سرگرم ومنہمک نظر آئینگے کبھی کوئی سیاسی مسئلہ اٹھاتے اور گھنٹوں نکال لیتے،کبھی کوئی مذہبی بحث چھیڑ دیتے اور بے حساب وقت گنوا دیتے ہیں۔کبھی اپنی ماضی کی داستانیں اور کارستانیوں کا سلسلہ شروع کرتے اور ایسے مشغول ہو جاتے کہ کئی کئی وقت کی نمازیں ضائع ہوجاتی ہیں،حالانکہ ان کی ان بحثوں سے نہ کوئی مذہبی مسئلہ حل ہونے کا اور نہ ہی کوئی سیاسی گتھی سلجھنے کی!ان بحثوں میں سوائے اپنے ذہن کی اپج اور خودرائی کو دوسروں سے منوانے کی ہٹ کے اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔

نوجوانوں کو دیکھئے تو صبح وشام تک فیشن کی نقالی،ٹیپ ٹاپ، بناؤ سنگھار،اور ذہنی تعیش وتفریح کی فکروں میں اس سے زیادہ مشغول دکھائی دیتے ہیں جتنا اپنی تعلیم، کسب حلال اور اہل حقوق کے حقوق ادا کرنیکی فکر میں ملت کے شریف نوجوانوں کو مصروف ہونا چاہیئے، تصنع وبناوٹ اور بناؤ سنگھار میں تو آج کا نوجوان لڑکیوں کے احساسات کو بھی شرمندہ کر گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ تعلیم گاہوں میں کامیابی کا اوسط لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کا آرہا ہے۔

نوعمر و کمسن بچے تو پھر بچے ہی ہیں۔ان کا حال یہ ہے کہ صبح کو نیند سے بیدار ہوتے ہی ٹفن باکس، بیاگ، یونیفارم، موزے، جوتے، اسکول، ٹیوشن، ہوم ورک اوران کے متعلقات کی آوازیں جو سننا شروع کر دیتے ہیں تو شب کو سونے تک یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے، بلکہ ان غریبوں کو خواب میں بھی یہی کچھ نظر آتا ہوگا،اس پورے عرصہ میں انہیں نہ کبھی اللہ رسول کا نام سننے کو ملتا ہے نہ دین وایمان کا کوئی پیغام! کبھی تھوڑی سی فرصت مل بھی گئی تو ویڈیو گیم، کمپیوٹراور ٹی وی کے پروگرام اپنے اندر اس قدر مشغول کر لیتے ہیں کہ کھانے پینے تک کا ہوش کھو بیٹھتے ہیں۔

رہ گئیں صنف نازک اور رنگ کائنات، تو انہیں اولاتو گھر گرہستی کے امور سے فرصت نہیں اور اگر کچھ وقت نکل بھی آیا تو وہ ان کی فضول گوئی اور لغو ولایعنی کیلئے ہی ناکافی ہے، آج کی عورت کی زندگی میں اوراد واذکار کی پابندی، تلاوت قرآن کا اہتمام، شب بیداری وتہجد گذاری، کتب دینیہ کا مطالعہ اوراس کی تعلیم تو ایک طرف رہنے دیجئے فرائض وواجبات کی تکمیل اوراولاد کی تربیت وتادیب تک کی گنجائش نہیں ہے۔

اور جہاں تک ملازمتوں، تجارتوں اور کاروبار میں مشغول حضرات کا تعلق ہے تو یہ بے چارے ضروریاتِ زندگی کی فراہمی اور آمدنی کی خاطر بلاشبہ صبح سے شام تک خون پسینہ ایک کرتے اور محنت ولگن سے کام میں لگے رہتے ہیں۔لیکن ان کی یہ ساری تگ ودواور محنت ومستعدی محض چارروزہ مدت حیات کی راحت وآرام تک محدود ہے، اپنی اور اپنی اولاد کی اُخروی اور ابدی زندگی کی فوز وفلاح سے انہیں بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔تب ہی تو ان بے چاروں کو نہ احکام شریعت سے کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی واجبات اسلامی کی ادائیگی کا پاس واحساس!

ہمیں معلوم ہے کہ مذکورہ تمام اصناف میں سب ہی لوگ اس قماش کے نہیں

ہیں بلکہ ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اس عام صورتحال سے بالکل جدا اور مستثنیٰ ہے، اور ان کی تعداد ماضی کے مقابلہ میں کچھ زیادہ بھی ہے، مگر مذکورہ بالا صورتحال کے شکار لوگوں کے مقابلہ میں نہایت کم ہے، نیز یہ مستثنیٰ طبقہ بھی صرف معروفات وعبادات کی حد تک مستثنیٰ ہے، معاملات ومعاشرت کے ابواب میں یہ طبقہ بھی اسی غفلت کا ہے، جو عام غافل طبقہ کے اندر پائی جاری ہے۔

اس صورتحال کا مقابلہ جن اسباب وذرائع سے کیا جا سکتا ہے، نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان اسباب ہدایت اور وسائل نجات کو بھی ہماری شامت اعمال نے سامان تفریح بنا رکھا ہے۔ وعظ ونصیحت تبلیغ ودعوت، تدریس وتعلیم اور اسلامی واصلاحی تصنیفات ومضامین کی کثرت نے جہاں بعض گوشہائے عمل میں جوش اور ولولہ پیدا کیا ہے وہیں ایک بڑے طبقہ کے اندر غیر ضروری مباحث ومحادث کے دروازے کھول دئے ہیں، اب بہت سے لوگوں نے علمی ودینی موضوعات پر بے معنی گفتگو کو وقت گذاری کا ذریعہ بنایا ہوا ہے، بسا اوقات اس قسم کی نشستوں میں دوسرے آداب کی پرواہ تو کیا کرتے فرض نمازیں تک ضائع کر دیتے ہیں، اس قسم کے لوگ علماء کرام سے پہلے تو ملنا ہی نہیں چاہتے اور کبھی ان کے ہاں جاتے بھی ہیں تو ایسے مسئلہ کو لے کر جاتے ہیں جن کی کوئی اہمیت شریعت میں نہیں ہوتی، حالانکہ خود بیسیوں ایسے معاملات میں مبتلاء رہتے ہیں کہ ان کا معلوم کرنا اور ان کی اصلاح کرنا نجات اخروی کے لئے گویا موقوف علیہ ہے، ایسے اہم مسائل کی انہیں کوئی پرواہ نہیں ہوتی، قرآن وحدیث کے دروس میں شریک ہوتے ہیں تو واہ واہ کر کے اٹھ جاتے ہیں، مواعظ ومجالس میں جاتے ہیں تو تبصروں اور تنقیدوں کے ساتھ واپس ہوتے ہیں، جلسے جلوس تو محض رسمی اور وقتی ہو کر رہ گئے ہیں، انہیں تو بس تسکین ہوس کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا ہے، بڑے جوش وخروش سے کئی کئی وقتوں کی

نمازیں قربان کر کے ان کا انتظام کرتے ہیں، اور وہ بھی عجیب والہانہ طرز و انداز کے ساتھ، بلکہ اگر کوئی سنجیدہ و سادے انداز میں کر لینے کی ترغیب دے تو کہتے ہیں کہ جلسے کا مزہ نہیں آئے گا، اس کا مطلب یہی ہوا کہ جلسے جلوس کا مقصد بھی اب تذکیر و موعظت کے بجائے لطف و لذت ہو گیا ہے۔

غرض یہ کہ آج ہمارا معاشرہ سعادت اور اسبابِ سعادت دونوں ہی سے عملاً دور ہوتا جارہا ہے۔ گو صورتاً کچھ مراسم باقی رکھے ہوئے ہے۔ حالانکہ دنیوی اعتبار سے یہ دور علمی شعور اور فکری آگہی کا دور سمجھا جاتا ہے، لوگ ظلمتِ جہالت سے نفرت اور نورِ علم سے رغبت ظاہر کرتے ہیں۔ اسکے باوجود دینی امور میں عملی زندگی کی رفتار بہت دھیمی ہے۔ گویا یہ دور گفتار کا دور ہے کردار کا نہیں۔

اس لئے دنیا و آخرت کی کامیابی کے لئے وقت کا اہم ترین تقاضہ اور امت کی شدید ترین ضرورت ہے کہ تمام باشعور و دین پسند افراد اور جماعتیں معاشرہ کے اس عملی جمود کو توڑنے کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں میں ہنگامی طور پر لگ جائیں، قرآن و حدیث کی روشنی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کو پورے اہتمام سے بجا لائیں، ساتھ ہی دعاؤں کا اہتمام بھی کرتے رہیں کہ یہ اہم تدبیر ہے۔

جس طرح عام حالات میں دواخانے اپنی جگہ کام کرتے رہتے ہیں۔ اور بیمار دواخانوں تک پہونچ کر اپنا علاج کرواتے ہیں مگر وبائی و طاعونی صورتحال میں جو تیزی کے ساتھ آبادیوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ محکمہ طبابت دواخانوں کی کارکردگی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ گشتی اسپتال لے کر ہر جگہ پہونچ جاتا ہے، بلکہ گھر گھر پہونچ کر ٹیکہ اندازی دواؤں کا چھڑکاؤ وغیرہ تدابیر کو ضروری سمجھتی ہے، اسی طرح مسلمانوں کے اس عمومی اور متعدی مرض اتکال سستی و لاپرواہی کو ختم کرنے کے لئے عمومی و ہنگامی جدوجہد کی بھی اس زمانہ میں سخت ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرماویں۔ آمین

# سانحہ منیٰ ـــــ اثرات، احکام اور تعزیت

اس سال ۸/ذی الحجہ کو جب کہ اقطاعِ عالم سے آئے ہوئے لاکھوں عازمینِ حج احرام بند ہوکر مناسک حج کا آغاز کرتے ہوئے وادی منی میں پہنچے، اور بہت سے ابھی پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ اچانک ایک خیمہ سے آگ کے شعلہ بلند ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دو نہیں، سو دو سو نہیں، ستر تا نوے ہزار خیمے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئے۔ڈھائی تین گھنٹے تک ہوا کی رفتار پر پھیلتی ہوئی اس صحرائی آگ نے ایک کہرام برپا کردیا حجاج کرام میں دہشت وسراسیمگی، حیرانی وپریشانی کا ایسا ماحول بن گیا کہ کسی کو کسی کی خبر نہ رہی، لوگ چہرے کے رخ پر چل پڑے، جس کو جو سمجھ میں آیا اپنی حفاظت کیلئے بے چارہ وہ کرگذرا، اسی افراتفری میں عزیز واقارب ایک دوسرے سے بچھڑ گئے، ہزاروں مسلمان اپنے اسباب ووسائل سے محروم ہوگئے، ہزاروں معذور ومجروح ہوگئے، سینکڑوں کی جانیں کچھ تو آگ کی نذر ہوگئیں، کچھ بھگدڑ کے حوالے سے ضائع ہوئیں اور ابھی تک سینکڑوں ایسے ہیں جن کا کچھ اتہ پتہ نہیں کہ آیا کہیں کھو گئے ہیں یا دنیا سے ہی رختِ سفر باندھ چکے ہیں؟

بلا شبہ یہ حادثہ اپنی نوعیت کا عظیم حادثہ اور اندوھناک سانحہ ہے، ادارہ اشرف العلوم اس سانحہ میں کام آجانے والے تمام ''شہدائے راہِ حق'' کیلئے اپنی سعادت سمجھ کر دعائے مغفرت، مجروحین ومتاثرین کیلئے دعائے عافیت وصحت، اور ان کے عزیزوں وقریبوں کیلئے دعائے صبر وثبات اور استقامت کرتا ہے، اللہ پاک انہیں صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے آمین۔

حج کے سلسلہ میں قرآن کریم نے صاف طور پر بتلایا ہے کہ اس میں عازمِ حج کو بہت محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے، ایسا کوئی عمل سرزد نہ ہو جس سے کسی مسلمان بھائی کو تکلیف واذیت پہونچنے کا احتمال ہو، ارشادِ ربانی ہے: "**فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلاَ رَفَثَ وَلاَ فُسُوقَ وَلاَ جِدَالَ فِي الْحَجِّ**" جن لوگوں پر اشہرِ حج میں حج فرض ہو جائے، (تو انہیں چاہیے کہ حج کریں مگر خیال رہے کہ) حج میں نہ فحش بات ہونے پائے، نہ گناہ کے کام اور نہ ہی جھگڑا، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**من حج فلم يرفث ولم يفسق رجع كيوم ولدته امّه**" جس نے حج کیا اور اس میں نہ فحش بات کی، نہ گناہ کے کام کیا تو وہ اس طرح گناہوں سے پاک (اپنے گھر) لوٹے گا جیسے وہ اپنی پیدائش کے دن تھا۔ ان تعلیمات سے آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ اسلام نے خصوصاً سفر حج میں گناہ کے کاموں سے بچنے کی کس قدر تاکید فرمائی ہے۔ ویسے اسلام کی عادلانہ تعلیمات نے تو زندگی بھر کے لئے اس کا پابند کیا ہے کہ مسلمان کبھی کسی کے حق میں مضر ثابت نہ ہو، بلکہ "مسلمان کامل" کی تعریف ہی یہ فرمائی کہ اس کی زبان وہاتھ سے کسی کو اذیت نہ پہنچے "**المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده**" حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ احادیثِ شریفہ کے تتبع اور تلاش سے پتہ چلا کہ تمام اخلاق کا خلاصہ اسکے علاوہ اور کچھ نہیں کہ "آدمی اس طرح رہے کہ اس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے"۔ حضرت مفتی محمد شفیعؒ کا اپنے شیخ کی تربیت کے بعد جو مزاج بن گیا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری کہ
آشیاں کسی شاخ چمن پر گراں نہ ہو

حضرت سید احمد کبیر رفاعیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ دامن پر بلی بیٹھ گئی تو

اس کی نیند خراب کرنے کے بجائے اپنا دامن کاٹ لینے کو ترجیح دی کہ جانوروں میں انسانوں کے اخلاق بدنام نہ ہوں۔اس کے برخلاف اب ہم مسلمانوں کا عام حال یہ ہوگیا ہے کہ خودغرضی وعیش پسندی کا مجسمہ بن گئے ہیں ،ہمیں کسی مسلمان کی تکلیف واذیت کا احساس تک نہیں رہا ہم بہت آسانی سے بغیر کسی تکلف کے اپنے حقیر سے نفع کی خاطر دوسرے کا کثیر وعریض نقصان کر بیٹھتے ہیں ، اپنا دامن سنبھالنے کے لئے دوسرے کی جان لے بیٹھتے ہیں اپنے چراغ جلانے کیلئے دوسرے کے دیئے پھونک دیتے ہیں،اپنے گھر سنوارنے کیلئے دوسروں کی بستیاں لوٹ لیتے ہیں۔مختصر یہ کہ اس دور ترقی نے ہمیں انسانیت کے عالی مرتبہ سے گرا کر ایک ہوشیار ترین جانور بنادیا ہے، جو ہزاروں میل پر پھیلی ہوئی ہریالی پر بھی اپنے علاوہ کسی اور کو چرتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا۔ہماری اسی کمزوری نے ہمیں دوسروں کیلئے ہی نہیں خود اپنے لئے بھی ایک وبال ایک خطرہ اور ایک بار عظیم بنادیا ہے، آئے دن کے حوادث ومصائب ہماری اس کمزوری ہی کی دین ہیں۔اور غور کیا جائے تو ”منیٰ کا عظیم سانحہ“ بھی اسی کمزوری کا مظہر ہے۔حکومتیں انتظام کرسکتی ہیں، پیسہ خرچ کر سکتی ہیں، قانون بنا سکتی ہیں، ہدایات واحکامات جاری کرسکتی ہیں،مگر کسی شخص کی ”حس“ ہی اگر مردہ ہوچکی ہو تو اس کا کیا علاج کیا جاسکتا ہے۔آپ غور فرمائیں لاکھوں کے اس مجمع میں کس کا ہاتھ پکڑا جاسکتا ہے کہ تم ”اسٹو“ مت لے جاؤ، تم لائیٹر اور ماچس مت جلاؤ،تم یہ مت کرو، وہ مت کرو یہ تو ”عقلِ عام“ کا پیغام ہے کہ خطرہ کے کاموں سے خود بچنا چاہیے اور دوسروں کو بھی بچانا چاہیے،خصوصاً ایسی حساس جگہوں پر انسان اگر دو چار روز کے لئے اپنی عادتوں کے خلاف صبر کرلے اور اپنی خواہشوں کو نظرانداز کردے تو کیا نقصان ہوجائیگا ؟ آخر یہاں آیا ہی اس لئے ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات سے اپنی محبت وچاہت کا ثبوت پیش کرے۔کیا

عاشقانِ راہ حق کا مزاج ایسا ہی ہوتا ہے؟ کیا وارفتگانِ جمالِ خدا اتنے نادان ہوتے ہیں؟ ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ اسمیں کیا حرج ہے؟ حالانکہ بہت سے کاموں کو ہم معمولی سمجھتے ہیں لیکن وہ انجام کے لحاظ سے بہت بڑے ہوتے ہیں۔ " **تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّناً وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ** " صحابہؓ فرماتے تھے کہ تم جن باتوں کو تنکوں کی طرح ہلکا سمجھتے ہو ہم عہد رسالت میں ان کو پہاڑوں کی طرح بھاری سمجھتے تھے۔

حضرت مسیح الامتؒ کا ایک واقعہ ان کے ہم جماعت مولانا عبدالجبار ندویؒ بیان کرتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانہ میں کسی ساتھی نے کھڑکی میں سے باہر تھوک دیا۔ مولانا نے فرمایا، بھائی صاحب! اگر کوئی شخص ادھر سے گذرتے ہوتے تو ان کو آپ کے عمل سے کس قدر تکلیف ہوتی، اس ساتھی نے کہا کہ اس وقت یہاں سے کوئی نہیں گذرتا، آپ نے فرمایا احتمال تو ہے، کہا ہاں احتمال ہی تو ہے یقین تو نہیں۔ آپ نے آبدیدہ ہوکر فرمایا، بھائی صاحب آپ! مسلمان ہیں اور آپ کو مسلمان کے احتمالِ اذیت کے تصور سے ڈر نہیں لگتا، یہ کہہ کر آپ رو پڑے۔

میرے دوستو! یہ ہے انسانیت مگر یہ انسانیت اب ناپید ہوتی جارہی ہے، اگر سفر حج میں خصوصاً اور عام احوال میں عموماً مسلمان ان احتیاطی امور پر نظر رکھا کریں اور مسلمان کی اذیت کے خوف سے اپنی بعض راحتیں اور مصلحتیں تج دیا کریں تو ایسے سنگین حوادث و مصائب سے بآسانی حفاظت ہوسکتی ہے۔

---

جو حضرات اس سانحہ کے متاثرین ہیں اور جو خوش بخت اس حادثہ کا شکار ہوکر جامِ شہادت نوش فرما چکے ہیں ان کے پسماندگان سے یہ عرض کرنا ہے کہ آپ اپنے مادی نقصان کا غم نہ کریں، یہ بڑی سعادت وخوش بختی کی موت ہے، جو لوگ شہید ہوگئے، انہیں انشاءاللہ وعدہ خداوندی کے مطابق مقبول حج کا اجر نصیب ہوگا۔ مزید

برآں اس ناگہانی تکلیف کا ثواب بھی ملے گا۔ان کے پسماندگان کو جہاں طبعی طور پر ان کی جدائی کا رنج وغم ہے، عقلی طور پر ان بشارتوں کو سوچ کر سرور واطمینان بھی حاصل کرنا چاہیے، جو ایسے لوگوں کے حق میں اسلام نے بیان کی ہیں۔

اور جو حضرات بفضلہٖ تعالیٰ بچ گئے ہیں مگر مناسک حج کی تکمیل نہ کر سکے وہ بھی مایوس نہ ہوں، حق تعالیٰ اپنی قدرت سے ضرور ایسے راستے نکال دیں گے جن سے اس فریضہ کی ادائی سہل ہو جائے، اور خلافِ طبع وصبر آزما حالات سے گذرنے کا اجر مزید برآں ہوگا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ ''مسلمان ہر حال میں نفع مند ہی ہے'' صحابہؓ کے استفسار پر وضاحت فرمائی: ''جب اس کو نعمت ملتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور شکر کا بدلہ جنت ہے، مصیبت آتی ہے تو صبر کرتا ہے اور صبر کا بدلہ بھی جنت ہے۔'' یہ خصوصیت کسی قوم کی نہیں۔

بہر حال اس شمارہ کے اداریہ میں یہ چند سطریں راقم الحروف نے اپنے مسلمان بھائیوں کی تسلی وتعزیت کے طور پر لکھے ہیں۔امید ہے کہ نافع ثابت ہوں گی۔حق تعالیٰ سب پر رحم فرمائے، آمین۔

# آزادی کا پچاس سالہ جشن

آج سے پچاس سال قبل ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو انگریزوں کے تسلط سے مادر وطن ہندوستان کو گلوخلاصی اور آزادی کی دولت حاصل ہوئی اور اس سال ملک میں اس آزادی کی پچاسویں سالگرہ منائی جارہی ہے۔اس مناسبت سے آج کی صحبت میں قارئین اشرف العلوم کے سامنے دو حقیقتوں کی وضاحت کا ارادہ ہے۔

(۱)

پہلی بات تو یہ ہے کہ آزادی ہند کو پچاس سال ہو چکے ہیں۔مسلمانوں کی اکثریت کو اب تک اس بات کا صحیح علم نہیں ہے کہ آزادی وطن کے جہاد میں کس کا حصہ کس قدر ہے؟ ہندوستان میں اگرچہ مختلف قومیں بستی ہیں۔لیکن عبوری طور پر باشندگانِ ہند دو قوموں میں منقسم اور بٹے ہوئے ہیں، ہندو اور مسلمان۔پہلی کو اکثریت اور دوسری کو اقلیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔(گو خود انکے اندر دسیوں فرق واحزاب ہوں۔) ہندوستان کی خودمختاری اور آزادی کے حصول کیلئے دونوں ہی قوموں نے بےلوث اور نمایاں کردار ادا کیا ہے،لیکن اس جدوجہد کی ابتداء کرنے اور پیش پیش رہنے کا شرف صرف مسلمانوں کو حاصل ہے اور قربانیوں اور سرفروشیوں کا امتیاز بھی مسلمانوں ہی کا حصہ ہے۔کیونکہ یہ طبعی اور فطری امر ہے کہ چیز جس کے ہاتھ سے چھینی جاتی ہے اس کا خون زیادہ کھولتا ہے اور جوشِ انتقام زیادہ پیدا ہوتا ہے،انگریزوں نے ہندوستان کی مملکت مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھینی تھی

لازماً مسلمانوں کے اندران کے خلاف غیض وغضب اوراپنی مملکت کی واپسی کا جوش وجذبہ دیگر اقوام وطن سے زیادہ ہونا فطری امر تھا، ہوا اور بالکل برحق اور موافقِ فطرت ہوا، انگریزوں نے ہندوستان میں پہلے پہل تجارتی سرگرمیوں کے ذریعہ اپنے قدم جمائے پھر دھیرے دھیرے اپنے پیٹ سے پیر باہر نکالنے شروع کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ناپاک عزائم اورسنگین سازشوں کا جال پورے ملک میں پھیلا دیا۔

حکومت وقت نے ان کی سازشوں پر جیسی کڑی نظر رکھنی چاہیے تھی نہیں رکھی، پھر وہ دن بھی آیا کہ حکومت برائے نام رہ گئی، اور شاطر فرنگی کا دام چل گیا ادھر جرات وشجاعت، حریت وحمیت کے علمبردار سلطان ٹیپو شہیدؒ نے ان فرنگی شیطانوں سے مقابلہ میں ظاہری ہزیمت وشکست اٹھا کر جام شہادت نوش فرمالیا تو ان کی ہمتیں اور مضبوط ہوگئیں، اور وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے ہوئے بہ بانگ دہل کہنے لگے کہ" اب ہندوستان بلاشرکتِ غیرے ہمارا ہے"۔ یہ بات ہندوستان کے غیور مسلمانوں اورحضرات علماء کرام کے لئے ناقابلِ تحمل تھی اوروہ اسے اپنی انتہائی ذلت اور رسوائی اور سازشی فرنگیوں کا صریح ظلم واستبداد تصور کرتے تھے، چنانچہ ان کے قلوب میں ظالموں کیلئے بے پناہ بغض وعداوت کی آگ مشتعل ہوگئی، ایک طرف عوام الناس کا خون کھول رہا تھا تو دوسری جانب علماء کرام کی رگ حمیت وغیرت پھڑک رہی تھی، وہ معاملہ کے اطراف وجوانب اورنتائج وعواقب میں غور کرنے لگے اور یہ سوچنا شروع کیا کہ ایسے احوال میں ہمیں بحیثیت وفادار وطن کیا کرنا چاہیے، اور بحیثیت سچے مسلمان اس وقت ہمارے لئے شریعت کی راہنمائی کیا ہے۔

علماء کرام کے سامنے کوئی راستہ اسکے علاوہ نہیں رہ گیا تھا کہ مادر وطن کو ظالم لٹیروں کے دستِ استبداد سے نجات دلانے کیلئے بغیر کسی تاخیر کے مسلح جدو جہد کا

آغاز کردیں، اورتن من دھن کی بازی لگا کر وطن عزیز سے بے وطنوں کے عمل دخل کو جلا وطنی کا حکم سنا دیں، چنانچہ سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے خلف الرشید صاحبِ بصیرت عالمِ دین مفسرِ قرآن حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے پوری جرات ایمانی اور بصیرتِ اسلامی سے کسی خوف تردید اور لومۃ لائم کی پرواہ کئے بغیر اپنا تاریخی فتوائے حریت صادر فرمایا۔

بس کیا تھا۔مسلمانوں خصوصاً وقت کے علماء کرام میں جذبہ شہادت جوش مارنے لگا جان و مال سر دھڑ کی بازی لگانے والوں نے سر بکف میدان عمل میں قدم رکھا اور انگریز کو اس کے کیفر کردار تک پہنچا دینے کی گویا قسم کھالی اور ملک کے طول وعرض میں انھوں نے انگریزوں کے تئیں منافرت و مخالفت کا بازار گرم کر دیا، اور عوام کے قلوب میں نہ بجھنے والی اک آگ لگا دی۔اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو غیور و بہادر علماء کرام کی قیادت میں انگریز حکمرانوں کے ظلم پہ ظلم سہتے ہوئے اور انسانیت کو لرزا دینے والی بلکہ درندوں کو شرمندہ کر دینے والی سزاؤں کا سامنا کرنے پر مجبور ہونا پڑا، قدم قدم پر شکست و نامرادی کا سامنا کرتے رہے، لیکن سرزمین ہند سے انگریز کو نکال باہر کرنے کے عزم صمیم اور جذبہ صادق پر آنچ نہ آنے دی اور اپنا کام جاری رکھا۔ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو سوچنا چاہیے کہ جس وقت سلطان ٹیپو کی لاش مبارک سری رنگا پٹنم کی فصیل پر بخاک وخون غلطیدن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔جس وقت مرزا مظہر جانِ جاناں کا جسمِ مبارک انگریزی گولیوں کی بوچھاڑ سے چھلنی ہو رہا تھا، جس وقت سیدین شہیدین بالا کوٹ کے دامن کوہ میں شہادت کے مرحلوں سے گذر رہے تھے، جس وقت چار ہزار سے زائد علماء اسلام کالے پانی کی ذلتیں وصعوبتیں پر برداشت کر رہے تھے، جس وقت دلی کے درختوں پر ہزاروں فرزندانِ اسلام کی نعشیں لٹک رہی تھیں، جس وقت ایک سو

علماء کی ایک جماعت گنگا کے کنارے زندہ درآتش کی جارہی تھی، جس وقت جلیانوالہ باغ میں مسلمانوں کے سر کٹ رہے تھے۔اس وقت اوران جیسے دیگر اکثر وقتوں میں کیا کوئی اور بھی انکا ساتھ دے رہا تھا؟ پوچھئے ان اہل وطن سے کہ اس وقت کتنے غیر مسلم ان سرفروشوں اور جانبازوں کے ہمراہ تھے؟ ان قربانیوں میں اس میں حمیتِ قومی، غیرتِ وطنی کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کا تصور بھی کیا جاسکتا تھا؟ یا اب ہے؟

آج آزادی ہند کا نام آتے ہی گاندھی جی اور جواہر لال نہرو جیسے چند ناموں کے علاوہ کسی اور نام کا تصور بھی مشکل ہوگیا ہے، زیادہ حوصلہ اور انصاف کا خیال ہوا تو ابوالکلام آزاد کا نام بڑھالیا، مگر شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید، اسماعیل شہید، فضل حق خیرآبادی، محمد جعفر تھانیسری، عنایت احمد کاکوری، مفتی یحییٰ علی، حاجی امداداللہ، حافظ ضامن شہید، رشید احمد گنگوہی، قاسم نانوتوی، شیخ محمود الحسن اور حسین احمد مدنی رحمھم اللہ وغیرہ وغیرہ (جنکے دلخراش وزہرہ گداز قربانیاں جریدہ عالم پر ثبت ہیں۔) کے نام طاق نسیاں کے حوالے کر کے جدوجہد آزادی کے افق سے غائب کردئے گئے ہیں۔ نہ تقریروں میں ان کا ذکر نہ تحریروں میں ان کا ذکر، درسی کتابوں اور نصابی مواد سے تک انہیں خارج کردیا گیا۔ ذرا اُس بے غرضی و بھائی چارگی کو دیکھئے اور اِس خودغرضی اور ناانصافی کو بھی ملاحظہ کیجئے۔

بلا شبہ ہمیں اس جدوجہد آزادی کے مرحلہ آخریں میں اپنی ہم وطن قوموں کی شرکت محنت اور قربانیوں کا پورا اعتراف ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ بعد کے ادوار میں غیر مسلم اقوام کی قیادت نے حصولِ آزادی کی جدوجہد میں جراتمندانہ بھر پور حصہ لیا، انہوں نے بھی جیلیں کاٹیں، مصیبتیں سہیں اور تکلیفیں اٹھائیں........... اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم اور برحق ہے کہ ہمارے اسلاف کرام اس ملک کے لئے اس وقت بھی لڑتے رہے جب ان کا کوئی ساتھی وشریک نہ تھا، بلکہ

دیگر اقوام نے انگریزوں کے تسلط کے آگے ہتھیار ڈال کران کے اقتدار کوایک حد تک تسلیم کر لیا تھا، تب بھی مسلمانوں نے ان کو تسلیم نہیں کیا تھا، برابر ان کے ساتھ جہاد بالسیف کرتے اوران کے ناپاک عزائم پر قدغن لگاتے رہے، جب غیر مسلم اقوام انگریزوں کے مشن اسکولوں میں اپنے بچوں کو پڑھاتے اوران سے فائدہ اٹھاتے تھے اس وقت مسلمان دشمن کی زبان سے تک قوم کو بھی نفرت دلا کر زبان سیکھنے سے بھی روکتے رہے، اوراس وقت بھی اسی شباب اورآب وتاب سے سینہ سپر رہے جب کہ دیگر قومیں ان کی شریک کار ہو گئیں۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر مسلمانوں کے راہنماؤں نے خود کوشش کر کے غیر مسلموں کو دشمنانِ ملک کے مقابلہ میں یکجا کیا، اور جب غیر مسلم اقوام کی قیادت حصولِ آزادی کے میدانِ عمل میں اتر آئی، بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا اتار کر لائی گئی، تو مسلمانوں نے ان کے آنے پر خوش آمدید کہا، اور نہ صرف یہ کہ ان کا تعاون کیا بلکہ ضرورت پڑی تو خود ان کے ماتحت ہو کے انہیں آگے بڑھایا، قوم خفا ہوئی تو اس کی کچھ پروانہ کی، بلکہ اسے قوم کی فرقہ پرستی قرار دیکر رد کر دیا۔

ان سب قربانیوں اور جان سپاریوں کا صلہ کیا ملا؟ کیا اس کا یہی صلہ ہے کہ مادر وطن کے ان جیالے سپوتوں اور بہادر بیٹوں کو—— جنہوں نے تقریباً ۲ صدی تک مسلسل اپنی دھرتی کے تحفظ کیلئے جان کے نذرانے اور خون کے تحفے پیش کئے، چین وسکون غارت کیا، خواہشات وجذبات کو قربان کیا، بیویوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کیا—— جان بوجھ کر انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے، اور آزادی کی تقریبات میں ان کا نام تک نہ لیا جائے، نئ نسلوں سے ان کو چھپایا جائے اوران کے سامنے آزادی کے ہیروؤں کی حیثیت سے بس گاندھی، نہرو، سبھاش چندر بوس اور زیادہ سخاوت ومہربانی کردی تو ابوالکلام آزاد کے علاوہ کسی کو نہ دکھایا جائے؟ کیا یہ حکومتی

فرقہ پرستی اور جانبداری نہیں؟

آج ہم سوال کرتے ہیں کہ حکومت اور اقوامِ ہند کی اکثریت میں کوئی زعیم اور بہادر ایسا ہے جو آزادی کے ان بے لوث ومخلص سور ماؤں کا دبایا ہوا حق انہیں دلا کر ان کی روحوں کو خوش کر دے؟ ہم تقابل وتفاخر کے نہ پہلے عادی تھے نہ اب ہیں مگر

نہ تم صدمے ہمیں دیتے نہ ہم فریادیوں کرتے
نہ کھلتے راز سربستہ نہ یہ رسوائیاں ہوتیں

ساتھ ہی ہم اپنی قوم کے ذمہ داروں، اسکولوں کے چلانے والوں، مدارسِ دینیہ کے ناخداؤں اور سیاسی لیڈروں سے دست بستہ عرض کرتے ہیں کہ آپ اپنی تاریخ فراموش نہ کریں، کم از کم آپ تو اس کی حفاظت کا حق ادا کریں، اور ۱۵ر اگست کے موقع پر اپنے ان نامور اسلاف کی یاد تازہ کر کے اور نسلوں کے سامنے پیش کر کے ان کی خدمات کو خراج عقیدت وتحسین پیش کریں، ورنہ جو قوم اسلاف کے کارناموں سے بے بہرہ اور ان کی تاریخ سے ناواقف ہوگی وہ قوم جینے اور ترقی کرنے کا حق نہیں رکھتی، زمانہ اس کو مٹائے گا اور اسے مٹنا ہی چاہئے۔

## (۲)

دوسری بات جو اس موقعہ سے کہنے کی ہے وہ یہ کہ آزادی تو ہندوستان کو حاصل ہوگئی، مگر آج پچاس برس کے بعد بھی ملک کوئی باوقار ومستحکم ملک نہ بن سکا، ملک آزاد ہوتے ہی بدقسمتی سے تقسیم کا شکار ہوگیا، علاقائی خودمختار ریاستیں مرکز کے تحت کر کے متحدہ حکومت قائم ہوگئی اس کا ایک بہترین دستور بھی بن گیا، لیکن جس شئے کا نام استحکامِ مملکت ہے اور جسے ترقی یافتہ ممالک کے صفوں میں شرکت کہتے ہیں، وہ آج تک نصیب نہیں، ملک میں فرقہ پرستی عروج پر ہے، کانگریس اپنے کرتو توں

اور عیاریوں کا انجام بھگت رہی ہے، دوسری سیاسی جماعتوں کو اتنی بڑی اور منظّم جماعت ہونے کا نہ کبھی شرف حاصل ہوا اور نہ آئندہ توقع ہے، تجارتی سرگرمیاں دن بہ دن ٹھپ ہوتی جارہی ہیں، نظم ونسق تعطل کا شکار ہے، اقتصادی صورتحال بحران سے دوچار ہے، دوتہائی آبادی نہایت غربت وافلاس سے داغدار ہے، باقی ایک تہائی میں بھی دولت ایک مخصوص طبقہ میں مرتکز ہوکر رہ گئی ہے، رشوت ادنی سے لیکر اعلیٰ افسروں تک کا پسندیدہ چارہ ہے، خزانے خالی ہو رہے ہیں، اور پروگرام وعزائم سب کے سب تشنۂ تکمیل اور محض اخباری ہیں۔

ترقیاتی سرگرمیاں روز اخبار کی سرخیاں بنتی ہیں اور سبز باغ دکھا کے روپوش ہوجاتی ہیں، لیڈروں کی تقریریں وعدہ معشوق سے کم نہیں ہیں، گرانی روز افزوں ہے اور اشیاء مایحتاج کا حصول بھی مشکل ہوتا جارہا ہے، حکومتیں نکتہ چینیوں، لڑائی جھگڑوں اور اسمبلی، پارلیمینٹ میں میز کرسیوں کی اٹھا پٹک اور ہاتھا پائی اور سیاسی اُتھل پتھل کو اپنا مشغلہ بنائی ہوئی ہیں، سرکاری اسکولوں میں تعلیم صفر کے درجہ کی طرف جارہی ہے، اساتذہ کی عدم فراہمی اور نظارت وانسپکشن کی کمی نے معیار تعلیم کو ابتر کررکھا ہے، غرض ہم اس ترقی یافتہ دور میں پوری آزادی کے حامل ہوکر بھی غلام ملکوں کی طرح جی رہے ہیں اور یہ عام باشندگان ملک کا حال ہے۔ ورنہ خاص مسلمانوں کی داستان غم والم کی بات اٹھائی جائے تو وہ مستقل عنوان کی محتاج ہے۔ بہرحال ؎

**قیاس کن زگلستان من بہار مرا**

کے مصداق موجودہ ہندوستان کے آئینہ میں مستقبل کے ہندوستان کا چہرہ دیکھا جاسکتا ہے۔

ان حالات اور اس رفتار ترقی کو دیکھ کر بعض دفعہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر

انگریز ہی اب تک ہندوستان کے مقتدر ہوتے تو شائد ملک اس سے زیادہ خوشحال ہوتا۔سوال یہ ہیکہ سامراج کو اتنی قربانیوں اور جان سپاریوں سے ختم کر کے اپنے راج کو قائم کرنے کا پبلک کو پھل کیا ملا؟ اور پچاس سالہ جشنِ آزادی کس بھرتے پر منائی جاوے اور اس کے کیا معنیٰ؟

# کل ہند تنظیم ائمہ مساجد

بہت دنوں قبل مقامی اخباروں کے ذریعہ یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ دہلی میں کوئی "کل ہند تنظیم ائمہ مساجد" قائم ہوئی ہے۔ جو ملک گیر سطح پر ائمہ ومؤذنین سے مربوط ہوگی تو خیال ہوا تھا کہ شاید ائمہ ومؤذنین کی عمومی طور پر جو علمی وعملی بے راہ روی اور زبوں حالی اس زمانہ میں پائی جارہی ہے۔اسکی اصلاح اوران لوگوں کیلئے کوئی مخصوص نصابِ تدریب وتصحیح کے سلسلہ میں غور وفکر کے لئے یہ قدم اٹھایا گیا ہوگا۔لیکن بہت ہی جلد یہ خبر ملی کہ اس کمیٹی نے ملک میں موجود تمام مساجد کے ائمہ کرام کی طرف سے سپریم کورٹ سے استغاثہ کیا ہے کہ ان کے قلیل مشاہرات پر نظر کرتے ہوئے ان کے منصب کے شایانِ شان تنخواہوں کا حکم صادر فرمایا جائے اوراس "مظلوم الامۃ طبقہ" کے ساتھ انصاف کیا جائے، چنانچہ چار سال کی مسلسل پیروی اور جد وجہد کے نتیجہ میں اس تنظیم کی مراد اسطرح برآئی کہ مورخہ ۱۳رمئی ۹۳ء کو ہماری سپریم کورٹ کے مسٹر جسٹس لاماسوامی، اور مسٹر جسٹس آر ایم سائی پر مشتمل دورکنی بنچ نے اس اپیل پر اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ فیصلہ کا متن مختصراً اخباری بیان کے مطابق مندرجہ ذیل ہے۔

اسلام میں امام کا مقام شرعی اہمیت کا حامل ہے۔اور وقف بورڈس اور متولیان مساجد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اماموں کو ایک باوقار زندگی گذار سکنے کے قابل مشاہرہ ادا کریں۔ کیونکہ دستوری آرٹیکل ۲۱ کے تحت ہندوستان کے ہر شہری کو باوقار

زندگی گذرانے کا بنیادی حق حاصل ہے‘‘

اس کے بعد اوقاف کے ذمہ داروں اور متولیانِ مساجد کی طرف سے قلتِ آمدنی کا عذر مسترد کرتے ہوئے انھیں آمدنی میں اضافہ کی صورتیں پیدا کرنے کی ہدایت دینے کے بعد انھیں پابند کیا کہ

” یکم ستمبر ۹۳ء سے (پنجاب وقف بورڈ کے اسکیل کے مطابق) اماموں، مؤذنوں وغیرہ کو تنخواہوں کی لازمی ادائیگی کی جائے ۔یعنی غیر حافظ کو ۸۹۰، حافظوں کو ۱۰۴۵، اور عالم امام کو ۱۱۲۰ روپئے ماہانہ“[1]

کچھ ہی دنوں بعد اخبار کے صفحہ اول پر فوٹو میں دکھایا گیا کہ جناب وزیر اعظم صاحب ملک بھر سے آئے ہوئے ائمہ کرام سے اپنی قیامگاہ پر خطاب فرما رہے ہیں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ایک نمائندہ وفد جناب وزیر اعظم صاحب کی قیامگاہ پر پہنچا اور درخواست کی کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وزیر اعظم قانون سازی کریں۔وزیر اعظم کے خطاب کی چند جھلکیاں آپ بھی ملاحظہ کرلیں خبر کا پہلا جملہ یہ تھا۔

”وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ نے آج ائمہ مساجد سے پرزور اپیل کی ہے کہ وہ سیاسی اغراض کے لئے مذہب کے استعمال کی مخالفت کریں“

اس کے بعد وزیر اعظم نے ائمہ کرام کے مطالبہ کا (جوانہوں نے یادداشت میں پیش کیا تھا) حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ:” ان کی حکومت نے ائمہ مساجد کی تنخواہوں کی ادائیگی کے لئے اسکیم تیار کرنے سپریم کورٹ کے حالیہ حکمنامہ کی روشنی میں ریاستی حکومتوں سے رائے طلب کی ہے۔حکومت سپریم کورٹ کے اس حکمنامہ کو روبہ عمل لانے کے عہد کی پابند ہے.....وزیر اعظم نے کہا ہے کہ ائمہ مساجد کو سماج میں انتہائی اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے اور انہیں معقول تنخواہوں کی ادائیگی ضروری ہے“۔[2]

[1] روزنامہ سیاست ۲۸/جولائی ۹۳ء ، [2] روزنامہ سیاست ۱۸/اگسٹ ۹۳ء

سپریم کورٹ کا فیصلہ عملاً کیسے جاری ہوگا؟ اور وزیر اعظم کا وعدہ کب پورا ہوگا؟ اس سوال کا جواب آنے والا وقت دے گا! البتہ یہ یاد رہے کہ اس ملک کی عظیم تاریخی یادگار "بابری مسجد" کی حفاظت کے لئے "سپریم کورٹ کا فیصلہ بھی تھا" اور "وزیر اعظم کا وعدہ" بھی، مگر اس مسجد کو جو حشر ہوا وہ قارئین کو معلوم ہے............
سر دست آپ ہماری ان گذارشات کی طرف توجہ فرمائے۔

(۱) غور کیجئے کہ ہماری معزز عدالت نے منصفین کے کتنا جامع فیصلہ دیا ہے۔ ایک طرف یہ کہ امام چونکہ دوسرے شہریوں کیطرح ایک شہری ہے اور آئین کی رو سے اس کو پُر وقار زندگی گذارنے کا حق حاصل ہے۔ اس لئے اس کو اگر وہ لیاقت کے اعتبار سے سب سے بڑے درجہ کا (یعنی عالم بھی) ہو۔ تو گیارہ سو بیس روپیہ ماہوار ملنے چاہئیں تا کہ اس ملک میں باوقار زندگی بسر کرسکیں۔

ناطقہ سر بگریباں ہے کہ جو رقم قانوناً کافی نہیں ہوسکتی اور مزدوروں، معمولی نوکریوں اور چوکیداروں کو جو تنخواہ ان کے انسانی وقار اور اسکے استحقاق کے خلاف قرار دیجاتی ہے، افسوس ہے کہ اسی ملک میں اس سے بھی کم اسکیل ان علماء کرام کے لئے مقرر کیا جارہا ہے۔ جو بقول ان کے (اور درحقیقت بھی) اپنے مذہب میں بڑا اونچا درجہ رکھتے ہیں یا حد سے حد یہ کہہ سکتے ہیں کہ سب سے آخری اسکیل کا اہل تسلیم کیا گیا۔

(۲) وزیر اعظم صاحب نے ائمہ کرام سے پُر زور خطاب کرتے ہوئے ان کے مسئلہ کے بارے میں تو کچھ زیادہ نہیں فرمایا۔ البتہ اپنا مسئلہ پوری قوت سے پیش کیا ائمہ سیاسی اغراض کیلئے مسجد کا استعمال کی مخالفت کریں۔ اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس اپیل کے ذریعہ وہ ان خبروں کی طرف اشارہ کررہے تھے، جو ۶ ر ڈسمبر کے بعد کانپور کے متعلق پھیلائی گئیں کہ "ائمہ مساجد لاؤڈ اسپیکر سے اپنی ملت کے

افراد کو اشرار کی سازشوں سے ہوشیار کر رہے تھے" یا بمبئی پولیس کے اس بیان کی طرف توجہ دلا رہے تھے کہ "خطیبوں نے منبر سے قوم کو فساد وانتقام کی تلقین کی" یا ............؟ بہر حال کچھ نہ کچھ ہے جسے پرزور الفاظ کے پس منظر میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ عقلمند کو اشارہ کافی ہے۔

ہمارے قارئین کو اب تو سمجھ میں آسکتا ہے کہ ہمارے دیدہ ور اور روشن ضمیر اللہ والے حکومتوں کی مدد سے کیوں دور بھاگتے ہیں؟ خیر! یہ تو ایک سرسری جائزہ تھا جو ان دو اخباری بیانوں کا ہم نے لیا۔ ویسے ہمیں اس مسئلہ میں نہ اپنے ملک کی سپریم کورٹ سے شکایت ہے نہ وزیر اعظم سے۔ ہمیں ائمہ ومؤذنین کی برادری سے (کہ یہ عاجز بھی اس کا ایک رکن ہے) چند ضروری گذارشات کرنی ہیں۔

(۱) بلاشبہ اس وقت گرانی آسمان سے باتیں کر رہی ہے، اور ہر ایک شخص اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہے، اور بلاشبہ عام سے عام آدمی اس زمانہ میں کئی کئی ہزار روپیہ بآسانی کما لیتا ہے، ایک بیچارہ امام اور موذن ہی ایسا ہے جس کی تنخواہ سینکڑوں سے تجاوز نہیں ہوتی، جبکہ وہ بھی اسی دنیا میں رہتا ہے اور انہی اشیاء واسباب کا محتاج ہے جسکے سب انسان محتاج ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں بھی ہمیں کوئی باک نہیں کہ ائمہ کرام اور مؤذنین عظام کو خاطر خواہ اور ضرورت بھر تنخواہیں دی جانی چاہیے۔ بلکہ جتنی بھی ان کی خدمت کیجائے وہ ان کے مقام کے لحاظ سے کم سے کم ہے اور وہ متولیان اور منتظمین جو ان کی مالی خدمت میں بخل یا لاپرواہی سے کام لیتے ہیں بجا طور ہزار مذمت وملامت کے مستحق ہیں۔

(۲) لیکن خود ائمہ کرام کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ان کا مقام عالی اس قدر نازک اور پروقار ہے کہ انہیں اپنے آپ اس کی جانب متوجہ نہ ہونا چاہیے، امام (اگر وہ عالم ہو) تو بالخصوص نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب اور ان کا وارث ہوتا

ہے۔ اسلئے اسے قناعت پسندی ،مخلوق کے خزانوں سے بے نیازی ،اپنے اس منصبِ جلیل کے ناموس کی حفاظت کے لئے اختیار کرنا چاہیے، حتیٰ کہ اگر حقیقی طور پر یہ بے نیازی واستغناء حاصل نہیں ہوتا تو مصنوعی طور پر ہی سہی ضرور اپنا امتیاز بنا لینا چاہیے اور ہر ایسی چیز سے اجتناب کرنا چاہیے جس سے تملق ، طمع اور ہوس کا اظہار ہو، کیونکہ جو اس مقام کے حقیقی وارث تھے اور محراب ومنبر کے سچے جانشین تھے انہوں نے آپ کو حطام دنیا سے بالکل بے نیاز اور آزاد کر لیا تھا، جس کے نتیجہ میں آخرت تو ان کا مقدر بنی ہی، دنیا میں بھی کچھ ابتلاء وامتحان کے بعد حق تعالیٰ نے انہیں وہ شانِ محبوبیت عطا فرمائی کہ بڑے بڑے جاہ وجلال والے ان کی کفش برداری وخدمت گذاری پر مجبور ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ حضرت غلام علی مجددیؒ جو ایک با خدا بزرگ گذرے ہیں ان کے ہاں بظاہر ذرائع تو کچھ نہیں تھے لیکن ہزاروں مہمان ان کے دستر خوان پر کھایا کرتے تھے، بادشاہ وقت نے ان کے لنگر کے تعاون کے لئے کچھ زمین وقف کر دینے کے لئے اجازت چاہی تو حضرت نے بڑی بے نیازی سے یہ جواب کہلوا دیا۔

**ما ابروے فقرو قناعت نمی بریم**
**با بادشاہ بگو کہ روزی مقدر است**

یعنی ہم اقلیم فقر وقناعت کی عزت بادشاہوں کی مدد لیکر خاک میں ملانا نہیں چاہتے ، بادشاہ سے کہدو کہ روزی مقرر ہے، وہ فکر نہ کریں، ہمارے استاذ حضرت شاہ معظم شہیدؒ کا واقعہ یاد آ گیا کہ انہوں نے اپنی مسجد کے موذن کی خواہش پر کمیٹی سے سفارش کی تھی کہ اس غریب کے "معاوضۂ خدمت" میں اضافہ کر دیا جائے، کمیٹی والوں نے سوچا کہ اسی موقعہ سے مؤذن صاحب کیساتھ امام صاحب کی بھی ترقی کر دیں، جب اگلے مہینے میں حضرت نے اپنے تنخواہ کی رقم زیادہ دیکھی تو پوچھا:

میں نے موذن صاحب کی سفارش کی تھی، اپنی نہیں کی تھی، آپ لوگوں نے میری تنخواہ کیوں بڑھا دی؟ اور خفا ہو کر فرمایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگ غالبًا یہ سمجھے کہ موذن صاحب کی سفارش کے در پردہ اپنی شکایت کر رہا ہے ۔ یہ کہہ کر تنخواہ واپس فرمادی اور اس کے بعد سے پھر شہادت تک مسجد کی خدمات تو اسی طرح انجام دیتے رہے ۔لیکن معاوضۂ خدمات کبھی نہ لیا، حالانکہ کوئی متمول اور مرفہ الحال آدمی نہ تھے ۔

**فقر میں بھی سر بسر فخر وغرور وناز ہو ں میں**
**کس کا نیاز مند ہوں جو سب سے بے نیاز ہوں میں**

یہ ایک آدھ مثال ہے، ہمارے اکابر کی خودداری و بے نیازی کے اسطرح کے ہزاروں واقعاتِ عزیمت ان کی زندگیوں میں ہمیں مل سکیں گے ۔ان مختصر سطروں میں ان واقعات کی گنجائش نہیں ہے، جنھیں پڑھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ایمان بڑھ جاتے ہیں ہمارے بزرگوں نے جن سے آج بھی اللہ کی یہ زمین خالی نہیں ہے، اس طرح اپنے مقام علم وعرفان کی حفاظت فرمائی ہے، جیسے کوئی سونے چاندی کی حفاظت کرتا ہے اور اپنی خودداری پر کسی طرح کا دھبہ آنے نہیں دیا۔

حق تو یہ ہے کہ ''منصب ِ امامت'' کو انہی لوگوں نے پہچانا تھا اور انہوں نے ہی اسکا حق ادا کیا تھا، آج اگر سپریم کورٹ کے غیر مسلم جج یا ہمارے ملک کے وزیرِ اعظم یا دین سے ناواقف متولیان و منتظمین اگر مقامِ امامت سے نا آشنا ہوں تو تعجب کیا؟ خود ہم ائمہ کہلانے والوں کو بھی اپنا مقام یاد نہیں رہا اور چندٹکوں کی خاطر ظالم حکمرانوں کے در کھٹکھٹا رہے ہیں ۔

(۳) بہت سے ائمہ کرام کا تو حال یہ ہے کہ ان کا طرزِ عمل معاشرت، معاملات، اور کردار وعادات مصلیوں کے لئے قابلِ تقلید ہونے کے بجائے دیکھا

جاتا یہ کہ خود مصلیوں کو ان سے اپنا حال بدلنے اور بڑے پن سے رہنے کی ترغیب دینی پڑتی ہے، بلاشبہ مسجد کی کمیٹیوں اور متولیوں کی جانب سے ائمہ کرام اور مؤذنین کی حق تلفی اور ناحق شناسی کا رویہ ضرور قابلِ اعتراض اور اس کی شکایت یقیناً حق بجانب ہے لیکن خود آج کل کے بیشتر ائمہ (الا ما شاء اللہ) کی علمی و عملی کوتاہی، لاپرواہی، فرائض سے تغافل، اور تقویٰ و پرہیز گاری سے دوری حتی کہ شرعی و اسلامی وضع وقطع سے تک محرومی، کیا محلِ اعتراض اور وجہ اعتراض نہیں؟؟؟۔

بہرحال! ہمیں بھی اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے اعلیٰ ترین منصب کیلئے مطلوب صفات سے متصف ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں ہیں تو ان اوصافِ حمیدہ سے اتصاف کی فکر سب سے پہلے کریں۔ اس کے بعد پھر انشاء اللہ نہ کسی دنیوی عدالت میں اپیل کی ضرورت اور نہ ہی عارضی حکمرانوں کے ہاتھ جوڑنے کی حاجت، ہمارا رب خود ہمارے لئے کافی ہے۔ جن کی ہم نیابت کر رہے ہیں، ان کا نعرۂ مستانہ ہر دور میں یہی رہا۔

مَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلاَّ عَلَی رِبِّ الْعَالَمِیْنَ

# سانحہ ندوہ!

۲۲؍نومبر۱۹۹۴ء کو ہندوستان کے معروف ومشہور علمی جامعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک ہاسٹل پر دہلی پولیس اور انٹیلی جنس بیورو کی جانب سے نہایت غیر قانونی انداز میں دھاوا کیا گیا، چند طلباء کی گرفتاریاں عمل میں آئیں، فائرنگ بھی ہوئی، چند طلباء زخمی ہوئے، اور تھوڑی ہی دیر میں اس پورے ڈرامہ کا حاصل یہ نکلا کہ ——— جو شخص انہیں مطلوب تھا وہ مدرسہ میں مل نہ سکا، چنانچہ گرفتار شدگان بھی رہا کردئے گئے وغیرہ ———[۱] اس واقعہ نے ایک طرف جہاں ملک کی سب سے بڑے اقلیت یعنی مسلمانوں کی دل آزاری اور توہین کی ہے وہیں ملک کے تمام اداروں اور راہنماؤں کے وقار ومقام کو بھی مجروح ومنسوخ کردیا ہے۔

"دارالعلوم ندوۃ العلماء" ہندوستان میں کوئی نو قائم شدہ ارادہ نہیں ہے، اسکی کارکردگی، دینی وعلمی، ملی وادبی، اور سماجی خدمات محتاج تعارف نہیں ہیں، نیز اس کے سربراہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم جو نہ صرف ہندوپاک بلکہ پورے عالم میں علمی، روحانی اور دعوتی حیثیت سے اپنا ممتاز ومنفرد مقام رکھتے ہیں اور جنہوں نے اپنی اسی سالہ زندگی (مذہبی ودینی وسیع وعمیق خدمات کے علاوہ) اس ملک کی عزت ووقار کے تحفظ، انسانی اقدار کی بنیادوں پر اتحاد واتفاق کی دعوت، فرقہ وارانہ ذہنیت کی سرکوبی، اور عالمی سطح پر اپنے ملک کی نیک نامی کی سعی میں کھپادی ہے۔ اور جن کی متوازن، معتدل اور نہایت متحمل قوتِ فکر، دوررس وباریک بیں نگہ اور پرمغز وپردرد پیغاموں نے ملک کی سالمیت واتحاد کے کام کو مضبوط بنانے میں موثر ونمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ایسی محسنِ ملک وملت شخصیت کی ذات اور ان کے

[۱] روزنامہ سیاست ۲۳ تا ۲۵؍نومبر ۱۹۹۴ء ،

ادارہ کے ساتھ یہ طرزِ عمل ہر سمجھ دار اور عقلمند شہری کیلئے حیرت انگیز اور تکلیف دہ ہے۔ اس واقعہ نے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ کیا ہماری حکومت اب بھلائی و برائی، وفاداری و بے وفائی میں تمیز کرنے اور دوست دشمن کو پہچاننے کی صلاحیت سے کلیۃً محروم ہو چکی ہے؟ یا اس نے ایک مخصوص طبقہ کے مسلم دشمن الزامات کو تسلیم کر لیا ہے؟ اس حادثہ کے بعد اب صورتحال یہ ہے کہ وزیر اعظم خاموش ہیں، وزیر داخلہ تاویلات کر رہے ہیں، مرکز ریاست کے سر الزام تھوپ رہا ہے، ریاست مرکز کی سازش قرار دے رہی ہے، کانگریسی قیادت اپنے بری ہونے کا اعلان کر رہی ہے، ان تضاد بیانیوں نے حکومت کے موقف کے بارے میں مزید بے اطمینانی و بے یقینی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مملکت کے وزیر داخلہ مسٹر راجیش پائلٹ نے ایک سینئیر عہدیدار کو تحقیقات کا حکم دینے کا اعلان فرمایا ہے، لیکن انہوں نے ہی یہ کہہ کر کہ اس واقعہ میں ادارہ کے ذمہ داروں اور پولیس کے درمیان کسی رابطہ کی کمی رہ گئی تھی، واقعہ کو معمولی اور بے حیثیت نوعیت کا بنا دیا ہے۔ تلافی بھی کی ظالم نے تو کیا کی؟

بہر حال کچھ ہو اس واقعہ نے اہلِ اسلام کو ہم خیال اور ایک آواز بننے میں مدد دی ہے۔ چنانچہ بلا لحاظ مکاتب و مسالک زعماءِ عام اور علماءِ اسلام نے اس واقعہ کی مذمت کی ہے، اور اس قسم کے واقعات کے اعادہ سے بچنے کیلئے سر جوڑ کے بیٹھنے اور متفقہ حل تلاش کرنے کا پیمان کیا ہے، ادھر مسلم پرسنل لاء بورڈ نے بھی اس مسئلہ پر غور و خوض اور کسی لائحہ عمل کی تیاری کا اعلان کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہیکہ وہ ہمارے رہنماؤں کی مدد فرمائیں اور کسی ایسے لائحہ عمل پر متفق فرمائیں جو علماء اور مراکز دینیہ کے مراتب کے بقاء و احترام کے ساتھ ان کے تحفظ و استحکام کا ضامن ہو سکے، اور ملک کے حکمرانوں کو امن و امان کے قیام، شہریوں کے حقوق کے احترام اور تعصب سے پاک حکمرانی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

# سگریٹ، طب اور عقل کی نظر میں

یہ ایک عرب عالم کا تحقیقی مقالہ ہے جس کا انتخاب واختصار اردو دانوں کے لئے پیش کیا جارہا ہے۔

تمام عقل مندوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہر آدمی کا اپنی ذات کے لئے نفع بخش سامان فراہم کرنا اور مضرت رساں چیزوں سے پرہیز کرنا ضروری ہے، یہ ضابطہ آغازِ عالم سے اب تک اسی طرح تمام اہلِ عقل وفہم کے نزدیک مسلّم اور قابلِ قبول رہا اور ہے، البتہ اس بارے میں لوگوں کے خیالات کافی مختلف ہوتے ہیں کہ کونسی چیز نافع ہے اور کونسی نقصاندہ؟ یہ اختلاف علم کی کمی زیادتی اور عقل کی خوبی وخامی کے فرق سے ہوجاتا ہے، چنانچہ بہت سی نفع بخش چیزیں ایسی ہیں جنھیں لوگوں نے اپنی فہم سے مضر سمجھ کر چھوڑ دیا اور اس کے نفع سے محروم ہوگئے۔ اسی طرح بہت سے نقصان دہ سامان ایسے ہیں جنھیں لوگوں نے اپنے لئے نافع سمجھ کر قبول کر لیا مگر انہیں نقصان ہی کا سامنا کرنا پڑا۔ نیز دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا نفع معلوم ہے نہ نقصان! گویا یہ چیزیں نفع ونقصان کے اعتبار سے مشتبہ ہیں، چنانچہ اس بات کی اُس حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”حلال کُھلا کُھلا ہے اور حرام بھی کُھلا کُھلا ہے، البتہ ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ایسی ہیں جنھیں اکثر لوگ نہیں جانتے“ بلاشبہ حلال نافع ہے اور حرام مضر اور ان دونوں کا نافع اور مضر ہونا عام تجربہ سے بھی ثابت ہے، مثلاً کھانے

پینے کی چیزوں میں شہد کا نافع ہونا اور زہر کا مضر ہونا، اسی طرح اخلاق میں مثلاً مہربانی کا مفید ہونا اور بدسلوکی کا مضر ہونا، اس کے برخلاف بہت سی چیزیں ہیں جن کا نفع ونقصان اہلِ علم وخبر کوتو معلوم ہے لیکن عام لوگوں کی فہم ان کے ادراک سے قاصر ہے، ایسی ہی چیزوں میں ایک سگریٹ بھی ہے کہ اس کی حقیقت بہت سے لوگوں سے مخفی ہے، اور وہ اس کے بارے میں اشتباہ کا شکار ہیں، اسی وجہ سے مجھے خیال ہوا کہ اس سلسلہ میں اہلِ علم کے مختلف النوع مباحث کو جمع کردوں تاکہ بات واضح ہوجائے حق کھل جائے اور اشتباہ رفع ہوجائے۔ ذیل میں اسی خیال کی تعمیل کی گئی ہے۔

## سگریٹ کا تاریخی پس منظر

تمبا کو جس طرح آج کل معروف ہے اس شکل میں سب سے پہلے ۱۴۹۲ء میں اس وقت دریافت ہوا جب کہ بعض ماہرینِ نباتات کی "براعظم امریکہ" کی کھوج کے دوران اس کے درختوں پر نظر پڑی، اس کے بعد سولہویں صدی عیسوی میں اس کا سب سے زیادہ پھیلاؤ یورپ میں ہوا، اس کے بعد اس کا چلن ان علاقوں میں بڑھتا ہی رہا، یہاں تک کہ شہنشاہِ برطانیہ "جیمس اول" کا دور آیا، اور اس نے سگریٹ نوشی کے خلاف زبردست مہم شروع کی اور ۱۶۰۴ء میں سگریٹ نوشی کے خلاف اس پر پابندی کا حکمنامہ جاری کیا، پھر ۱۶۳۴ء میں سگریٹ کے خلاف روس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں متنبہ کیا گیا کہ سگریٹ کے خریدنے والے، پینے والے، بیچنے والے کی ناک کاٹ دی جائیگی، اور کوڑے مارے جائیں گے اور دوبارہ مرتکب ہونے کی صورت میں "سیبریا" میں قید کردیا جائیگا، پھر سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ڈنمارک، سوئیڈن، صقلیہ، نمسا اور المجر کی حکومتوں نے قانون جاری کردیا کہ سگریٹ نوشی ممنوع ہے۔

یہ تو مغربی ممالک میں سگریٹ کی تاریخ تھی، بلادِ اسلامیہ کا جہاں تک تعلق ہے تو وہاں دسویں صدی ہجری تک اس کا کوئی رواج نہیں تھا، دسویں صدی کے اواخر میں یہ لعنت ممالکِ اسلامیہ میں داخل ہوئی اور سب سے پہلے عیسائیوں نے اس کو قبول کیا تھا۔

## سگریٹ کن چیزوں سے تیار ہوتا ہے

سگریٹ زہریلے مواد سے تیار ہوتا ہے اس میں صرف نکوٹین ہی نہیں ہوتا جیسا کہ لوگ بتاتے ہیں بلکہ اس میں اور بھی ایسے خطرناک مواد شامل ہوتے ہیں جن کا نقصان نکوٹین سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔کاربن مون اکسائیڈ:- جو زہریلے تاثیر کے لئے معروف ومشہور ہے۔

۲۔بنز وبرین:- جس کے بارے میں اطباء کا اتفاق ہے کہ وہ کینسر کے پیدا ہونے کا اہم سبب ہوتا ہے۔

۳۔نکوٹین:- یہ اس قدر خطرناک زہر ہے کہ اگر ۵۰ ملی گرام کسی کے جسم میں داخل کردیا جائے تو وہ فوراً مر جائیگا۔

۴۔الکحل اور مخصوص پرفیوم:- جو سگریٹ ساز کمپنیاں اس کو نمی سے بچانے کے لئے اس میں شامل کرتی ہیں، جس کا ضرر واضح ہے۔

۵۔تارکول:- یہ بھی شدید خطرے کی چیز ہے اس کے اثرات سے دانت پیلے اور گندے ہوجاتے ہیں مسوڑھوں میں گدگداہٹ اور ضعف پیدا ہوجاتا ہے۔

۶۔خاص قسم کا زہریلا سیسہ:- اس سیسہ کا اثر یہ ہے کہ اگر وہ بدن میں جمع ہوجائے تو اس کے ازالہ کی کوئی صورت اب تک دریافت نہیں ہوسکی ہے۔

۷۔............؟ یہ مادہ پھیپڑوں میں جمع ہوکر انھیں گلا کر شگاف ڈالتا ہے۔

۸۔ہڑتال:- یہ بھی صحتِ جسمانی کیلئے سخت مضر مادہ ہے۔

یہ چند زہر ہیں ان کے علاوہ متعدد مادے ہیں جو سگریٹ نوشوں کی صحت تباہ کرنے کیلئے انہیں سگریٹ کے ساتھ مفت میں حاصل ہو جاتے ہیں۔

## سگریٹ کے نقصانات

☆ محمد عبد الغفار افغانی ایک محقق ہیں، وہ اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ سگریٹ سے بکثرت نقصانات ہیں، عام طور سے ڈاکٹروں نے سگریٹ کے ننانوے نقصانات کا ذکر کیا ہے۔

☆ مصر کے ڈاکٹر صلاح الدین اعضاءِ رئیسہ کے ماہر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سگریٹ نوش جب صبح کو اٹھتا ہے تو اس کی پوری صحت متاثر رہتی ہے، خصوصاً دل کا نظام بگڑا ہوا ہوتا ہے، دورانِ خون میں بے اعتدالی رہتی ہے، جس کے نتیجہ میں آدمی ذہنی تناؤ کا شکار رہتا ہے، اور دماغی رگیں اینٹھ جاتی ہیں، سینہ پر دباؤ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس طرح ہضم کا نظام ناکارہ ہو جاتا ہے، بھوک ختم ہو جاتی ہے، اور اعصابی آلام میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

☆ متحدہ عرب کی وزارتِ طبابت وصحتِ عامہ نے اپنی پانچویں سالانہ کانفرنس میں (جون ۱۹۸۰ء میں جو تیونس میں منعقد ہوئی تھی) ایک قرارداد منظور کی کہ امراض مہلکہ کینسر، پھیپڑوں کی خرابی، حملۂ قلب اور رگوں کی بیماریوں کا سب سے اہم سبب سگریٹ نوشی ہے۔

☆ اردن کی "تنظیم تحقیق وازالۂ کینسر" نے ایک اشتہار جاری کیا جس میں لکھا ہے کہ سگریٹ عصر حاضر کا "عزرائیل" ہے، ایک اور اشتہار میں یہ تجزیہ شائع کیا، سگریٹ = ذبح + جمودِ دم + خون کا دباؤ + کینسر + ؟؟؟ = موت، اسی طرح ایک اشتہار یہ شائع کیا۔ "وہ ہاتھ جو آپ کا سگریٹ جلاتا ہے وہ دوست کا ہاتھ نہیں بلکہ اس دشمن کا ہاتھ ہے جو آپ کے قتل کا خواہاں ہے"

☆ "عالمی تنظیمِ صحت وطبابت" نے ذکر کیا ہے کہ امریکہ میں ہر سال تین لاکھ چھیالیس ہزار آدمی سگریٹ نوشی کی پاداش میں موت کا شکار ہوتے ہیں، برطانیہ میں سالانہ ۵۵؍ ہزار اموات، سویڈن میں ۸ ہزار اور چین میں ایک لاکھ ہزار اموات صرف سگریٹ نوشی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

☆ چین کے ایک دواخانے میں کینسر کے ۶۶۰ مریض رجوع ہوئے جن میں ۹۰ فیصد سگریٹ نوشی کی وجہ سے اس بلائے بے درماں کا شکار تھے۔

☆ سگریٹ نوشی کی وجہ سے مرنے والوں کی تعداد عام حادثات اور سڑک حادثات میں مرنے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں —— خصوصاً —— نوجوانوں کو سگریٹ نوشی کی بری عادت کے ذریعہ زندگی کی نعمت کو برباد کرنے سے محفوظ فرمائے۔ آمین

# تذکیر بعد الرمضان

رمضان المبارک پورے تیس دنوں تک حق تعالیٰ کی رحمتوں مغفرتوں اور مخصوص عنایتوں کی بارش اللہ کے بندوں پر برسا کر مردہ قلوب کو حیات اور غفلت زدہ دلوں کو لاپرواہیوں سے نجات دلا کر رخصت ہوگیا۔ بزرگوں نے اس مبارک مہینے کو "سلوکِ ربانی" کا مہینہ قرار دیا ہے، سال بھر میں ایک مہینے کو ان عنایتوں اور کرم فرمائیوں سے آراستہ کرنے کا منشاء بندوں کو خوابِ غفلت سے جگانا، جذبۂ عبودیت و بندگی کو چمکانا اور پرہیزگاری وخداترسی کا جوہر پیدا کرنا ہے۔ بلاشبہ بڑے سعادتمند ہیں وہ لوگ جو اس ماہ کے نظامِ تربیت سے وابستہ رہ کر ان صفات کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے جن کی اللہ تعالیٰ نے توقع اور مطالبہ فرمایا ہے، اور یقیناً بڑے محروم اور قابلِ مذمت ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی ان مہربانیوں اور بندہ نوازیوں سے بالکل بے خبر اور نفسانی وشہوانی تقاضوں کی تکمیل میں مگن رہے، ان کے لیے رمضان اور غیر رمضان میں کوئی فرق نہیں، عید بھی بس وہ اس کو سمجھتے ہیں کہ نئے کپڑے پہن کر کچھ کھا پی لیں۔ ان دوطبقوں کے برخلاف کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جنہیں اس نعمت کا شعور اور احساس بھی ہے، کچھ کام کی ہمت بھی کرتے ہیں مگر ماحول اور لاپرواہی کا مزاج انہیں اِن مبارک مواقع سے کماحقہ فائدہ اٹھانے نہیں دیتا، شروع اور اخیر رمضان میں کیفیت بدلتے ہیں، کچھ اعمالِ صالحہ بھی کرتے ہیں مگر جوں ہی رمضان رخصت ہوتا ہے یہ لوگ بھی کسی غارِ سُرّ من رأی میں سال بھر کے لیے غائب ولاپتہ ہوجاتے ہیں۔ ان کو اب پھر اگلا

رمضان ہی ڈھونڈ کے لاسکتا ہے، اور کسی کے بس کا روگ نہیں!

اس طبقہ سے خصوصیت کے ساتھ گذارش کرنی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی نعمتِ توفیق سے سرفراز ہیں، ماشاءاللہ اچھے برے کی تمیز بھی رکھتے ہیں، آپ کسی رمضان کے بعد تو یہ طئے کرلیں کہ اب قدم پیچھے نہیں ہٹانا ہے، اور ناقدری وناشکری کا یہ سلسلہ ختم کرکے رمضانی بندگی کے بجائے دائمی بندگی کا مزاج بنانا ہے، کیونکہ ہر رمضان کے بعد ایک بڑے طبقے کی صورتِ حال یہی رہتی ہے کہ چاند کے اعلان کے ساتھ ہی دین اور توفیقِ الٰہی کی ناقدری شروع کردیتے ہیں۔ یہاں تک کہ تیس دن کی اس آسمانی تربیت اور ربانی عنایت کو تیس منٹ تک بھی باقی نہیں رکھ سکتے، آخری رمضان کی مغرب میں مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری رہتی ہے اور عشاء میں نمازیوں کو ترسنے لگتی ہے۔ فالیٰ اللہ المشتکیٰ

اس لیے گذارش ہے تمام برادرانِ اسلام سے کہ ابھی کچھ زیادہ وقت نہیں نکلا ہے، اب بھی پختہ ارادہ کرکے اپنے کو رمضان والی پابندیوں پر قائم رکھنے کی سعی کریں گے تو کامیابی نصیب ہوگی پھر جب پورا سال اسی طرح گذرے گا تب کہیں جاکر اگلا رمضان ترقیِ دین وایمان کا سبب بنے گا، ورنہ کولھو کے بیل کی طرح ہماری حالت جہاں کی وہاں رہ جائے گی، ترقی وتکمیل کا نمبر ہی نہ آئے گا۔ اللہ پاک ہم سب کو اپنی نعمتوں کی قدردانی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

# زمانہ کے فتنوں سے کس طرح بچیں؟

آج کل دنیا کا حال عجیب وغریب ہے، طرح طرح کے فتنے اور قسم قسم کی آزمائشوں سے پوری دنیا خصوصاً ملتِ اسلامیہ دوچار ہے، کہیں امن وامان خطرے میں ہے تو کہیں جسم وجان داؤ پر، عزت وناموس الگ لُٹ رہی ہے، دین وایمان پر علاحدہ حملے ہورہے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر عالم میں یہ ہو کیا رہا ہے؟ اوراس بے ہنگم طوفان وبلاخیز سیلاب سے جس نے انسانوں کے جان ومال گھر بار ہی نہیں بلکہ دین وایمان اور عزت ووقار کو تک مجروح کردیا ہے دنیا کو کبھی نجات ملے گی یا نہیں؟ انسانیت وشرافت کی کھوئی ہوئی عظمت اور گذری ہوئی شوکت کسی وقت لوٹ کر آئے گی بھی یا نہیں؟ یہ وہ سوال ہیں جس نے آج اپنوں، پرایوں، پڑھے لکھوں، اَن پڑھوں، سب ہی کو حیرت میں ڈالدیا ہے اور کسی مدبر وزعیم کے پاس اس وقت اسکا کوئی جواب اور نجات کا راستہ یا تو موجود ہی نہیں یا اگر کچھ ہے تو تجربہ اور گذرتا ہوا وقت اس کے صحیح وکارآمد ہونے کی واضح تردید کرتے جارہے ہیں، اس لئے کہ ہم جو تدبیریں اور شکلیں ان فتنوں سے نجات اور بچاؤ کی سوچتے اور اختیار کرتے ہیں جب انہیں برت کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مفید نہیں بلکہ نہایت مُضر تھیں۔ چنانچہ اسکے نتیجہ میں ہم ع

**مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی**

کے مصداق نظر آرہے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ تمام دنیا کے انسان خصوصاً مسلمان اپنے حالات کا جائزہ لیں، اور مسائل کا حل کسی زعیم ولیڈر کی کاوش

وفکر میں نہیں بلکہ قرآن وحدیث کی روشنی میں تلاش کریں جس کی صداقت وسچائی اور جس کے بتلائے ہوئے فارمولوں اور نسخوں کی واقعیت اور یقینی صحت کو ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخ میں کوئی انصاف پسند جھٹلا نہیں سکا، چنانچہ اس وقت میرے سامنے ایک حدیث شریف ہے جس کو برادرانِ اسلام کی توجہ کیلئے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ترمذی اور دارمی نے امیر المؤمنین سیدنا علیؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: بہت جلد طرح طرح کے فتنے سر اٹھانیوالے ہیں، اس پر حضرت علیؓ نے (اللہ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے) عرض کیا: ان فتنوں سے نکلنے کی تدبیر بھی ارشاد فرمادی جائے کہ کیا ہوگی؟ اسلئے کہ جب زبانِ نبوت نے اس کی خبر دی تو پہاڑوں کا ٹل جانا ممکن ہے مگر ان فتنوں کا واقع نہ ہونا ممکن نہیں، لہذا فتنوں کی اقسام وکیفیات اور ان کی تفاصیل معلوم کرنے کے بجائے ان سے نکلنے اور بچنے کی تدابیر جاننا ہی اہم وضروری تھا، اور یہی حضرت علیؓ کی عقل وعلم فقہ وفہم کا تقاضہ بھی تھا، اسلئے انہوں نے فتنوں کی تفصیل پوچھنے کے بجائے ان سے حفاظت کی صورت معلوم کی، اس کے جواب میں وحی الٰہی کے ذریعہ کھلنے والی زبانِ مبارک نے ارشاد فرمایا: ہر فتنہ اور ہر مصیبت سے بچنے کا واحد راستہ "اللہ کی کتاب ہے" اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں، اس کے بعد آپ نے مزید تاکید کے لئے "کتاب اللہ" یعنی قرآن مجید کی متعدد خصوصیتیں کا ذکر فرمایا۔

(۱) اس میں تم سے پہلے والوں کے واقعات ہیں۔ (جن سے تم اپنے لئے عبرت پکڑ سکو) اور بعد والوں کے حالات ہیں (جن سے تم حصول نفع اور دفعِ ضرر کی پیشگی تیاری کر سکو)

(۲) (اور ہر زمانے کے) موجودہ حالات کے لئے احکامات ہیں۔ (جن کا تم لائحہ عمل بنا کر صحیح نہج پر گامزن ہو سکو)

(۳) وہی فیصلہ کن طاقت ہے ۔(دیگر اقوام کی کتابوں کیطرح قصے ، کہانیوں ، ناولوں اورافسانوں کی لہو کتاب نہیں بلکہ ایک ایسا جامع ضابطۂ حیات ہے ، جو قوموں کی سر بلندی و سرنگوئی کے درمیان اور حق و باطل کے مابین واضح فیصلہ کر دیتا ہے )

(۴) جو کوئی اسے نظر انداز کر دے تو اللہ اسے تباہ کر دے گا ۔( ظاہر ہے کہ جب اس میں نجات منحصر ہے تو کامیابی اسے چھوڑ کر کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟ اس لئے تارکِ قرآن کی تباہی یقینی ہے )

(۵) جو اسے چھوڑ کر کہیں اور ہدایت کا متلاشی ہوتو اللہ اُسے گمراہ کر دے گا ۔ (یعنی جب دوسرا کوئی راستہ ہے ہی نہیں تو دوسرا راستہ ڈھونڈنے والے کو سوائے گمراہی کے اور کیا مل سکتا ہے )

(۶) وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے ۔( کہ اسکے پکڑنے والے ہی فتنوں سے بچ سکیں گے اور بقیہ تمام سہارے تارِ عنکبوت کی طرح کمزور ہیں کہ ان پر اعتماد کرنے والے نامراد ہی ہونگے )

(۷) حکیم ودانا کا تذکرہ ہے ۔(اس لئے اس میں تغیر اور تبدل کی گنجائش نہیں اور قیامت تک بس یہی تذکرہ نجات دہندہ ہے اور اس کی حکمت ودانائی نے ہر زمانہ اور ہر علاقہ کی ضرورت کے موافق امت کو درکار ہدایتیں اس میں رکھی ہیں )

(۸) وہی صراطِ مستقیم کا ضامن ہے ۔( اسی وجہ سے دوسرے تمام نظریات وخیالات بالیقین صراطِ مستقیم سے ہٹانے والے ہوں گے )

(۹) اور وہی حق کی (ایسی کسوٹی ہے ) جس کی وجہ سے اہل ہوا وہوس اپنی گمراہیوں کو پھیلا نہیں سکتے ۔( کیونکہ علماء دین ہر نئی دعوتِ فکر کو کتاب اللہ کی کسوٹی پر کس کے دیکھ لیتے ہیں ، اگر وہ اس کے موافق ہے تو قبول ورنہ رد کر دیتے ہیں ۔

چنانچہ اسی کسوٹی کی برکت سے آج تک باطل کو حق میں گھسنے اور اس کو بدلنے کا موقع نہ مل سکا۔)

(۱۰) اور اس کی برکت سے زبانیں گڈ مڈ نہیں ہوسکتیں۔ (یعنی حق و باطل میں اشتباہ پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتیں)

(۱۱) علماء اسکے علوم و معانی، تحقیق و تدقیق وغیرہ سے نہ کبھی بیزار ہونگے اور نہ سیر ہوں گے۔ (چنانچہ دنیا اس حقیقت کو اچھی طرح جانتی ہے کہ قرآن کریم کے علوم و معارف کا سلسلہ علماء اسلام کی زبان وقلم سے تا ہنوز جاری ہے اور قرآن کریم کے اندر تفکر و تدبر میں اپنی پوری زندگی لگا دینے والا عالم بھی پیاسا کا پیاسا ہی دنیا سے چلا جاتا ہے)

(۱۲) اور نہ ہی اس کی چاشنی بکثرت پڑھنے سے پُرانی ہوگی (بلکہ ہر مرتبہ نئی لذت پائیں گے اور نئے علوم حاصل کریں گے)

(۱۳) اور نہ ہی اسکی ہدایت آمیز، وفیصلہ کن عجائبات کبھی ختم ہوسکیں گی۔

(۱۴) جس نے اس کے حوالہ سے گفتگو کی تو بالکل صحیح کی، جس نے اس کے تقاضوں پر عمل کیا تو بالیقین مستوجب اجر ہوا اور جس نے اس کی جانب اوروں کو دعوت دی تو خود بھی صراطِ مستقیم پا گیا۔

مجھے پوری حدیث کی توضیح وتشریح نہیں کرنی ہے، اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس مبارک حدیث کے لفظ لفظ نے بے شمار علوم کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اور اس اجمال نے تفصیل کے دریا بہا دیئے ہیں۔

مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ محسنِ انسانیت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فتنوں اور پریشانیوں، مصائب وآلام (ارضیہ وسماویہ) میں امت کو نجات کی سبیل اور بچاؤ کی تدبیر کیا دی ہے؟

اس سوال کا معقول اور قابلِ قبول جواب حدیث مذکور کا ایک ایک جملہ دے رہا ہے، دیکھئے! صاف فرمایا جارہا ہے، اپنی عقلوں اور تجربوں سے ان کا فیصلہ نہ کرو، بلکہ کتاب اللہ کو اپنا قائد ورہبر تسلیم کرتے ہوئے اسکے فیصلے کے آگے سرِ اطاعت خم کردو، جیسا کہ امام سیوطیؒ نے "الاتقان" میں حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص قرآن مجید کو اپنے آگے رکھے گا (یعنی زندگی میں اس کی قیادت وہدایت اختیار کرے گا) قرآن مجید اسکو جنت میں پہنچادے گا۔ اور جو شخص اسے اپنے پیٹھ پیچھے ڈال دے گا (یعنی اس کی اطاعت سے پہلوتہی کرے گا اور اس کے احکام کو پس پشت ڈالدے گا) تو قرآن اس کو جہنم میں لے جاکے ڈھکیل دے گا۔

بقول اقبالؔ مرحوم

وہ زمانہ میں معزز تھے تابعِ فرماں ہوکر
تم خوار ہوئے ہو تارکِ قرآں ہوکر

البتہ یہ بات یادرہے کہ قرآن کریم اپنے اعجاز وایجاز کی وجہ سے عام کتابوں کی طرح نہیں ہے، وہ اللہ کا کلام ہے، عام بندوں کی عقل وفہم اللہ تعالیٰ کے کلام کو براہِ راست سمجھنے سے قاصر ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اپنا کلام اپنے پیغمبروں پر نازل کیا ہے، اور ان کو اس کلام کا مبین اور مفسر قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے بارے میں بھی نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو سمجھادیں کہ اس کتاب میں کیا نازل کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے بعد اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آپؐ نے اس کی تبیین وتشریح کا فریضہ انجام دیا ہے، یہ آپ کے تمام ارشاداتِ گرامی —— جنہیں حدیثِ رسول کہا جاتا ہے —— اسی قرآن کریم کی توضیح وتفسیر ہیں۔ اس لئے کلام اللہ سے صحیح معنوں میں استفادہ احادیثِ مبارکہ سے مستغنی ہوکر ہرگز

نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ اس کے خلاف کہتے ہیں وہ کسی اور کے نہیں خود قرآن کریم کے خلاف کہتے ہیں۔ پھر قرآن کریم کی تعلیمات کا ایک حصہ وہ ہے جو تذکیر وموعظت پر مشتمل ہے۔ جسمیں حق تعالیٰ کی قدرت کے بے شمار مشاہدوں اور حسی مثالوں کے ذریعہ اس کی توحید کی طرف دعوت دی جاتی ہے، امم سابقہ کے واقعات کے ذریعہ تصدیق وتکذیب کے عواقب سامنے لائے جاتیہیں، نیز کبھی حکیمانہ اور کبھی حاکمانہ انداز سے مخالفین توحید کو چیالنج کیا جاتا ہے، اسی طرح رسالت اور عقیدۂ آخرت کی صداقت کو ثابت کیا جاتا ہے وغیرہ۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو عقائد واحکام سے متعلق ہے، اس میں اکثر باتیں ایسی ہیں جو ہر شخص بآسانی سمجھ نہیں سکتا، اس کی بڑی تفصیل ہوتی ہے، اوران آیات سے مراد الٰہی کو پانے کے لئے بہت سے علوم میں مہارت ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے عوام الناس کیلئے عافیت وسلامتی کا راستہ یہی ہے کہ وہ قرآن کریم کو علماء دین کی زبانی یا ان کی لکھی ہوئی تفاسیر کے ذریعہ سمجھیں، براہِ راست کچھ عربی سے واقفیت کی بناء پر یا محض ترجموں کے مطالعہ کے ذریعہ قرآن فہمی کی ناکام کوشش کر کے رہے سہے دین کو بھی برباد نہ کرلیں، جیسا کہ اس زمانہ میں ہوتا جارہا ہے۔ یہ ایک خطرناک خوش فہمی ہے جس کی بدولت اللہ تعالیٰ کی کتاب تختۂ مشق اور ہوس پرستوں کا کھلونا بنتی جارہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کتاب اللہ ہی تمام فتنوں سے بچنے کا واحد راستہ ہے بشرطیکہ کتاب اللہ کو احادیثِ نبوی اور علومِ سلف کی روشنی میں علماء امت کے ذریعہ سمجھا جائے، ورنہ ہدایت کے بجائے گمراہی کے راستہ پر چل پڑیں گے۔ کما قال اللہ تعالیٰ ”يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْراً وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْراً وَمَا يُضِلُّ بِهٖ اِلَّا الْفَاسِقِيْنَ“۔

اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کو قرآن مجید کی کما حقہ قدر دانی اور اس کے حقوق کی ادائیگی کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

# احتسابِ زندگی

محرم الحرام کا مہینہ چل رہا ہے، یہ ہمارے اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے، اس سے پہلے ذی الحجہ کا مہینہ گذرا ہے، جو ہماری جنتری کا آخری مہینہ تھا، ہر تاجر سال کے انتہاء پر اپنی کمائی وآمدنی کا جائزہ لیتا ہے، اوراس کی روشنی میں اگلے سال کیلئے حوصلہ وہمت کو بڑھا کر نیا منصوبہ بناتا ہے، حدیث کے مطابق ہم مسلمان بھی آخرت کے سوداگر ہیں، ہماری زندگی کے ایک ایک سال گذرتے رہتے ہیں، نئے سال آتے رہتے ہیں، لیکن ہم لوگ اس قدر بےحس ہوگئے ہیں کہ اپنی تجارت آخرت جس پر ابدی کامیابی کا دارمدار ہے کا کوئی جائزہ لینے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے کہ ہر سال کے اختتام پر دیکھیں کہ ہم نے سال بھر میں کیا کمایا اور کیا گنوایا؟ قرآن کریم نے ہماری صورتحال کی بالکل واضح تصویر کھینچی ہے:

**اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ مَا يَأْتِيْهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ۔**[1]

لوگوں کا حساب قریب آگیا ہے اور وہ غفلت میں پڑے اعراض کئے ہوئے ہیں، ان کے پاس جب کبھی ان کے رب کی طرف سے کوئی تازہ بات پہونچتی ہے تو اسے لاپرواہی سے سنتے ہیں، اس حال میں کہ ان کے قلوب لغو ولایعنی میں مشغول رہتے ہیں۔

گو نزول کے اعتبار سے یہ آیت بےایمانوں کی شان میں نازل ہوئی ہے، مگر شامتِ اعمال سے اب خود ہم مسلمانوں کی حالت اس منظر کی بھرپور مصداق بنی

[1] سورۂ انبیاء:۱،

ہوئی ہے، اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنا جائزہ لیں، اور دیکھیں کہ گذشتہ پورے سال میں ہم نے اپنے دین وایمان کی ترقی کیلئے کیا کیا؟ ہماری زندگی میں اور ہمارے گھر کے ماحول میں اور ہمارے اہل وعیال میں، معاملات ومعاشرت میں، اخلاق وعادات میں فکر آخرت میں کیا ترقی ہوئی؟ بڑوں نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ مومن کے دو دن ایمان کے اعتبار سے برابر نہیں ہوتے، یعنی اس کا ایمان روزانہ ترقی پذیر ہوتا ہے، اور ہمارا حال یہ ہے کہ دن چھوڑئے پورا پورا برس گذر جاتا ہے مگر کولھو کے بیل کی طرح جہاں کے وہی رہتے ہیں شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ۔

چہل سال عمر عزیزت گذشت
مزاجِ تو از حالِ طفلی نہ گشت
ہمہ باہوا و ہوس ساختی
دمے بامصالح نہ پرداختی

یعنی میری پیاری وقیمتی زندگی کے چالیس سال گذر گئے، مگر تیرا مزاج اب بھی بچپنے کی نادانیوں ہی کی طرح ہے، پوری کی پوری عمر ہوا وہوس کی نذر کر دیا، صلاح وفلاح کے کاموں میں اس میں سے کچھ بھی وقت نہ نکال سکا۔

بہرحال عمر گذرتی جارہی ہے، اور غفلت بھی بڑھتی جارہی ہے، حالانکہ اسلامی سال کا آخری مہینہ خانوادہ خلیلؑ کی خداپرستی اور ایثار وقربانی کی روشن تاریخ کی یاد دلاتا ہے تو اس کے بعد آنے والا پہلا مہینہ جگر گوشہ بتول ریحانۃ الرسولؐ حضرت حسینؓ اور ان کے افرادِ خاندان کی مذہبِ اسلام کی سربلندی اور حق کی ترقی کی کوششوں میں تن من دھن کی بے لاگ و بے باک قربانی کے واقعات کو تازہ کر دیتا ہے۔ گویا ذی الحجہ میں خود سپردگی اور قربانی کی مشق کر لینے کے بعد محرم میں عالی حوصلگی و پامردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر نئے سال کو ایک روشنی وتابنا کی

دی جاسکتی ہے، اس طرح ہر سال پچھلے سال کے مقابلہ میں تجارت آخرت کو کامیاب و بے خسارہ بنالینے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ مگر ؎

**وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا**

**اور کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا**

بہر حال ہم سب ارادہ کریں کہ ہمت وحوصلہ کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے اور پیہم وانتھک کوشش کے ذریعہ ایک دفعہ پھر مثالی اسلامی ماحول تشکیل دے کر دم لیں گے، اگر ہم ارادہ پختہ کر کے کام شروع کر دیں تو کوئی بڑی بات نہیں کہ ایسا ہو جائے۔

**وما ذالک علی اللّٰہ بعزیز**

# آہ! یہ ہمارے اسکول اور مدرسے

مدارس عصری ہوں کہ دینی انہیں علم و ہنر کے ساتھ تربیت اخلاق کا مرکز ہونیکی حیثیت حاصل ہے چنانچہ مشہور ماہر تعلیم ملک سردار علی خان سابق ریڈر جامعہ عثمانیہ ٹریننگ کالج اپنی کتاب ''اصول تعلیم'' حصہ اول میں نصاب کی تکمیل کا عذر کر کے تربیت سے پہلو تہی کرنے والوں کا رد کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''مدرسہ اپنے جس ضروری فریضہ سے پہلو تہی نہیں کر سکتا کہ اپنی عمدہ تربیت کے ذریعہ بچوں کو مفید اور پسندیدہ عادات کا خوگر کرنے اور انہیں نیک سیرت بنانے کا فریضہ بے شک مدرسہ پر عائد ہوتا ہے۔''[1]

اسی طرح صدرالمہام نواب مہدی یار جنگ بہادر کے بقول: ''میرے نزدیک تعلیم کا مقصد انسان بنانا ہے کہ انسان ہی ہر ایک کمال کو پیدا کر سکتا ہے اور ہر ایک کام کو انجام دے سکتا ہے''۔[2]

یہ تحقیق علوم عصریہ کے ماہرین کی انہی علوم کے مدارس سے متعلق ہے تو وہ مدارس جو علوم قرآن و سنت کے لئے خاص ہیں ان میں تربیت اخلاق و سیرت سازی کی جس قدر اہمیت ہوگی وہ ظاہر ہے۔ لیکن تعلیم و تربیت کہنے میں جس قدر سہل اور ہلکے الفاظ ہیں عملاً اسی قدر مشکل کام ہیں۔ جس کے لئے علمی قابلیت کے علاوہ تربیت کی اہمیت بھی ضروری ہے۔ اسی لئے معلم کے اندر خصوصاً نیت کی تصحیح، اغراض عارضیہ اور منفعت عاجلہ کی مقصودیت سے اجتناب، زیر تربیت و تعلیم افراد کی کمی و کوتاہی پر رحم و ترس کا مزاج، شفقت و مہربانی، عفو درگذر، حلم و بردباری،

---
[1] اصول تعلیم: ۲۴، [2] ایضاً مقدمہ

کثرت افہام وتفہیم ،عمروں اور مزاجوں کی رعایت ،متعلّم کے مزاج سے واقفیت اوراس کی نفسیات کا غایت درجہ لحاظ۔ان میں کمال پیدا کردینے کا انتہائی شوق اور بار مسؤلیت کا ہمہ وقت احساس ، انکے ساتھ حسن معاملت اور ان کے سامنے ہر نامناسب کلام وکام سے حتی المقدوراحتراز وغیرہ امور قابل ذکر ہیں۔مدارس کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ اوراس قسم کی دوسری صفات ہیں جن کا معلمین کے اندر پایا جانا انتہائی لازمی وضروری ہے۔

لیکن اس زمانہ میں جہاں تمام شعبہ ہائے حیات میں تغیر وانقلاب آیا ہے اور ساری کی ساری سرگرمیاں نام ونمود ،مسابقت باہمی ،منفعت عارضی ،تحاسد و مخالفت جیسے دنی مقاصد کے شکار یا پھر لامقصدیت یعنی دفع الوقتی اورضابطہ کی خانہ پری جیسے سخت نامناسب جذبات وخیالات کے تابع ہوکر بےفیض و بےنتیجہ ہوتی جارہی ہیں۔ وہیں بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ملک کے مدارس ومکاتب جودرحقیقت پوری مملکت جواس کے تمام شعبہ جات میں انسانیت کے علمبرداراورقوم ووطن کےوفادارسپاہی فراہم کرنے کےضامن ہیں وہ بھی اب پیشہ معاش اور ذریعہ روزگار سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے ۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پورے ملک کے خانگی وسرکاری ادارے نیز انسانیت کی اجتماعی زندگی ،ایسے جرائم ورذائل کا شکار ہوگئی ہیں۔جن کا تذکرہ طویل بھی ہے اوراذیت ناک بھی۔خدارا غورفرمائیے ! کیا حال اس قوم کا ہوگا جس کا ایک بچہ جب اس دنیا میں جنم لیتا ہے اورآنکھیں کھولتا ہےتو اسے اپنے اطراف واکناف میں بےحجابی وبرہنگی ،شہوت انگیز گانے اورموسیقی ،فحش تصاویروسنیما بینی ،اختلافات وخانہ جنگی ،جھوٹ مکراور دھوکہ دہی اور ایسے ہی انسانیت سوز مناظر پر مشتمل ماحول ( افرادواسباب ) نظر آتا ہے اسی میں زندگی کی ابتدائی منزلیں طے کرتا ہے،جس میں لاشعوری طور پر

اس کی فطرت مسخ و متغیر ہوتی رہتی ہے اور جب لاشعوری سے شعور اور ادراک کی منزل میں قدم رکھتا ہے، تو اسے ''اسکول'' نامی ایک ماحول میں بھیجا جاتا ہے جہاں پہنچ کر اسے —— آج کے ماحول میں —— گھر سے کچھ زیادہ ہی برائیاں نظر آتی ہیں۔ اور آگے بڑھ کر جب کالج میں پہونچتا ہے تو وہ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ چین کا سانس لیتا ہے کہ کل تک گھر اور اسکول کے ماحول میں جن مناظر کو دیکھ کر اس کا دل مچل جایا کرتا تھا مگر وہ اپنی عاجزی و بےبسی کے آگے ہار جایا کرتا تھا ان کرداروں کو بذات خود عملی جامہ پہنانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ اس لئے کہ ''نسوانی آزادی'' اور ''وحشیانہ مساوات'' کے اس دور میں جب ہائی اسکولز اور کالجس میں تک میک اپ فیشن اور ظاہری سجاوٹ وٹپ ٹاپ سے آراستہ و نیم برہنہ خواتین ''مسند تعلیم و تربیت'' پر متمکن ہونگی تو سامنے بیٹھے ہوئے وہ نوجوان اسٹوڈنٹس جن کا خون گرم جذبات سے مشتعل اور شہوانیت و نفسانیت طوفان انگیز ہو، وہ —— خدا اس روشن خیالی اور نسوانی آزادی کے روپ میں آنے والی بےحیائی بلکہ حیوانیت کا منہ کالا کرے —— لکچرر کا لکچر سنیں گے یا.....؟ ان سے تہذیب سکھیں گے یا.....؟ یہ صورتحال ہے عام مدارس کی خواہ وہ گورنمنٹ نظم و نسق کے تحت ہوں یا پرائیویٹ منیجمنٹ کے تیئں ایسے حالات میں ملک بھر میں بےچینی، بدتہذیبی، عریابیت، فواحش و جرائم، قتل و غارت گری، تعصب و تحزب جیسے ہلاکت خیز وانسانیت سوز واقعات جس قدر بھی پیش آئیں وہ کم ہیں اس سلسلہ میں ان مدارس کے ناخداؤں کو دعوت اصلاح دینا ''جوئے شیر'' لانے سے کم نہیں اور اگر دی بھی جائے تو اس کی حیثیت ''صدا بصحرا'' سے زیادہ نہیں۔ اس کے باوجود **معذرة الی ربکم ولعلهم یتقون** کے مصداق جن نگاہوں سے یہ سطریں گذر رہی ہیں ان سے گذارش ہے کہ وہ اس میدان میں کسی بھی خدمت کی اہلیت رکھتے ہوں وہ اس سے دریغ نہ

کریں یا کم از کم دعا ہی کا اہتمام کریں کہ خدا تعالیٰ جس صورتحال کی اصلاح اپنی قدرت سے فرمادیں۔آمین

جہاں تک مدارس دینیہ اسلامیہ کا تعلق ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے، یہ کہتے ہوئے کہ ان میں بھی تعلیم کو بہتر سے بہتر اور مؤثر بنانے کی بہت کچھ کوششیں اور تجربے تو ہورہے ہیں۔لیکن تربیتی پہلو (اصلاح اخلاق و اعمال) ہر دن تنزل پذیر ہے (الا ماشاءاللہ) یہاں کے طلباء میں بھی سادگی کے مقابلہ میں فیشن (میں طہارت اور نظافت وصفائی وسلیقہ کا مخالف نہیں ہوں) اور عاجزی کے مقابلہ میں تکبر (مثلاً غیراسلامی بال اور ٹخنوں سے نیچا پائجامہ اور اکثر و بیشتر جسم سے چمٹا ہوا لباس منورات (اعمال نافلہ، ذکر، تلاوت، تہجد، مطالعہ اسلامیات) کے مقابلہ میں مہلکات ولایعنی (ٹی وی، میاچس ناولوں وغیرہ) سے ذوق بڑھتا جارہا ہے۔اور بھی بہت سی کمیاں اور خرابیاں ہیں جو مدارس دینیہ اسلامیہ میں کم وبیش ہر جگہ پائی جانے لگی ہیں۔ حاصل ان کا بس یہی ہیکہ کہ ان میں تعلیم وتحقیق کے میدان پر جس درجہ محنت کی جارہی ہے۔تربیت اعمال اور اصلاح اخلاق کی جانب سے اسی قدر چشم پوشی، پہلوتہی اور اعراض سے کام لیا جارہا ہے۔نتیجہ اس کا یہی ہیکہ کہ اہل علم پر سے عوام کا اعتماد اٹھتا جارہا ہے اور علم وعمل کی قدریں عوام کی نظروں سے گرتی جارہی ہیں۔جو جرائم مدارس غیراسلامیہ سے پھوٹ رہے ہیں، اختلاف نوعیت کے ساتھ وہی ہمارے مدارس اسلامیہ سے بھی نکل رہے ہیں۔وہاں شہوت ومال کو مقصدیت حاصل ہے یہاں شہرت وجاہ کے پیچھے دوڑا جارہا ہے،قوم سے ہمدردی، ملت کا غم مسلمانوں کی اصلاح کا فکر، غیرمسلموں کو دعوت کا احساس، خدا کے بندوں کے بگاڑ کا درد، ممالک اسلامیہ کی تباہی وبربادی کا ملال، رونا گڑگڑانا، خدا سے لولگانا اور دنیائے دنی سے نفرت، آخرت اور اس کے سنوارنے والے اعمال سے رغبت،

اعمال خیر میں عوام الناس سے سبقت، زندگی میں سنن عادیہ وعبادتیہ کا اہتمام، ظاہر وباطن میں صالحیت کا التزام، مدارس دینیہ اسلامیہ کہ یہ ثمرات اب تحریر وتقریر کا موضوع ہوں تو ہوں، میدان عمل میں تو خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ بقول حصرت خواجہ صاحبؒ

اے　میرے　باغ　آرزو!
کسیا　ہے　اے　باغ　تو
کلیاں　تو　ہیں　چہار　سو
مگر　کوئی　کلی　کھلی　نہیں

یا پھر انہی کے بقول ؂

دل　میں　لگا　کے　ان　کی　لَو
کردے　جہاں　میں　نشرِ　ضو
شمعیں　تو　جل　رہی　ہیں　سو
بزم　میں　مگر　روشنی　نہیں

اس صورتحال کی وجوہات کا پتہ مجھ جیسا بے مایہ کیا لگا سکتا ہے۔ اہل علم حضرات ہی سر جوڑ کر اور اسے وقت کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھ کر غور فرمائیں تو ضرور پتہ چلا سکتے ہیں۔ البتہ حضرت العلامہ سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ فرمان اس سوچ میں ضرور ممد ومعاون ہوگا کہ آپ نے حصرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا! ''علی میاں مدرسہ کے اس بگاڑ اور طلباء کی ان اخلاقی گراوٹوں کا سبب بس یہی ہیکہ اب ان کے درمیان کوئی آئیڈیل نہیں جنہیں دیکھ کر طبعیتیں متاثر ہوں اور زہد وتقوی سے علم وفضل کے وزن جو بڑھا سکیں اور انہیں بااثر بنا سکیں۔

قصہ مختصر یہ کہ جو صراحی میں ہو وہی پیالہ میں آئیگا کے مدنظر ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس دینیہ اسلامیہ کے ماحولوں کو اسلامیانے اور مغرب کے چھاؤں تک سے اسے بچائے رکھنے کی از حد فکر کی جائے۔ان وجوہات کا پتہ چلایا جائے جو مدارس کے معاشرہ کی تباہی کا ذریعہ بنے ہیں۔پھر انہیں ختم کرنے کی فکر کی جائے۔ان اسباب کو تلاش کیا جائے جو ماضی میں مدارس دینیہ کی تابنا کی اور ضوفشانی کا وسیلہ تھیں پھر انہیں رائج کیا جائے۔اور تربیت کے معاملہ میں یہ بھی غنیمت ہے کی پالیسی عوام کو دیدی جائے اور اپنے لئے یہ بھی کم ہے کو اختیار کیا جائے۔

ان سطروں کے لکھتے وقت الحمداللہ میں نے اپنی حیثیت ناقصہ کو اوجھل ہونے نہیں دیا ہے صرف بحیثیت ایک دینی مدرسہ کے ذمہ دار کے جو فکریں ذہن میں تھیں ان کا اظہار کر دیا ہے۔اس امید پر کہ دینی مدارس کے آغاز کے اس موقعہ پر ان کے ارباب حل وعقد اپنے ایک خادم کی ان معروضات پر توجہ فرمادینگے۔

# عازمین حج سے چند گذارشات!

## نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

الحمد للہ! عازمین حج بسہولت وآرام بلد اللہ الامین "مکہ مکرمہ" پہنچ کر حج وزیارت اور عمرہ وطواف کی مبارک ومسعود ولافانی سعادتوں سے مشرف ہو چکے ہیں، ان کی واپسی کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے، بلکہ اس شمارہ کے شائع ہونے تک تقریباً حجاج کرام اپنے اپنے گھروں کو پہنچ چکے ہوں گے، جی چاہتا ہے کہ ان محترم ومبارک ہستیوں کی خدمت میں مبارکبادی کے ساتھ چند گذارشات پیش کروں، امید ہیکہ اس مخلص خادم کی آوازِ دل گوشِ دل سے سنی جائیں گی۔

الف: حج اسلام کا تکمیلی رکن اور بندگی کی مخصوص ونرالی شان ہے اس کے مناسک وارکان کا تعلق عقل سے کم عشق سے زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ نے بندہ کے اندر جہاں عقل وعلم کی نعمت رکھی ہے وہیں عشق ومحبت کی دولت سے بھی اس کی کائنات قلب کو مالا مال کیا ہے، حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوجانے کے بعد یعنی دولتِ ایمان مل جانے کے بعد بندہ کے اندر مولائے کائنات وخالق موجودات کے حضور ایک تو نیازمندی وبندگی کے عقلی وعلمی جذبات بیدار ہوتے ہیں، جن کی تکمیل کے لئے نماز، زکوٰۃ، جہاد، اور دعوت جیسی عبادات ودیگر احکامات عطا ہوئے، دوسرے اس کے اندر اپنے مولا ومعبود کی محبت ووارفتگی کے احساسات وکیفیات موجزن ہوتے ہیں، ان کی تسکین کے واسطے روزہ اور حج جیسی عبادات مشروع ہوئیں، اور حقیقت واقعہ یہ ہیکہ اس عمل کے ذریعہ ایک بے قرار دل کو جو قرار وتسکین حاصل ہوجاتی ہے اور قلب وجان کو جو سرور وسکون مل جاتا ہے وہ کسی نعمت ولذت سے نہیں

مل سکتا، اسکا اندازہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس نعمت سے مشرف کئے گئے ہیں۔

ب: حج کی فرضیت کا ایک نصاب ہے، اس کے مالک ہونے پر شرائط شرعیہ وقواعدِ فقہیہ کے مطابق پوری زندگی میں ایک دفعہ حج فرض ہوتا ہے، (نفل کیلئے تو حسبِ حیثیت وگنجائش کوئی تعداد مقرر نہیں ہے) اور جب حج فرض ہو جائے تو اس کی ادائیگی واجب ہے، تاخیر بلا عذر شرعی کے جائز نہیں، حتیٰ کہ اگر بلا عذر شرعی تاخیر کرتا رہا اور اسی طرح بغیر حج کئے مر گیا تو بہت بڑا مجرم ہے۔ بلکہ ـــــ العیاذ باللہ ـــــ سوء خاتمہ کا بھی اندیشہ ہے، اس سب کے باوجود تجربہ ہیکہ بہت سے اہل سعت وسکت حضرات اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہیں اور بہت سے خستہ حال و بے اسباب اربابِ ہمت ومحبت والہانہ وعاشقانہ چلے آتے ہوئے نظر آتے ہیں، اسکی وجہ کیا ہے؟ بظاہر مجھے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ حق تعالیٰ کا بہت بڑا دربار اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شب وروز کی محنتوں کا میدان ہے، نیز اللہ تعالیٰ کے خلیل ابوالملت حضرت ابراھیم علیہ السلام اور ان کے مبارک خوانوادہ کی ایثار و قربانی ومحبتِ الٰہی کی یادگار! اسطرح گویا وہ تجلیات الٰہی کا ایک مخصوص حد بند علاقہ ہے، یہاں پہونچنے کے ضروری ہونے کا نصاب ایک علاحدہ چیز ہے اور یہاں حاضری کی سعادت کی اہلیت ایک دوسری چیز ہے، تجربہ یہی ہوا کہ حق تعالیٰ عموماً انہی لوگوں کو اذن باریابی واجازت حضوری عطا فرماتے ہیں جن کے دل میں ولولہ وشوق اور مخلصانہ تڑپ وطلب پائی جاتی ہے، یا وہ کریم ذات محض اپنے لطف وکرم سے کسی بندہ کی حاضری کا ارادہ فرماتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ باوجود اچھی خاصی سکت رکھنے کے ابھی تک محروم حضوری ہیں اور بعض بے چارے بے سروسامانی کے باوجود بار بار مستانہ وقلندرانہ حاضری دیتے رہتے ہیں۔

بہرحال جو کچھ ہو یہ حجاج کرام کیلئے بڑی خوشی ومسرت اور جذبات قدر وتشکر

کو رحمٰن کی خدمت میں نچھاور کرنے کا موقع ہے کہ اس نے محض اپنے فضل وکرم سے آپ حضرات کیلئے اس سال حضوری دربار اور وصولیٔ کیفیات وانوار کا موقع فراہم کیا، آپ حضرات امن وامان، سکون واطمینان کے ساتھ تمام مناسکِ مبارکہ کی تکمیل کر کے بحفاظت وسلامتی اپنے اپنے گھر واپس ہو چکے ہیں۔ جو

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

کا واقعی مصداق ہے، حق تعالیٰ اس کی برکات کو عام وتام فرماویں۔ آمین

ج: اب جبکہ اس نعمتِ عظمیٰ سے سرفرازی ہو چکی ہے، بڑی ذمہ داری آپ پر یہ عائد ہوتی ہے کہ اس نعمت کی قدر اور اس کا حقیقی شکر ادا کیا جائے، اور وہ یہ ہے کہ اس عظیم محسن اور کریم منعم کی ادنی نافرمانی وحکم عدولی سے ساری زندگی بچتے رہنے کا پختہ ارادہ کر لیا جائے کہ جس نے بلا کسی استحقاقِ ذاتی کے محض اپنے کرم سے ہمیں بلا کر اپنا مہمان رکھا اور وہ عزت افزائی فرمائی کہ جس کا تصور بھی مشکل تھا، ہر چند کے بندہ بعض دفعہ مغلوب النفس ہو کر کسی نہ کسی معصیت کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر عزمِ مصمم اور حوصلہ بلند ہو تو ترک معصیت یا کم از کم انکی تقلیل پر حق تعالیٰ بہت حد تک قابو نصیب فرما دیتے ہیں۔ کمی صرف اپنی پختگی عہد اور درستگیٔ ہمت کی ہوتی ہے، اس لئے پختہ عہد وارادہ کر لیا جائے کہ وہ آنکھیں، جو تجلیاتِ الٰہی مقاماتِ مقدسہ اور انوارِ ربانیہ کے دیدار سے منور ومشرف ہو چکی ہیں اب کبھی بھٹکنے اور غلط جگہوں پر پڑنے نہ پائیں گی۔ وہ کان، جو عاشقانِ خدا ورسول کی مبارک زبانوں سے ذکر وصلوٰۃ کی کیف آور وروح پرور آوازیں اور کعبۃ اللہ کے روبرو یا محبوب دوجہاں کے بازو ٹھیر کر نمازوں میں کلام ربانی پڑھنے والوں کی اثر انگیز آوازوں کو سننے میں مشغول رہے اب انہیں غیبتوں، بہتانوں، گانوں اور لایعنی باتوں کے سننے میں لگنے نہ دیں گے۔ وہ زبان، جو اتنے دنوں تک تلبیہ، تذکرہ

وتلاوت کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول نہ رہی اور پاکیز گی حاصل کر چکی ہے اس کو پھر سے اپنی بدعملیوں کا شکار ہوکر ناپاک وگندی ہونے نہ دیں گے۔ وہ قلب و ذہن، جو بے راہ روی، خودسری وانانیت سے خالی ہوکر بندگی وخودفراموشی اورعبدیت کے جذبات سے معمور رہنے لگے تھے انھیں اپنے ماحول ومصروفیات میں پہونچ کر دوبارہ زیغ وضلال اور غیراللہ کی محبت کی گندگیوں سے آلودہ ہونے نہ دیں گے۔

عبادات کا جو ذوق وشوق وہاں پیدا ہوا، اور ذکر وتلاوت کی جو لذت وہاں جاکے آپ نے پائی، جو محبت اور والہانہ تعلق کی دولت اللہ اور اس کے رسولؐ کے دروں پر آپ کو میسر آئی، انسانیت کے ساتھ جو رواداری، ملنساری، محبت و بھائی چارگی اور صبر وضبط کا مزاج آپ کا بنا یہ اور ان جیسی تمام خوبیاں جو اس سفر میں حاصل ہوئیں۔ یاد رکھئے! وہی اس مبارک سفر کے یادگار وقابل قدر منافع ہیں۔ اب ان کی حفاظت وصیانت آپ کی ذمہ داری ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان دولتوں کا دشمن وحاسد شیطان انھیں ہمارے اندر سے چُرا نہ لیجائے۔ اور ہم اس دولتِ عظمیٰ سے محروم نہ ہو جائیں۔ **نعوذ باللّٰہ من الموبقات والمھلکات**

د: نفس وشیطان ہرآن ہرلمحہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح بندہ کو اعمالِ صالحہ سے محروم رکھیں، اور اگر وہ ان سے مقابلہ کر کے توفیقِ الٰہی سے اس عمل کے کرنے کا پختہ ارادہ کر ہی لیتا ہے تو کوشش کرتے ہیں کہ ریا کاری یا بدعات ورسومات کے ذریعہ اس عمل کو قبولیت سے محروم کر دیں۔ اور اگر اس میں بھی ناکام ہو گئے، اور اس شخص نے اہتمام واخلاص کے ساتھ کسی عمل کو انجام تک پہونچا ہی لیا تو اب ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کم از کم آخر درجہ میں اس کو اس عملِ صالح کی برکات سے محروم کر دیں، چنانچہ ایسی غفلت اور فریب میں مبتلاء کر دیتے ہیں کہ وہ شخص اس عمل کو کر کے بھی اس کے نیک انجام سے مستفید ہونہیں پاتا، پھر وہ عمل

جیسا عظیم ہوتا ہے ان کی سازش بھی اتنی ہی سنگین ہوتی ہے۔

حاصل یہ کہ آخرت کے فکر مندوں کو اعمالِ صالحہ کی جد و جہد کے سلسلہ میں تین مقامات پر نفس وشیطان کے مکائد سے خاص طور پر چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، عمل سے قبل، عمل کے دوران، اور عمل کے بعد! ورنہ کہیں نہ کہیں ان کی عملی جد وجہد اُن کی طاغوتی قوت سے ٹکرا کر برباد ہو جا سکتی ہے، اور ہوتی رہتی ہے ؎

نفس و شیطان دونوں ہیں خنجر در بغل
وار ہونے کو ہے اے غافل! سنبھل
آ نہ جائے دین و ایمان میں خلل
ہوشیار! ہاں ہوشیار! اے بدعمل

اسلئے حجاج کرام سے ایک گذارش یہ بھی کرنی ہے کہ حج کی عظیم نعمت کی جو کافی وقت اور خطیر سرمایہ کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے حفاظت کی فکر بھی کریں، اور وہ یہ ہے کہ حج کے بعد کی زندگی میں ماقبل کی زندگی کے مقابلہ میں دینی اعتبار سے نمایاں تبدیلی اور اس پر استقامت کیلئے مسلسل فکر مند رہیں۔

ہ: اور آخری گذارش یہ ہیکہ اس وقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب امت اور اس کا معاشرہ اسلامی خطوط سے ہٹ کر عالمی بگاڑ کی راہ پر تیزی سے دوڑنے لگا ہے۔ اس سماج کی ——— جس کے ہم خود ایک فرد ہیں ——— اصلاح ودرستگی کی فکر ہر مسلمان کا شرعی واخلاقی فریضہ ہے۔ خدا کے واسطے آپ بھی اپنے علاقہ کے علماء کرام کی رہبری ومشورہ سے اس کام کو شروع کریں۔ اور پہلے سے ہو رہا ہے تو اس میں شریک ہو جائیں کیوں کہ اس وقت سماج کو منکراتِ شرعیہ کی لعنت سے نکالنے کا کام سب سے اہم کام بن گیا ہے۔

واللّٰہ ولی التوفیق وھو الھادی الی سواء الصراط

# لا تھنوا ولا تحزنوا

مسلمانوں کی دل آزاری وجگر خراشی ،مغربی میڈیا کا آج کل پسندیدہ مشغلہ بن گیا ہے،آئے دن اخبارات کے ذریعہ یا تو کچھ ایسی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں جن میں انہیں فتنہ گر، دہشت گرد، امن کا دشمن، اور ظالم ومجرم دکھلایا جاتا ہے، یا پھر کسی ایسی حرکت کی اطلاع دی جاتی ہے جو مسلمانوں کے دین اور شعائر اسلام کی توہین پر مبنی ہوتی ہے ، یا دنیا کے کسی نہ کسی مقام پر ان پر ہونے والے مظالم اور ان مظلوموں کی بے بسی و بے کسی کے مناظر کو پیش کیا جاتا ہے، حاصل یہ ہے کہ کوئی صبح اور کوئی شام ایسی نہیں جو دل آزاریٔ مسلمین کے واقعات اور خبروں سے خالی ہو، مذہبی راہنما، عالمی قائدین، سیاسی لیڈرز، عدالتوں کے جج اور لائرز، فلمی ایکٹرز، مصنوعات کے ڈیزائنرز سے لیکر ادبی وثقافتی قلمکار، یا اخباروں کے ایڈیٹرز اور کالم نگار تک ہر طبقۂ سماج سے تعلق رکھنے والوں کی زبان وقلم سے کچھ نہ کچھ سامنے آتا ہی رہتا ہے، پھر اگر یہ بات باتوں باتوں میں رہ گئی تو رہ جاتی ہے اور اگر موضوع بحث بن گئی تو پھر کسی تاویل یا وقتی معذرت کے ذریعہ دبا دی جاتی ہے۔ فلمی دنیا تو بالخصوص اس معاملہ میں دوسروں سے کچھ آگے ہی نظر آتی ہے۔

پرانے قصوں کو چھوڑ کر چند تازہ واقعات کو دیکھ لیجئے ،جنہیں میڈیا نے اہمیت دی ہے، ورنہ خدا جانے روزانہ کیا کچھ ہوتا رہتا ہے۔

☆ ٦ رنومبر کے اخبار ”منصف“ میں ایک سرخی ”فلم“ سانوریا“ مسلمانوں کی پھر دل آزاری“ ہے۔اس کے تحت بتلایا گیا ہے”ایک زمانہ تھا کہ ہندی فلمی صنعت

کوفرقہ وارانہ یکجہتی کیلئے جانا جاتا تھا، لیکن اس صنعت سے وابستہ افراد اپنی فلموں کی کامیابی اور پیسہ بٹورنے کے لئے مسلمانوں کے جذبات کوٹھیس پہونچارہے ہیں تقریباً چار فلمیں ایسی تیار کرنے کے بعد اب پانچویں (ایسی) فلم جمعہ کے روز پورے ہندوستان میں ریلیز ہوگی"۔

خبر کے مطابق اس فلم کا کردار یہ ہے کہ ایک ہندولڑکے کو ایک مسلم لڑکی سے عشق ہوگیا ہے، اسمیں اسلامی شعار" ماشاءاللہ" کو بار بار دہرایا گیا ہے، معاشقہ کے اشعار میں ایک شعر اس طرح بھی ہے،" آج کل نیند کم اور خواب زیادہ ہے، لگتا ہے خدا کا کوئی نیک ارادہ ہے" ایک مصرع (نعوذ باللہ)" رب بھی دیوانہ لگ رہا ہے" بھی اس میں شامل ہے۔

☆ ۱۳ رنومبر کے اسی اخبار میں" دوریڈی میڈ ملبوسات" کی تصویر دکھلائی گئی ہے، اور خبر میں بتایا گیا ہیکہ" بشرٹ" پر آیت قرآن" اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" پرنٹ ہے، اور لڑکی کے لہنگے پر عربی رسم الخط میں تحریر پرنٹ کی گئی ہے۔

☆ ۱۸ رنومبر کے اخبار میں" اٹلی" کے ایک کمپنی کے" ٹائیلٹ کور" پر قرآن کریم کی آیات چھاپنے کی اطلاع ہے۔

☆ ۲۷ رنومبر کے اسی اخبار کی ایک سرخی" تسلیمہ نسرین کو گجرات میں ٹھہرنے نریندر مودی کی دعوت" شامل ہے۔ ایسے ہی اس رسوائے زمانہ مصنفہ" تسلیمہ نسرین" کیلئے دہلی کے مضافات میں" محفوظ مکان" فراہم کئے جانیکی خبر ہے۔

تواریخ سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ میڈیا کی طرف سے مسلمانوں کی ہفتہ واری" تواضع" ہے اور یومیہ" خاصہ" تو بمباری بلکہ مزائل کی شکل میں روزانہ ہی حاضر خدمت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم مسلمان اب ان خبروں کو پڑھنے اور ان مناظر کو دیکھنے کے اسی طرح عادی ہو گئے ہیں جس طرح فلسطین کے بچے بموں کی

آوازوں کو سننے اور انسانی لاشوں کو دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ یہ ان کے لئے روز روز کا قصہ ہے کوئی نئی بات نہیں!

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس کا حل کیا ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں دو باتیں کہی جا سکتی ہیں۔(۱) عالمِ اسلام کی قیادتوں اور حکمرانوں کی کچھ سیاسی کوتاہیاں اور غلطیاں نیز غیر اسلامی نظریات و فیصلے، جن کے نتیجے میں عالمِ اسلام مغربی مما لک کی ماتحتی و دستنگری پر مجبور ہو گیا ہے۔ (۲) عامۂ مسلمین کا اسلامی تہذیب و تعلیم پر عمل اور اس کی دعوت یعنی حفاظت و اشاعت کی ذمہ داری سے غافل ہو جانا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ نمبر ایک کا حل تو "مردے از غیب بیروں آید و کارے بکند" ہے جو ہم عوام الناس کے قبضہ میں نہیں ہے، اس کے لئے عالمِ اسلام کو شاہ ولی اللہ جیسے مفکر، مجدد الفِ ثانی جیسے مدبر اور صلاح الدین ایوبی جیسے باغیرت و باحوصلہ قائد کی ضرورت ہے۔اس کیلئے ہم بجز اللہ پاک سے دعا کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔

البتہ نمبر دو کا حل ہم سب کے پاس موجود ہے اور وہ ہے "امر بالمعروف نہی عن المنکر" یعنی اچھی باتوں کو پھیلانے اور بری باتوں سے روکنے کی جدو جہد اور کوشش!

ابن ماجہؒ اور ابن حبانؒ نے حضرت عائشہؓ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن میرے پاس تشریف لائے، مجھے محسوس ہوا کہ کوئی اہم بات پیش آئی ہے، آپؐ نے وضو فرمایا اور کسی سے بات نہیں کی، (مسجد تشریف لے گئے) میں دیوار سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی تا کہ آپ کیا فرماتے ہیں سن سکوں! آپؐ ممبر پر تشریف فرما ہوئے، اللہ تعالیٰ کی توصیف وثناء بیان کرنیکے بعد ارشاد فرمایا: لوگو! اللہ تعالیٰ تم لوگوں سے فرما رہا ہے "امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر" کرتے رہو اس سے پہلے پہلے کہ (حالت معاشرہ کی خراب ہو جائے) پھر اگر تم مجھ سے دعائیں مانگو گے تو میں قبول نہ کروں گا اور سوال کرو گے تو عطا نہ کروں گا، مدد طلب کرو گے تو تمہاری مدد نہ کروں گا۔ یہ فرما کر آپ ممبر سے نیچے اتر آئے، مزید کچھ نہ فرمایا۔[1]

حدیث مذکور کے تحت شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں: کہ اس مضمون پر وہ حضرات خصوصیت سے توجہ فرمائیں جو دشمن کے مقابلے کے لئے اُمورِ دینیہ میں تسامح اور مساہلت پر زور دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی اعانت و امداد دین کی پختگی ہی میں مضمر ہے۔ حضرت ابو درداءؓ جو ایک جلیل القدر صحابیؓ ہیں فرماتے ہیں کہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر ایسے ظالم بادشاہ کو مسلط کر دے گا جو تمہارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے۔ تمہارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اس وقت تمہارے برگزیدہ لوگ دعائیں کریں گے تو قبول نہ ہوگی۔ تم مدد چاہو گے تو مدد نہ ہوگی۔ مغفرت مانگو گے تو مغفرت نہ ملے گی۔ خود حق جل جلالہ کا ارشاد ہے "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَنْصُرُوْا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ" اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور دشمنوں کے مقابلہ میں تمہارے قدم جما دے گا۔[2]

دوسری جگہ ارشادِ باری عزاسمہ ہے: "اِنْ یَنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلاَ غَالِبَ لَکُمْ وَاِنْ یَخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَاالَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِنْ بَعْدِہٖ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ" اگر اللہ تعالیٰ شانہ تمہاری مدد کریں تو کوئی شخص تم پر غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمہاری مدد نہ کریں تو پھر کون شخص ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہیے۔[3]

---

[1] صحیح ابن حبان: ۱/۱۸۳، [2] بیان القرآن [3] فضائل تبلیغ ص: ۱۵

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ فرماتے ہیں ؎

**وعدۂ غلبہ ہے مومن کیلئے قرآن میں**
**پھر جو تو غالب نہیں کچھ ہے کسر ایمان میں**

الغرض یہ سبب اور یہ علاج ہے ان دل آزار احوال ومسائل کا جن سے آج امتِ مسلمہ دوچار وپریشان ہے،اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ سے دعاؤں کا اہتمام اور صبر واستقامت کا التزام بھی ضروری ہے، "**بَلیٰ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئاً**" اگر تم ثابت قدم رہو اور نافرمانی سے بچتے رہو تو ان دشمنوں کی تدبیریں تمہیں کچھ نقصان نہ پہونچا سکیں گی، کیونکہ صبر وتقویٰ کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان کے ضرر کو انہی کی طرف پھیر دے گا، چاہے ان کی وہ تدبیریں بظاہر پہاڑوں کو متزلزل کردینے والی کیوں نہ ہوں ۔اللہ تعالیٰ ظالموں کے کرتوتوں سے باخبر ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں صبر وثبات اور استقلال کے ساتھ حالات کے مقابلہ کی ہمت عطا فرمائے۔آمین

# سال نو مبارک

محرم الحرام سن ہجری کا پہلا مہینہ ہے، ہر سال کی طرح اس سال بھی افق پر ہلال محرم کے نمودار ہوتے ہی گویا ۱۴۲۸ھ کے اختتام، اور ۱۴۲۹ھ کی ابتداء کا اعلان ہو گیا، گردش مہتاب کا مقصد بھی اس کے خالق نے ''لِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِيۡنَ وَالۡحِسَابَ'' قرار دیا ہے۔

کچھ ہی دن قبل شمسی جنتری کی ابتداء بھی ۳۱ر ڈسمبر اور یکم رجنوری کی درمیانی شب ۱۲ر بجکر ایک منٹ پر بیہودگی، بدکاری، شراب نوشی اور حرام خوری کے گھناؤنے اور حیا سوز ماحول میں ہو چکی ہے، یہ ''رسم بد'' نہ کسی مذہب کی دین ہے نہ کسی تہذیب کا حصہ! کچھ عرصہ قبل برطانیہ کے بحری بیڑے میں کام کرنے والے فوجیوں نے نشاطِ نفس و تسکین ہوس کی خاطر جو چند بیہودہ رسومات ایجاد و اختراع کئے تھے، یہ رسم انہی میں سے ایک ہے، انہوں نے ابتداً بحری جہازوں میں ہی یہ کالے کرتوت چلائے، پھر ساحلوں پر اسے منتقل کیا، دیکھتے دیکھتے اہل و عیال کی خوشیوں اور مسرتوں سے محروم ان چند بدنصیبوں کی شیطانی حرکات اور نفسانی خواہشات کے بدترین کھیل کو پہلے یورپین اقوام نے پھر اقوام عالم حتی کہ مسلمانوں نے بھی اسے اپنے سماج اور تہذیب میں شامل کرلیا، ہمیں دوسری اقوام پر چنداں تعجب و حیرت نہیں کہ ان کی منتہائے فکر اور بلندئ شوق ''شکم پروری و شہوت پرستی'' کے علاوہ کچھ نہیں، افسوس اور سخت افسوس اس وقت ہوتا ہے جب اس طوفانِ بدتمیزی اور سیلابِ بے حیائی میں مسلمانوں کے نوجوان مرد و خواتین کو بصد جوش و خروش شامل بلکہ دوسروں سے کچھ آگے ہی دیکھا جاتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام ایک غیور، ممتاز و منفرد، اور مستقل مذہب ہے۔ یہ آویزش و آمیزش تو کیا؟ اشتباہ و تلبیس کو بھی گوارا نہیں کرتا، جس طرح (اطباء کے بقول) اعضائے انسانی میں قلب ایک ایسا حساس اور نازک عضو ہے کہ اپنے وجود پر ہلکے سے ہلکے بوجھ کو بھی برداشت نہیں کرتا، دھڑکن تیز کر کے اسے جھٹک دیتا ہے، اسی طرح اسلام مذاہبِ عالم میں وہ واحد مذہب ہے جو تقلید غیر اور تشبہ بالغیر کا سخت مخالف ہے، ہر معاملہ میں اپنا مستقل تشخص و امتیاز برقرار رکھنا چاہتا ہے اور رکھتا ہے، چنانچہ "سالِ نو" کے آغاز پر جشنِ مسرت کا کوئی سنجیدہ تصور بھی اسلامی تعلیمات میں نہیں پایا جاتا، چہ جائیکہ مروجہ انتہائی بیہودہ طریق! ہاں! اسلامی تعلیمات اور انبیاء کی عادات میں یہ بات ضرور ملتی ہے کہ وہ زمانہ کے ہر حادثہ اور کائنات کے ہر انقلاب سے عبرت و موعظت، سبق و نصیحت خود بھی حاصل کرتے ہیں اور امت کو بھی دلاتے ہیں۔

دیکھئے! ہلالِ ماہ یعنی مہینے کا چاند دیکھ کر اللہ کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ ایمان افروز و یقین افزاء جملہ نکلتا "**اللّٰھم اھلّہ علینا بالامن والایمان والسلامة والاسلام ربّی وربّک اللّٰہ تعالیٰ**" اے اللہ! اس نئے چاند کو ہمارے لئے امن و ایمان اور سلامتی و حفاظت کی خوشخبری کے ساتھ نمودار فرما۔ اے چاند تیرا اور میرا رب بس اللہ ہی ہے۔ کبھی یہ کلمات ارشاد فرماتے: "**ھلال خیر ورشد اٰمنت بالذی خلقک، الحمد للّٰہ الذی جاء بالشھر وذھب بالشھر**" خدا کرے یہ چاند بھلائی و ہدایت کا مژدہ ہو جائے، جس نے تجھے پیدا کیا میں اس پر ایمان لاتا ہوں، شکر ہے اس ذات کا جس کے حکم سے ایک مہینہ جاتا ہے، دوسرا آتا ہے۔ کبھی فرماتے: "**اللّٰھم ادخلہ علینا بالامن والایمان والسلامة والاسلام والسکینة والعافیة ورزق الحسن**" اے اللہ! اس ماہ کا امن و ایمان، سلامتی و حفظان، عافیت و اطمینان اور

اچھی روزی کے فیصلوں کے ساتھ آغاز فرما۔ وغیرہ

ان دعاؤں سے مزاجِ نبوت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایسے مواقع پر آپ کس طرح حق تعالیٰ کے حضور عجز وعبودیت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کی بے نیازی سے ڈرتے اور اپنی نیازمندی واحتیاج کا اظہار فرماتے تھے، سبحان اللہ! ایک ایک لفظ ”شانِ عبدیت“ کا مظہراتم ہے۔ اللہ پاک اس بندگی کا کچھ حصہ ہمیں بھی نصیب فرمادے۔ آمین

برادرانِ اسلام سے عرض کرنا یہ ہے کہ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم ماہِ نو یا سالِ نو کے مواقع پر ماضی کی غفلتوں پر نظر کر کے حق تعالیٰ کے مواخذہ سے ڈریں اور استغفار کریں، نیز آئندہ کیلئے سچے اور اچھے وعدے اور ان پر عمل کی سنجیدہ ومخلصانہ کوشش کریں۔ آج پوری امت دنیوی واخروی اعتبار سے انتہائی کرب و بے چینی اور کس مپرسی کے عالم میں ہے، عیش ونشاط کی محفلیں سجانے اور شہوت وغفلت کے بازار گرم کرنے کی مسلمان کو فرصت ہی کہاں ہے؟ ؎

وقت فرصت ہے کہاں؟ کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

مجھے ایک صاحبِ اعتماد سے معلوم ہوا کہ ان کے علاقہ میں سالِ نو کی مناسبت سے ریاست کے تقریباً دو ڈھائی سو پادری جمع ہوئے اور عزم کیا کہ ۲۰۰۸ء میں کم از کم ۸/ لاکھ مسلمانوں کو آستانہ عیسائیت پر بھینٹ چڑھائیں گے۔ **اعاذنا اللہ منہم۔**

کاش! اے کاش! امتِ محمدیہ کے غیور نوجوانوں کا بھی کوئی اجتماع ہوتا اور عہد کیا جاتا کہ ۱۴۲۹ھ کے دوران ابتک کے تمام مرتدین کو چرچ کی جہنم سے مسجد کی جنت میں لانے کا کام کرلیا جائے گا! اب بھی ارادہ کریں تو ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں **عسیٰ ان یجعل اللہ لھم سبیلا....**

# جمعیۃ علماء ہند کا الیکشن

فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کا وصال کیا ہوا "جمعیۃ العلماء" ایک عجیب وغریب کشمکش اور حیرت انگیز آزمائش کا شکار ہوگئی، اختلافِ رائے وفکر کہاں نہیں ہوتی، اور کونسی جماعت اندرونی خلفشار سے اس وقت محفوظ ہے؟ مگر میڈیا وصحافت آج ایسی بلاء ہے جو کسی راز کو راز اور اندرونی مسائل کو اندرونی حدود میں محدود رہنے نہیں دیتی، انہیں روز ایک نیا ٹوا پک (TOPIC) چھیڑنے اور ہر دن کسی قائد کی دستارِ عزت سے کھیلنے کی عادت خاموش بیٹھنے نہیں دیتی، صحافت کے اسلامی آداب تو بہت دور کی بات ہے انسانی اقدار سے بھی انہیں کچھ مطلب نہیں ہوتا، ادھر کچھ عرصہ سے بالخصوص دیوبندی مکتبِ فکر اور اسکی متعلقہ تحریکات پر جو گہری نظر ہے وہ سب کو معلوم ہے، ایسے حالات میں دینی واسلامی قیادتوں کا اختلافی امور اور نزاعی مسائل میں نہایت محتاط صورتوں کو اختیار کرنا ملتِ اسلامیہ کے مفاد میں وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، لیکن جمعیۃ العلماء کے مرکزی انتخابات سے لیکر ریاستی انتخابات تک اندرونی خلفشار کے حوالہ سے میڈیا کو جمعیۃ کی جو شبیہ پیش کرنے کا موقع مل رہا ہے، وہ جمعیۃ کے اراکین کے لئے خصوصاً اور تمام مسلمانوں کے لئے عموماً انتہائی تکلیف دہ اور المناک ہے۔ اور بظاہر آثارِ صلح بھی موہوم ہیں ۔ قیادت کے اس بحران نے ارکان کو پورے ملک کے اندر دو حلقوں میں بانٹ دیا ہے، پھر دونوں حلقوں کے اہلِ غرض اپنی اپنی منتخب ومختار قیادت کیلئے جوڑ توڑ، بھید بھاؤ میں لگے ہوئے ہیں، اور اہلِ اخلاص دم بخود

بے بس دکھائی دے رہے ہیں، جس کا واضح اور منہ بولتا ثبوت ہماری ریاست کا صدارتی الیکشن، اوراس کے بعد کے اخباری بیانات ہیں۔

"جمعیۃ العلماء" ہندوستانی مسلمانوں کی ڈھارس اورا کابر علماء دیوبند کی امانت ہے، ہمارے بزرگوں کے مخلصانہ جدو جہداورخون پسینے سے سینچی گئی ایک ایسی کھیتی ہے جس کے برگ وبار سے ملت اسلامیہ ہندیہ گذشتہ ۹۰ رسالوں سے مستفید ہوتی چلی آرہی ہے، اورآج بھی وہ ملکی اعتبار سے مسلمانوں کا ایسا مضبوط اورواحد پلاٹ فارم ہے جس کی شاخیں تمام ریاستوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور جس کے ارکان کی اکثریت کو"علماء کرام" ہونیکا شرف حاصل ہے، سبحان اللہ وبحمدہ۔ مسلمانوں کا اس سے بڑا، اس سے قدیم اور مستحکم پلاٹ فارم کوئی دوسرا نہیں ہے، موجودہ عالمی حالات اور ملکی سیاسیات کے مدنظر ضرورت تو اس بات کی ہے کہ"جمعیۃ العلماء" ماضی کے کسی بھی دور سے زیادہ اسوقت مسلمانانِ ہند کی قیادت وراہنمائی اور جدید چیلنجس کا سامنا کرنے کے موڈ میں ہو، ظاہر ہے کہ اس کے لئے جاریہ صورتحال کا خاتمہ اورتمام سطحوں پرارکان میں اتحادویکجہتی کا پیدا ہونا انتہائی ضروری ہے۔

جنوبی ہندوستان بالخصوص آندھرا میں علماء کرام کی قلت کی وجہ سے ماضی قریب تک جمعیۃ کا کوئی زیادہ اثر ورسوخ نہیں تھا، اب الحمدللہ ہر ضلع میں اوسطاً کم ازکم پچاس علماء اہلِ حق موجود ہیں، بڑے شہروں کی تعداد کو ملا کرمحتاط تخمینہ ریاست میں دو ہزار علماء کرام کی موجودگی کا ہے، اور ہرسال اس میں قابلِ لحاظ اضافہ ہورہا ہے، ان کی اکثریت"جمعیۃ العلماء" سے فکری وابستگی ہی نہیں دلی لگاؤ بھی رکھتی ہے، چنانچہ اس اثناء میں ہمارے نو فارغ علماء بڑی امیدوں اورتمناؤں کے ساتھ امت کے لئے کچھ کرنے کے جذبہ سے کاروانِ جمعیت میں جوق در جوق شامل ہوتے چلے گئے، لیکن ادھر کچھ دنوں سے راقم السطور جنوبی ہندوستان کی ریاستوں میں

جہاں بھی سفر میں جارہا ہے وہاں کے علماء سے جمعیۃ کے بارے میں جو تاثرات سننے کومل رہے ہیں، وہ ان کی مایوسی اور بے بسی کی کہانی ہوتے ہیں، اور یہ متضاد بیانات وخیالات کوسنکر تکلیف بھی ہوتی ہے تشویش بھی! یہ صحیح ہے کہ تنظیموں پر حالات آتے ہی رہتے ہیں اور خود جمعیۃ پر بھی ماضی میں بارہا آچکے ہیں، مگر اسقدر دیرپا اور دوررس نہیں آئے، جو اس دفعہ آئے ہوئے ہیں، جس کی ایک وجہ مخلص وخدا ترس مشیروں کی کمی ہے تو دوسرا سبب دیانتدار و مصلحت شناس صحافت سے محرومی ہے، نیز کارکنان میں تدبر وتحمل اور زبان وبیان میں احتیاط کی کمی بھی ایک اہم سبب ہے، جو بھی ہو! جمعیۃ کے مخلص وابستگان کی بس ایک ہی تمنا ہے کہ "عنقریب اس بحران کے حل کا مژدۂ جانفزاء سننے کومل جائے" **وَمَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ**

اس مژدہ کو سننے کے لئے دو ہی صورتیں ذہن میں آتی ہیں، (۱) تاریخ گواہ ہے کہ امت کی مشکلات کبھی عزم حسینیؓ کے ذریعہ حل ہوتی ہیں تو کبھی حوصلۂ حسنیؓ سے، اس وقت ہمارے اکابر بجائے عزمِ حسینی کے حوصلۂ حسنیؓ کو اختیار فرمائیں تو پوری جماعت بلکہ ملتِ اسلامیہ کے حق میں احسانِ عظیم ہوگا۔

(۲) ابھی الحمد للہ اکابرین امت کی بڑی تعداد موجود ہے، وہ اس سلسلہ میں آگے تشریف لائیں اور مسئلہ کے حل میں اپنا موثر کردار ادا فرمائیں، نتیجہ سے قبل کی کوئی خبر صحافت کے ہاتھ لگنے نہ دیں، ورنہ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ جو نقصان امت مسلمہ ہندیہ اور اسلاف کرام کی اس عظیم امانت کا ہوگا وہ نا قابل تصور اور نا قابل تلافی ہوگا۔

آخر میں اکابرین جمعیت کی خدمت میں یہ صراحت کردینا بھی ضروری ہے کہ راقم سطور جمعیۃ علماء سے جدید وابستگی رکھتا ہے، قدیم کارکن نہیں ہے، لیکن جمعیت کے نام اور اس کی وقیع خدمات کے حوالہ سے تمام اکابرینِ جمعیت سے

عقیدت کی حد تک محبت رکھتا ہے، اس محبت کو ذریعۂ مغفرت و ذخیرۂ آخرت سمجھتا ہے، اس کے باوجود وہ باتیں اور وہ تبصرے جو عوامی سطح پر چل رہے ہیں، اور بدگمانی و بدزبانی کی جو فضاء ایک ہی جماعت کے دو حلقوں کے درمیان عام ہو رہی ہے ان کی زد میں اپنے اکابر کا مرتبہ بلند پامال ہوتا ہوا دیکھنے کی سکت نہ پا کر اس عاجز کے نوکِ قلم نے مذکورہ بالا سطور رقم کر دی ہیں، اگر یہ حق ہے تو اس کو تمام خیر خواہانِ جمعیت کی آواز سمجھ کر للہ توجہ فرمائی جائے اور اگر یہ جرأت بے جا اور خلافِ واقعہ ہے تو اس عاجز کی کوتاہ فہمی اور کم علمی پر محمول اور اس کے اظہار میں معذور قرار دے کر عفو و درگذر سے کام لیا جائے۔

# حق گوئی و بے باکی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمان واسلام کو ایک مذہب، ایک دستورِ حیات ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ حق کی عظیم طاقت وقوت کے طور پر بھی بھیجا ہے، یہی وجہ ہے کہ سچے ایمان والوں کے سامنے دنیا اور اس کی تمام تر مادی قوتیں اور مشینی طاقتیں ہیچ، بے حیثیت اور نا قابلِ التفات بن جاتی ہیں، قرآن کریم کا اعلان ہے کہ حضراتِ صحابہ کرامؓ کو جب کوئی خبر دینے والا، کسی بڑے واقعہ اور عظیم حادثہ کی خبر دیتا تو وہ ذرا خوفزدہ اور ہراساں نہ ہوتے بلکہ ان کا ایمان مزید شدید ہو جاتا، بے ساختہ وہ پکار اٹھتے۔ **حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل**۔ حالاں کہ فطرتِ انسانی کا تقاضہ ہے کہ ایسے مواقع پر انسان حیران وششدر رہ جاتا ہے، معلوم ہوا کہ ایمان ایک عظیم اندرونی قوت وطاقت کا نام ہے، جب کسی کے قلب میں وہ جاگزیں وتہ نشیں ہو جاتا ہے تو اس میں ہمت وجرأت، بہادری وشجاعت، یقین واعتماد، خودداری وباوقاری پیدا کر دیتا ہے، یہ ایمان والا اگر مرعوب ہوتا ہے تو صرف اس اللہ سے ہوتا ہے جس سے بڑی کوئی طاقت نہیں اس کی نظر میں اس کے علاوہ کسی طاقت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، ذیل میں اسی حقیقت کو چند ایک مثالوں کے ذریعہ بیان کیا جارہا ہے۔

سب سے پہلے تاریخِ انبیاء کو لیجئے، جتنے انبیاء کرام **علیہم الصلوٰۃ والسلام** اس دنیا میں تشریف لائے ہیں سب کے سب ناموافق ونامساعد حالات میں تشریف لائے ہیں، ان حضرات کو اپنی دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں جہاں کچھ شریف وفہیم لوگوں سے سابقہ پڑا، وہیں بہت کچھ نادان وسفیہ اور جابر وظالم شخصیتوں کا

سامنا بھی ہوا، بڑی بڑی دھمکیوں اور خطرناک سازشوں کے جال ڈالے گئے، سخت مایوسیوں، ذہنی وجسمانی اذیتوں میں مبتلا کئے گئے —— مگر سلام ہوان کی روحوں پر —— کہ وہ نہ راہ حق سے ہٹے اور نہ ہی اپنا کارِ دعوت موقوف کیا، وہ دنیا کی ان تمام سرکش طاقتوں کے مقابلہ میں توحید کی شمشیر برہنہ اور یقین کی ناقابلِ تسخیر قوت قاہرہ لیکر آگے بڑھے، اور بڑھتے ہی چلے گئے، دعوت اسلام کے ان جوانمردوں نے تاریخِ اسلام میں "حق گوئی" و "بے باکی" کی ایک مضبوط بنیاد رکھ دی، پھر ان کے نام لیواؤں اور فرمانبرداروں نے اس بنیاد پر حیرت انگیز، وتعجب خیز تعمیر کھڑی کی، اور آج بھی کر رہے ہیں۔

اب ذرا ان نوجوانوں پر نظر ڈالئے جو آج سے تقریباً دو ہزار سال قبل قبطیوں کے زیر اقتدار، اور کفر وشرک کے شکار تھے، اطراف میں اللہ تعالیٰ کے سچے رسول حضرت مسیح علیہ السلام ایمان ویقین کی دعوت چلا رہے تھے، ان نوجوانوں کو اس کی خبر لگی انہوں نے کفر وشرک کی گندگی کے مقابلہ میں توحید ویقین اور مسیحی دعوت کی پاکیزگی کو اپنے ماحول اور بادشاہ کے مذہب کا کچھ خیال کئے بغیر، عواقب ونتائج سے بے پرواہوکر اختیار کرلیا، یہ بات زیادہ دن چھپ نہ سکی، شدہ شدہ ان کے تبدیلیٔ مذہب کی خبر بادشاہ وقت کو پہنچ ہی گئی، بادشاہ غیض وغضب سے بے قابو ہو گیا اور ان نوجوانوں کو تلاش کرکے اس کے سامنے پیش کرنے کا حکم صادر کردیا، پولیس نے ان کا تعاقب کیا، اور دربارِ شاہی میں انہیں دست بستہ حاضر کردیا، بادشاہ جوان کی اس حرکت پر غضبناک تھا، ان سے بھرے دربار میں پوچھتا ہے "تم لوگ کس کو رب مانتے ہو، کیا میرے علاوہ بھی تمہارا کوئی رب ہے؟" نوجوان اس کے جواب میں بے ساختہ اور پوری جرأت وہمت، بے باکی وحق گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں: رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ

مِنْ دُوْنِہٖ اِلٰھاً لَقَدْ قُلْنَااِذاً شَطَطاً ”ہمارارب وہی ہے جوزمین وآسمان بلکہ کل کائنات کا رب ہے، ہم اس کے علاوہ کسی کو الٰہ ومعبودنہیں مانتے، اگرہم ایسا کریں تو یہ اللہ تعالیٰ پر بہتان ہوگا“ پھران لوگوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ آگے بڑھ کر قوم کے عقیدہ کی جس میں بادشاہ بھی شامل تھا تردید کرتے ہوئے کہا: ”ھٰـــؤُلاءِ قَوْمُنَااتَّخَذُوْامِنْ دُوْنِہٖ اٰلِھَۃً لَوْلاَ یَأْتُوْنَ عَلَیْھِمْ بِسُلْطَانٍ بَیِّنٍ وَمَنْ اَظْلَمَ مِمَّنْ اِفْتَریٰ عَلَی اللّٰہِ کَذِباً ”یہ ہماری قوم ہے، انہوں نے اللہ پاک کو چھوڑ کر بہت سے معبود بنا رکھے ہیں، اگر یہ اپنے عمل میں برحق ہیں تو اس کا کوئی ثبوت کیوں نہیں پیش کردیتے، سب سے بڑا ظالم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے“۔

آپ غور کیجئے! ایک جابر وظالم اور کفروشرک کے دلدادہ بادشاہ کے سامنے توحیدورسالت کی یہ صاف صاف تشریح اورحق گوئی وبے باکی ان نوجوانوں کے اندر ”قوتِ ایمانی“ سے نہیں تو اور کہاں سے پیدا ہوئی؟ اللہ کی سچی کتاب قرآنِ کریم کے بیان کردہ اس واقعہ کے بعد امت محمدیہ کے اس جوانمرد سے بھی ملاقات کیجئے۔

یہ صحابیٔ رسولؐ، اسلام کے بہادروفحول ربعی بن عامرؓ ہیں، اپنے وقت کی ایک سوپرپاوراورعظیم طاقت کے سامنے کھڑے ہیں، اپنا تعارف کراتے ہوئے فرما رہے ہیں۔

”ہمیں اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے ہم دنیائے انسانیت کو بندوں کی بندگی سے نکال کر رب حقیقی کے آگے سربسجود کرنے اور باطل وناحق مذاہب کے مظالم سے چھٹکارا دلا کر برحق اور سب سے بہتر مذہبِ اسلام کے عدل وانصاف سے آشنا کرنے اوردنیا کی تنگیوں اورسختیوں سے بچا کرآخرت کی وسعتوں کی طرف لیجانے کے کام پرآئے ہیں“۔

اللہ اکبر! یہ جذبۂ حق گوئی یہ حوصلۂ بے باکی اس قوم کے افراد میں ــــ جو اس

زمانہ میں دنیا کی سب سے غریب و بے تہذیب قوم سمجھی جاتی تھی — کیسے پیدا ہوگیا؟ ظاہر ہے کہ بجز عقیدۂ توحید و آخرت کے اس کا کوئی مآخذ و سرچشمہ نہیں ہوسکتا۔

اور ذرا اس بوڑھی خاتون حکیم کی بیٹی خولہ سے بھی ملتے چلئے یہ مدینہ منورہ کی ایک بستی میں رہتی تھیں، امیر المؤمنین خلیفۃ المسلمین وزیر خاتم النبیین سیدنا عمر بن الخطابؓ ایک مرتبہ اپنے تفقدی گشت میں اس بستی سے گذرے، بڑی بی کی نظر جب ان پر پڑی تو ان سے یوں مخاطب ہوتی ہیں، "عمرؓ! تم بچپن میں اپنے محلّہ میں "عمیر" کے نام سے جانے جاتے تھے، تم عمیر سے عمر ہوئے ہو، اور اب عمر سے بڑھ کر امیر المؤمنین بن گئے ہو، میں تمہیں نصیحت کرتی ہوں کہ لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنا، مظلوموں کی آہ سے بچتے رہنا، حساب کے دن کو فراموش نہ کرنا"

کسی نے کہا بڑی بی! تم کس سے مخاطب ہو، اپنی آواز پست کرو، یہ امیر المؤمنین ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا رہنے دو، یہ وہ عورت ہے جس کی کھری باتیں اللہ تعالیٰ نے عرش سے سنی ہے تو عمرؓ زیادہ حقدار ہے کہ اس کی سخت سست سن لے۔

میں نے یہ سرسری خاکہ حق گوئی و بے باکیٔ مسلمین کا اس موقعہ پر آپ کے سامنے پیش کیا ہے، ورنہ تاریخ اسلام و مسلمین ایسے ہزار ہا واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بلاشبہ اسلام ہی ہے جو اپنے فرزندوں اور وفاداروں کے قلوب میں وہ جرأت و بے باکی کی روح پھونک دیتا ہے، جس کے بعد ایمان والے بچہ بچہ کی نظر میں دنیا اپنی وسعتوں اور طاقتوں کے ساتھ تارِ عنکبوت اور حقیر ہی معلوم ہوتی ہے، شاعر نے اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین